عصر حاضر کے پس منظر میں

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

ناشر

دکن ٹریڈرس، مغل پورہ، حیدر آباد

پیامِ سیرت
عصر حاضر کے پس منظر میں

”جس میں مطالعۂ سیرت کا طریقہ، نبوت کی ضرورت، انسانیت کو سیرت محمدی ﷺ کی حاجت، سیرت محمدی ﷺ کے امتیازی پہلو، رسول اللہ ﷺ کی کی ماقبل نبوت زندگی، مکی زندگی اور مدنی زندگی کے حالات کے علاوہ موجودہ حالات کے پس منظر میں سیرت کے مختلف اہم واقعات سے حاصل ہونے والی رہنمائی، نیز آپ ﷺ کے اخلاقِ حسنہ اور بحیثیت اُمت رسول اللہ ﷺ کے حقوق پر روشنی ڈالی گئی ہے، زبان آسان، اُسلوب دلچسپ اور عام فہم“

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

ناشر : دکن ٹریڈرس، مغل پورہ، حیدرآباد

فہرست مضامین

چوتھا باب : اُمت پر نبی کے حقوق

○ ○ ○ ○

عرضِ مرتب

کسی مسلمان کا ایمان اس وقت تک مکمل ہی نہیں ہوسکتا، جب تک کہ اس کا دل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت وعظمت سے معمور نہ ہو، یہ دنیا میں ایمان کی علامت اور آخرت میں نجات کا سہارا ہے اور آپ ﷺ کی زندگی قیامت تک انسانیت کے لئے اسوہ ونمونہ ہے، اسی لئے آپ ﷺ کی سیرتِ مبارکہ پر جتنا کہا گیا ہے اور جس قدر لکھا گیا ہے، کسی اور شخصیت یا مذہبی پیشوا پر اس کا ہزارواں حصہ بھی توجہ نہیں دی گئی ہے، مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم اصحابِ نظر نے بھی آپ ﷺ کی زندگی پر قلم اُٹھایا ہے اور نظم ونثر کے ذریعہ آپ ﷺ کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے؛ لیکن یہ موضوع ایسا تروتازہ اور سدا بہار ہے کہ اس کی تازگی اور حلاوت کبھی کم نہیں ہوئی، اصحابِ قلم واہل نظر کے سامنے حیاتِ طیبہ ﷺ کے نئے نئے پہلو آتے رہتے ہیں اور وہ سیرت نگاری کی بزم سعادت میں شرکت سے سرفرازی حاصل کرتے ہیں۔

عربی زبان کے علاوہ اُردو زبان میں بھی سیرت کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے، جس میں مختلف پہلوؤں سے سیرت نبوی ﷺ پر روشنی ڈالی گئی ہے، اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ کتاب ''پیامِ سیرت — عصر حاضر کے پس منظر میں'' آپ کے سامنے ہے۔

استاذِ گرامی قدر، فقیہ عصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب أطال الله بقائه ورعاه من كل شر و نفع به الناس أجمعين، ایک لمبے عرصہ سے سماجی، معاشی اور دیگر سلگتے ہوئے نئے موضوعات پر اپنے رود بار اشہب قلم سے تشنہ لب اصحابِ ذوق اور قارئین کی پیاس بجھاتے رہے ہیں، انھیں موضوعات میں مختلف اوقات میں اور خاص کر ماہ ربیع الاول کے موقع سے سیرتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے، ان مضامین کا سب سے امتیازی پہلو یہ رہا ہے کہ سیرت کے متعلق کسی بھی واقعہ کو اجمالی

طور پر بیان کر کے، اس سے ملنے والے عملی اسباق کو اخذ کرنے اور موجودہ حالات کو واقعاتِ سیرت پر منطبق کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

میرے لئے باعثِ سعادت اور لائق افتخار امر ہے کہ ان مضامین کو یکجا کرنے کا کام میرے حصہ میں آیا، برسوں سے لکھے جانے والے اخبارات کے اوراق گم گشتہ سے ان مضامین کو تلاش کرنا ''جوئے شیر'' لانے سے کم نہ تھا، چنانچہ اس سلسلہ میں استاذِ مکرم سے قلبی لگاؤ رکھنے والے بہت سارے احباب ورفقاء نے بھی پرخلوص تعاون کیا، فجزاهم الله خير الجزاء .

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دُعاء گو ہوں کہ استاذ مکرم کی عمر میں برکت عطا فرمائے اور زیادہ سے زیادہ ان کے علمی، عملی اور قلمی فیض کو عام فرمائے، آمین یارب العالمین۔

۱۵؍صفر ۱۴۲۹ھ — محمد جمیل اختر ندوی

۲۳؍فروری ۲۰۰۸ء — (شعبۂ تحقیق المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد)

○ ○ ○ ○

ابتدائیہ

قرآن مجید رسولِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا ہے، حدیثِ نبوی آپ ﷺ کی تعلیمات ومعمولات سے عبارت ہے اور سیرت آپ ﷺ کی داستانِ حیات ہے، گویا ان تینوں ہی موضوعات کا مرکز ومحور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات ہے، جن کے نام سے محبت کی انگیٹھی سلگتی ہے اور جن کے ذکر سے ایک مسلمان کی زبان حلاوت محسوس کرتی ہے۔

اسی لئے سیرتِ نبوی ﷺ ہمیشہ اہل علم اور اصحابِ نظر کی زبان وقلم کا محبوب موضوع رہا ہے، اس حقیر کے لئے سعادت کی بات ہے کہ اس حقیر کا جو سب سے پہلا مضمون طالب علمی کے زمانہ میں شائع ہوا، وہ سیرت ہی کے ایک واقعہ 'ہجرت نبوی ﷺ' پر تھا، اللہ کا شکر ہے کہ اس کے بعد وقتاً فوقتاً سیرت پر مختلف مضامین لکھنے کی سعادت حاصل ہوتی رہی، اس کی دو کتابیں خاص سیرت کے موضوع پر آچکی ہیں، ایک ''مختصر سیرت ابن ہشام'' جس میں مشہور سیرت نگار ابن ہشامؒ کی سیرت النبی ﷺ کی تلخیص کی گئی ہے، دوسرے ''خطباتِ بنگلور''، جس میں اس حقیر نے حیاتِ محمدی ﷺ کے انسانیت نواز پہلو کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اس کے علاوہ ہر سال ماہ ربیع الاول میں سیرت کی مناسبت سے مختصر مضامین لکھنے کا بھی موقع ملتا رہا ہے، خاص کر جب سے روزنامہ ''منصف'' حیدرآباد کا خصوصی کالم ''شمع فروزاں'' متعلق ہوا، تب سے اس کی سعادت نسبتاً زیادہ میسر آرہی ہے، یہ کتاب جو قارئین کے ہاتھوں میں ہے، ایسے ہی مضامین کا مجموعہ ہے، جو مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں، مجھے افسوس ہے کہ سیرت پر لکھے ہوئے بعض مضامین محفوظ نہیں رہ سکے، ورنہ وہ بھی اس مجموعہ میں شامل ہوتے۔

اس مجموعہ کو ہم نے چار ابواب پر تقسیم کیا ہے، پہلے باب میں تمہیدی مضامین ہیں؛ کہ سیرت کے مطالعہ کا طریقہ کیا ہونا چاہئے؟ اسوۂ نبوی ﷺ کی انسان کو کیوں ضرورت ہے؟ اور پیشوایانِ مذاہب میں صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی کیوں اُسوۂ نمونہ بننے کی

صلاحیت رکھتی ہے؟

دوسرے باب میں آپ ﷺ کی زندگی کے مختصر حالات تحریر کئے گئے ہیں، اس باب کی دو خصوصیات ہیں، ایک اختصار، دوسرے تعداد اور ناموں کی صراحت، یہ ایسا مضمون ہے کہ اگر اسکول اور کالج کے طلبہ اسے پڑھ لیں تو اختصار کے باوجود حضور ﷺ کی پوری شخصی زندگی ایک نظر میں ان کے سامنے آجائے گی، جس کی اس وقت بہت ضرورت ہے؛ کیوں کہ دینی تعلیم سے دوری کی وجہ سے نئی نسل سیرتِ نبوی ﷺ کی بنیادی باتوں سے بھی بے خبر ہے، اس مختصر تحریر میں اس بات کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ حیاتِ طیبہ ﷺ سے متعلق معاندین کی طرف سے جن گوشوں کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کی جاتی ہیں، مثبت انداز میں ان کا جواب ہو جائے۔

تیسرا باب گویا کتاب کا عطر اور نچوڑ ہے، اور وہ یہ ہے کہ سیرت کے مختلف واقعات کو اجمالی طور پر ذکر کرتے ہوئے اس سے ہماری عملی زندگی کے لئے جو سبق ملتا ہے، اس کو نمایاں کیا جائے، اصل میں سیرت کا مقصود یہی ہے اور اس نقطۂ نظر سے سیرت نبوی ﷺ کا مطالعہ کرنا چاہئے؛ لیکن عام طور پر اس کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی ہے، یہ حصہ انشاء اللہ موجودہ حالات کے لئے سیرتِ نبوی ﷺ سے حاصل ہونے والی رہنمائی کو واضح کرے گا۔

چوتھا اور آخری باب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمت پر حقوق اور آپ ﷺ پر ایمان کی نسبت سے ہماری ذمہ داریوں کے متعلق ہے، اس میں جہاں آپ کے حقوق کو واضح کیا گیا ہے، وہیں ختم نبوت سے متعلق مضامین بھی شامل کئے گئے ہیں۔

اس مجموعہ کے مضامین روزنامہ ''منصف'' اور بعض دوسرے اخبارات ورسائل میں بکھرے ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے عزیز گرامی مولانا جمیل اختر ندوی سلمہ اللہ تعالیٰ (شعبۂ تحقیق و دراسہ) کو، کہ انھوں نے گم گشتہ اوراق سے تلاش کر کے ان مضامین کو جمع اور مرتب کیا اور پروف ریڈنگ کر کے اسے لائق اشاعت بنایا، عزیزی مولانا محمد نصیر عالم سبیلی سلمہ بھی اس حقیر کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے حسب سابق خصوصی توجہ کے ساتھ ان مضامین کی کمپوزنگ کی، نیز قارئین کو ''دکن ٹریڈرس، مغل پورہ، حیدرآباد'' کا بھی شکر گذار ہونا

چاہئے کہ انھوں نے اپنے مکتبہ سے اسے شائع کیا اور اس طرح اب یہ مجموعہ قارئین کے ہاتھوں تک پہنچ رہا ہے، فجزاهم الله خير الجزاء، قارئین سے خواہش ہے کہ وہ اس مجموعہ کو اس نقطۂ نظر سے پڑھیں کہ حیاتِ محمدی ﷺ میں ہماری عملی زندگی کے لئے عبرت وموعظت کے کیا پہلو موجود ہیں اور ہمیں کس طرح ان کو مشعل راہ بنانا چاہئے؟

یہ تو فطری بات ہے کہ انسان کی کوئی علمی و دینی کاوش منظر عام پر آئے تو اسے خوشی ومسرت کا احساس ہوتا ہے؛ لیکن اس مجموعہ کی اشاعت میرے لئے خاص طور پر باعثِ مسرت اور اس سے بڑھ کر باعثِ سعادت ہے؛ کیوں کہ اس کی نسبت آقاء ومولیٰ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ ابی و امی) کی حیاتِ طیبہ سے ہے، کیا عجب کہ ایک گناہ گار غلام کی یہ بے سواد تحریریں اس کے آقا کی بارگاہِ کرم میں مقبول ہو جائیں اور قیامت کے دن پیش گاہ ربانی میں ان کی طرف سے اشارہ ہو جائے کہ اس کا شمار بھی میرے غلاموں میں کرلیا جائے، وللہ الحمد اولا و آخرا و صلی الله تعالیٰ علی محمد و آله و صحبه اجمعين .

خالد سیف اللہ رحمانی

۲۴؍محرم ۱۴۲۹ھ

۲؍فروری ۲۰۰۸ء

باب اول

مطالعۂ سیرت کے مبادی

سیرت کا مطالعہ کیوں اور کس طرح؟

ربیع الاول کے مہینے کا آغاز ہو چکا ہے، ''ربیع'' موسم بہار کو کہتے ہیں، اس ماہ کا یہ نام ماقبل اسلام سے ہے، لیکن یہ حسن اتفاق ہے کہ اسی مہینے میں پیغمبر اسلام ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی، جس نے حقیقی معنوں میں انسانیت کو بہار بداماں کر دیا اور کائنات کو ایک ایسی فصل گل عطا کی جو قیامت تک انسانیت کے مشام جاں کو معطر اور ذہن وفکر کو شاد کام و بامرام رکھے گی، اس ماہ نہ صرف آپ کی ولادت ہوئی، بلکہ اسی ماہ میں ہجرت کا وہ عظیم الشان واقعہ بھی پیش آیا، جو اسلام کی دعوتی وعسکری فتوحات کا اصل مبدأ اور نقطہ آغاز ہے، اور پھر اسی ماہ میں آپ کی وفات حسرت آیات بھی ہوئی، اس اعتبار سے یہ نہ صرف اُمت مسلمہ بلکہ انسانیت کے لئے ایک تاریخی مہینہ ہے، تاریخ ہمیشہ دل کے دروازوں کو دستک دیتی ہے، اس لئے اس ماہ میں سیرت کے جلسوں، سیمیناروں، سمپوزیموں اور خطبات کی کثرت ہو جاتی ہے، اخبارات وجرائد بھی سیرت کے عالیشان نمبرات نکالتے ہیں اور اصحابِ ذوق سیرت کے مطالعہ کی طرف راغب ہوتے ہیں۔

سیرت محمدی کو صرف اس مہینہ یا متعین تاریخوں کے ساتھ مخصوص کر لینا سیرت کے ساتھ ناانصافی ہے، کیوں کہ آپ کی نبوت عالمی اور آفاقی ہے اور کوئی شخص ایک لمحہ بھی آپ کی مبارک تعلیمات سے بے نیاز نہیں رہ سکتا، اس لئے اس موضوع کا تو حق یہ ہے کہ اس سے ہمارا تعلق بھی ابدی اور دائمی ہو، زبان کے لئے اس سے زیادہ مبارک کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ اللہ اور اس کے رسول کے ذکر سے تر رہے، اور قلم کے لئے کوئی امر اس سے زیادہ باعث سعادت نہیں ہو سکتا کہ وہ آپ کی تذکرہ نگاری کا شرف پائے، لیکن بہر حال اس ماہ کی مناسبت سے لوگوں میں ذوق وشوق کی جو چنگاری سلگتی ہے، ضروری ہے کہ اس شرر محبت کو آتش بنا دیا جائے، اس کی حرارت ایمان کی سرد انگیٹھیوں کو گرما دے اور فکر ونظر پر چھائی ہوئی خاکستر کو صاف کر دے۔

اس مقصد کے لئے سیرت محمدی کا مطالعہ ضروری ہے، سیرت کا موضوع ایک سدابہار موضوع ہے، جس کی رعنائی اور گل فشانی نہ ختم ہوئی ہے اور نہ قیامت تک ہوگی، دل ودماغ کو مسخر کرنے والے خطیبوں کے لئے یہی جان خطابت ہے، نامور مصنفین کے ذوق تحقیق اور طرز نگارش کے لئے یہی اوجِ کمال ہے، اس لئے مشاہیر علماء میں شاید ہی کوئی عالم ہو، جس نے براہ راست یا بالواسطہ پوری سیرت یا اس کے ایک حصہ کو اپنا موضوع نہ بنایا ہو، شعروسخن کے باب میں نعت ایک مستقل فن ہے، جس میں ذکر یار بھی ہے اور پاکیزگی بھی، اس لئے سیرت کی کتابیں ہر زبان میں مل جاتی ہیں اور اُردو زبان کا دامن بھی اس نسبت سے بہت مالا مال ہے، بڑی، چھوٹی، متوسط، سادہ، آسان، ادبی حلاوت سے معمور، بڑوں، چھوٹوں، نوجوانوں، عورتوں، تعلیم گاہوں کی نصابی ضرورت، غرض ہر مناسبت سے سیرت نبوی پر ایک ذخیرہ موجود ہے، پھر ہر دبستان فکر کے اہل علم نے اس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے اور بارگاہ نبوت تک محبت واحترام کا نذرانہ پہنچانے کی کوشش کی ہے، اس لئے ہر شخص کو اپنے اپنے مذاق ومزاج اور صلاحیت کے مطابق سیرت محمدی کے مطالعہ کا موقع حاصل ہے۔

اُمتِ مسلمہ کی اپنے نبی کے ساتھ تعلق کا معاملہ دوسری اقوام اور ان کے پیشواؤں سے بالکل جداگانہ ہے اور اس کے کئی وجوہ ہیں: اول یہ کہ دوسری قوموں نے مذہب کو علمی زندگی سے نکال باہر کیا ہے، یورپ میں حکومت اور کلیسا کی جنگ بالآخر اس بات پر منتج ہوئی کہ انسان کی عملی زندگی سے کلیسا کو کوئی تعلق نہیں ہے، مذہب کے خلاف یہ بغاوت اور اس بغاوت کی کامیابی نے پوری دنیا کی اقوام پر گہرا اثر ڈالا اور انسان پر مذہب کی جو کچھ گرفت تھی وہ ڈھیلی پڑ گئی، اور تو اور جو مسلم ممالک یورپ سے متصل تھے یا وہ یورپ کے زیر اقتدار آ گئے تھے، وہ بھی اس کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکے، ترکی اور انڈونیشیا وغیرہ اس کی واضح مثال ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان قوموں میں مذہبی پیشواؤں کی حیثیت زیادہ سے زیادہ ایک قابل احترام شخصیت کی ہوگئی، وہ لوگوں کے لئے قابل اتباع باقی نہیں رہے، بعض مذاہب میں تو پہلے ہی سے مذہبی پیشوا خدا کا درجہ رکھتے تھے اور ان سے ایسی دیومالائی کہانیاں متعلق تھیں کہ کسی انسان کے لئے

ان کی اتباع ممکن ہی نہ تھی ، اس لئے ان اقوام کو اپنی مذہبی شخصیتوں کی زندگی کو پڑھنے کی کوئی عملی ضرورت باقی نہیں رہی۔

مسلمانوں کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے، مسلمانوں کے یہاں بحمد اللہ کبھی علماء اور عوام کے درمیان اقتدار کی کھینچا تانی اور رسہ کشی نہیں پیدا ہوئی، نہ علماء نے اپنے مذہبی مقام کو عوام کے استحصال کے لئے استعمال کیا، نہ اپنے مخالفین کو زندہ جلانے کی کوشش کی اور نہ اپنے معتقدین سے ''مغفرت نامے'' فروخت کئے، اس لئے کبھی بھی علماء اور مسلمانوں کے درمیان کوئی ایسی جنگ کی صورت پیدا نہیں ہوئی، جو یورپ میں کلیسا اور عوام کے درمیان ظہور میں آئی تھی ، پھر اسلام نے پیغمبر اسلام کو ایک انسانی نمونہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور آپ کی تعلیمات اتنی سادہ اور فطرت انسانی سے ہم آہنگ ہیں کہ ان پر عمل کرنا چنداں دشوار نہیں، اس لئے اس اُمت کا تعلق اپنے پیغمبر سے صرف تعظیم واحترام کا نہیں، بلکہ اطاعت و اتباع کا بھی ہے اور اسلام ہم پر اسے واجب قرار دیتا ہے، قرآن نے ہمیں بار بار اللہ کے ساتھ ساتھ اللہ کے رسول کے ارشادات اور فرامین پر عمل کا حکم دیتا اور اس سے روگردانی کو کفر قرار دیتا ہے، قل أطیعو اللہ والرسول فان تولوا فان اللہ لایحب الکافرین، (آل عمران:۳۲) ——— اور اسے ایمان کی کسوٹی کہتا ہے: وأطیعو اللہ ورسولہ ان کنتم مؤمنین (انفال:۱) ——— بلکہ فرمایا گیا کہ رسول کی اطاعت ہی اللہ کی اطاعت ہے: من یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔ (النساء:۸۰)

رسول کے احکام کی حیثیت قانون شریعت کے بنیادی سرچشمہ کی ہے، اس لئے حکم ربانی ہوا کہ رسول جو بھی احکام دیں اس کی تعمیل کرو اور جس بات سے منع فرمائیں اس سے بچو، مـا أتـاکـم الـرسـول فخذوہ و مانہاکم عنہ فانتہوا (حشر:۷) ——— جب رسول کسی بات کے بارے میں فیصلہ کردیں تو اب انسان کو اس سلسلہ میں کوئی اختیار حاصل نہیں (احزاب:۳۶) ——— بلکہ اختلاف ونزاع کے موقع پر جو شخص رسول کے فیصلہ پر راضی اور احکام نبوی کو اپنے آپ پر جاری وساری کرنے کے لئے آمادہ نہ ہو وہ مسلمان ہی نہیں ہوسکتا: فـــلا و ربک لایؤمـنـون حتیٰ یـحـکّـمـوک فیما شجر بینہم ، (النساء:۶۵) آپ کے ارشادات ہی کی

اطاعت کافی نہیں، بلکہ آپ کے عمل کی اتباع و پیروی بھی ضروری ہے(بقرہ :۱۴۳) بلکہ رسول کی اتباع اللہ سے محبت کا لازمی تقاضا ہے اور آپ ﷺ کی اتباع انسان کو خود خالق تعالیٰ کا محبوب بنادیتی ہے: قل إن كنتم تحبون الله فاتبعوني يحببكم الله ،(آل عمران :۳۱) چنانچہ آپ کی ذات والا صفات کو اُمت کے لئے بہترین نمونہ اور آئیڈیل قرار دیا گیا: لقد كان لكم في رسول الله أُسوة حسنة (احزاب :۲۱) ـــــ جب آپ کا تعلق کسی شخصیت سے اطاعت واتباع کا ہو تو اس کی حیات اور تعلیمات کو پڑھنا ناگزیر ہے، کیوں کہ اس کے بغیر اس کی اتباع واطاعت ممکن ہی نہیں۔

دوسرے پیغمبر سے انسانیت کا تعلق لازمی محبت اور احترام کا ہے؛ کیوں کہ وہ خدا کا فرستادہ اور اس کا مقبول بندہ ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس بات کی بھی اجازت نہیں دی کہ گفتگو کے درمیان ان کی آواز رسول کی آواز سے بلند ہو جائے، لاترفعوا أصواتكم فوق صوت النبي (الحجرات :۲) اور ارشاد ہوا کہ رسول کو بلانے کا وہ انداز نہ ہونا چاہئے، جو لوگوں کا ایک دوسرے سے ہوتا ہے، لاتجعلوا دعاء الرسول بينكم كدعاء بعضكم بعضا (النور:۶۳) اور مجرد احترام و تعظیم ہی کافی نہیں بلکہ نبی کی والہانہ اور وارفتہ کر دینے والی محبت بھی ضروری ہے، ایسی محبت جو اولاد اور اپنی جان وتن سے بھی بڑھ کر ہو، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک صاحب ایمان نہیں ہوسکتا، جب تک میں اسے اس کے ماں باپ، اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں (بخاری، حدیث نمبر: ۱۵، مسلم، حدیث نمبر: ۴۴) اور واقعہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کے دل میں اپنے پیغمبر کی ایسی محبت رچا بسادی ہے کہ پاکیزہ، سچی اور حقیقی محبت کی ایسی کوئی مثال نہیں مل سکتی۔

چنانچہ یہ مسلمانوں کا اجماعی عقیدہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا احترام اور آپ کی محبت ایمان کا لازمی جزو ہے اور (خدانخواستہ) آپ کی توہین یا آپ سے بے تعلقی کفر وارتداد کا باعث ہے، یہ ایک متفق علیہ مسئلہ ہے، سلفِ صالحین کا حال تو یہ تھا کہ وہ نہ صرف آپ ﷺ

سے محبت رکھتے بلکہ آپ کی طبعی مرغوبات بھی ان کو محبوب تھی اور کوئی شخص ان کے بارے میں ناپسندیدگی اور بے رغبتی کا اظہار کرتا تو ان سے برداشت نہیں ہوتا، اسی لئے رسول اللہ کی کسی سنت اور عمل کے استہزاء کو فقہاء نے موجب کفر قرار دیا ہے، ـــــ اس درجہ کی محبت اور عظمت اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتی، جب تک کوئی شخص آپ کی حیات طیّبہ کا مطالعہ نہ کرے، اس لئے کہ جب تک انسان کسی کی شخصیت، اس کی پاکیزہ حیات اور اس کے کردار کی عظمت سے واقف نہ ہو، نہ اس کے دل میں حقیقی معنوں میں اس شخص کی عظمت جاگزیں ہوسکتی ہے اور نہ سچی محبت پروان چڑھ سکتی ہے، دوسری اقوام کا معاملہ اس سے مختلف ہے، ایک شخص رام جی کی پرستش کر کے بھی ہندو ہوتا ہے اور رام کا پتلا جلا کر بھی، عیسائیوں کے یہودیوں سے گرم جوش تعلقات دیکھئے اور اس پر بھی نظر رکھئے کہ یہودی حضرت مسیح علیہ السلام کو آج بھی ولدالزنا اور حضرت مریمؑ کو زانیہ کہتے ہیں، پھر سوچئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کتنی محبت وعظمت ان کے قلوب میں ہے؟؟

تیسرے اسلام کی تمام تعلیمات کی اساس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوہ ہے اور شریعت کے تمام احکام کا مدار آپ کی ذات والا صفات ہے، ہم خدا کو ایک مانتے ہیں، وحی ورسالت کے نظام پر یقین رکھتے ہیں، آخرت پر ہمارا ایمان ہے، کچھ چیزوں کو فرائض وواجبات اور کچھ چیزوں کو حرام ومکروہ تصور کرتے ہیں، کچھ احکام حلال اور مباحات کے قبیل سے ہیں، ان تمام اعتقادی وعملی احکام کی بنیاد کتاب اللہ اور سنت رسول ہے، کتاب اللہ سے مراد وہ کتاب الٰہی ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اور سنت آپ ﷺ کے فرمودات اور معمولات سے عبارت ہے، غرض دین کے یہ دونوں ہی مصادر آپ ہی کی ذات سے متعلق ہیں، اس لئے دین حق کے دشمنوں نے ہمیشہ آپ کی ذات کو ہدف بنانے کی کوشش کی ہے، صلیبی جنگوں میں شکست و ہزیمت کے بعد جب اہل مغرب اس بات سے مایوس ہوگئے کہ وہ جنگ کے میدان میں عالم اسلام کو زیر کرسکیں گے، تو انھوں نے علم وقلم کے ہتھیار سے اسلام پر حملہ کرنا شروع کیا اور یوں تو انھوں نے قرآن وسنت کے استناد واعتبار سے لے کر

احکام شریعت کی معقولیت اور اسلامی تاریخ تک ہر شعبۂ دین کو اپنے حملہ کا نشانہ بنایا، لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ ان کی یلغار کا خاص ہدف رہتی ہے، کیوں کہ آپ ہی کی ذات پر دین کی بنیاد ہے، اگر آپ کی شخصیت کو مجروح و مشکوک کردیا جائے، تو دین کی پوری بنیاد ہی منہدم ہے، چنانچہ مستشرقین نے اس موضوع پر اتنا کچھ لکھا ہے کہ اس کی فہرست بندی کے لئے بھی مستقل کتاب درکار ہے۔

یہ سب کچھ زیادہ تر انگریزی اور دوسری یورپین زبانوں میں ہوا ہے اور بدقسمتی سے اس وقت یہی زبانیں علم وتحقیق اور ایجادات واختراعات کی نمائندہ ہیں، اس لئے اس دور میں نہ صرف غیر مسلم بلکہ جدید تعلیم یافتہ مسلمان بھی ان زبانوں کو سکہ رائج الوقت کی طرح اختیار کرنے پر مجبور ہیں، اور وہ نہ صرف اپنے فن کی کتابیں بلکہ مذہب اور تاریخ بھی ان ہی زبانوں کے واسطہ سے پڑھتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جن لوگوں کو سیرت کی مستند کتابیں پڑھنے، یا اہل علم سے استفادہ کرنے کا موقع ملا ہے، ان کے دلوں میں بھی شکوک وشبہات کے کانٹے چبھنے لگتے ہیں اور وہ بھی مغرب کے دام ہم رنگ زمین کے اسیر ہوئے جاتے ہیں، حالاں کہ اولاً تو مستشرقین کی تحریریں اسلام کے بارے میں تعصب اور تنگ نظری سے خالی نہیں ہوتیں، دوسرے مستشرق مصنفین کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے، جو عربی زبان سے براہ راست واقف نہیں، جن کی معلومات واسطہ در واسطہ ہے اور وہ لکیر کے فقیر کی طرح ایسی باتوں کو دہرائے جاتے ہیں، جن کی نامعقولیت بار بار واضح کی جاچکی ہے۔

غرض کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت واتباع کے لئے، ایمان کی حفاظت کے لئے مطلوبہ محبت واحترام سے اپنے دل ودماغ کو معمور رکھنے کی غرض سے اور اعداء اسلام کی فتنہ سامانیوں اور قلمی شرانگیزیوں سے بچنے کے لئے سیرت نبوی کا مطالعہ وقت کی نہایت ہی اہم ضرورت ہے، جسے کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، اس لئے مسلمان نوجوانوں کو خاص کر سیرت کی کتابیں پڑھنی چاہئے اور مسلم انتظامیہ کے تحت قائم تعلیم گاہوں کے ذمہ داروں کو اس کا اہتمام کرنا چاہئے کہ وہ سیرت کی کوئی مناسب کتاب ضرور اپنے بچوں کو پڑھائیں۔

یہ بھی ایک اہم سوال ہے کہ سیرت کا مطالعہ کس طرح کیا جائے؟ —— رسول اللہ صلی اللہ کی سیرت کے دو حصے ہیں، ایک حصہ تو آپ کے فضائل ومناقب کا ہے، یہ تو بے شمار ہیں، اور بقول شاعر: ''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر!'' یعنی حاصل یہ ہے کہ خدا کے بعد آپ کی ذات سب سے بزرگ و برتر ذات ہے، عام طور پر ہمارے یہاں سیرت کے جلسے اسی موضوع کے لئے مخصوص ہو گئے ہیں، مجھے اس کی اہمیت سے انکار نہیں، لیکن مطالعہ سیرت کے لئے صرف اسی ایک پہلو کو کافی سمجھنا صحیح نہیں —— سیرت کے مطالعہ کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آپ کی سیرت کو اپنی عملی زندگی کے لئے آئینہ بنایا جائے اور اس کو سامنے رکھ کر انسان اپنی اصلاح کرے اور اپنے اعمال و اخلاق کو سنوارے۔

عبادات اور شرعی احکام کے معاملہ میں تو ہم سنت نبوی کی طرف رجوع کرتے ہی ہیں ،لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ اجتماعی زندگی، سیاسی حکمت عملی اور دوسری اقوام کے ساتھ سلوک و تعلق کے معاملہ میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل کو ہم اپنے سامنے رکھیں، ہم دیکھیں کہ کہاں مسلمانوں کے حالات مکی زندگی کے سے ہیں، اور وہاں ہمارا رویہ کیا ہونا چاہئے؟ کہاں ہمارے حالات مدنی زندگی اور صلح حدیبیہ سے پہلے کے سے ہیں؟ اور وہاں ہمارے لئے اسوۂ نبوی کیا ہے؟ کس مرحلہ پر ہمیں صلح حدیبیہ کی ضرورت ہے؟ اور کہاں جرأت فرزانہ درکار ہے؟

افسوس ہے کہ ہم نے بھی اپنی قومی زندگی اور ملی مسائل میں ان لوگوں کی طرح جو خدا ورسول اور دین و شریعت پر ایمان نہیں رکھتے ،صرف مادی نفع و نقصان کے اعتبار سے غور کرنا اور منصوبے بنانا شروع کر دیا ہے، حالاں کہ بحیثیت مسلمان ہمیں ہر موڑ پر اسوۂ حسنہ کو ملحوظ رکھنا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ اس موقع پر ہمارے لئے کیا رہنمائی ملتی ہے؟ اس میں ہماری دنیا کی کامیابی بھی ہے اور آخرت کی فلاح بھی۔

○ ○ ○ ○

انبیاء کی بعثت
انسانیت کی سب سے اہم ضرورت

خدا نے انسانوں کی جو بستی بسائی ہے، وہ کتنی وسیع، کتنی خوبصورت اور کتنی متنوع ہے! ہزاروں مخلوقات ہیں اور ہر ایک دوسرے سے مختلف؛ بلکہ اپنی صلاحیتوں اور عادتوں کے اعتبار بالکل متضاد کیفیتوں کی حامل، لیکن ایسا لگتا ہے ان کو ان کے کاموں کے بارے میں قدرت نے کوئی کتاب پڑھا دی ہے، وہ ایک مقررہ دستور کے مطابق اپنی ڈیوٹی انجام دیتے ہیں، سورج کو معلوم ہے کہ اسے مشرق سے نکلنا ہے اور مغرب کی سمت میں ڈوبنا ہے، سمندر ہزاروں سال سے اپنے دائرہ میں مسلسل بہہ رہا ہے اور اپنی تلاطم خیز موجوں کے ساتھ کروٹیں لیتا رہتا ہے، وہ فضا کو بادل کی سوغات دیتا ہے، اور دن رات زمین کی آلائشوں کو تحلیل کرنے میں لگا ہوا ہے، درخت مسلسل لگتا ہے کہ یہ سب پڑھی پڑھائی اور سیکھی سکھائی مخلوقات ہیں، جن کو اپنی ایک ایک ڈیوٹی کا علم ہے۔

جمادات ونباتات ہی نہیں، حیوانات کا بھی یہی حال ہے، جو چلتے پھرتے دوڑتے بھاگتے ہیں، ان کا کھانا پینا، لڑنا جھگڑنا، اپنی غذاؤں کا تلاش کرنا، حملہ کرنا اور مدافعت کرنا ہم اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، لیکن ایسا لگتا ہے کہ قدرت نے ان کو بھی ان کی زندگی کا دستور پڑھا اور سمجھا دیا ہے، گائے، بکری گھاس اور درخت کے پتے کھاتی ہے، شیر اور باز زندہ جانوروں کا شکار کرتا ہے، چیل مردار کی تلاش میں چپہ چپہ ڈھونڈتا پھرتا ہے، بعض جانور ہیں جو چارہ بھی کھاتے ہیں اور اپنے سے چھوٹے جانوروں کو بھی ہضم کر جاتے ہیں، پرندوں کو اپنا گھونسلہ بنانا اور چوہوں کو اپنا سرنگ نما مکان بنانا معلوم ہے، مکڑے جالے بنتے ہیں اور شہد مکھیاں اپنا چھتہ تیار کرتی ہیں جس میں اتنے کمرے ہوتے ہیں کہ شاید بادشاہوں کے محلات میں بھی نہ رہتے ہوں۔

کیا یہ سب کچھ ان مخلوقات نے آپ سے آپ جان لیا؟ قرآن نے اس کا جو جواب

دیا ہے وہ یہ کہ یہ سب اللہ کی رہنمائی اور ہدایت کا نتیجہ ہے، اسی کو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **ربنا الذی اعطی کل شیئ خلقه ثم هدی** (طٰهٰ :۵۰) یعنی یہ رب کائنات کا کمال ہے کہ اس نے ہر چیز کو صورت بھی بخشی اور اسے اپنے وجود اور زندگی کے بارے میں راہ بھی سمجھائی اور سلیقہ بھی سکھایا، قرآن نے ایک اور موقعہ پر بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے، (اعلیٰ:۳) جیسے دین اور آخرت کے بارے میں رہنمائی ہدایت ہے، ویسے ہی دنیا میں کسی بھی مخلوق کو زندہ رہنے اور زندگی گذارنے کا جو طریقہ ودیعت کیا گیا ہے، اسے بھی قرآن ''ہدایت'' سے تعبیر کرتا ہے۔

اور یہ کچھ جانوروں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، حضرت انسان کے وجود میں بھی اس ہدایت ربانی کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے، بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے اور ماں کی چھاتی کی طرف لپکتا اور اس سے دودھ پیتا ہے، آخر اس شیر خوار بچے کو کس نے بتایا کہ تمہاری غذا ماں کے سینہ میں ہے؟ اور پھر اس غذا کو ماں کے سینہ سے کشید کرنے کا سلیقہ کس نے سکھایا؟ ذرا سی بے توجہی ہو تو بچہ کا رونا اور پیار چمکار پر بچہ کا مسکرانا یہ بھی اسی ہدایت ربانی کا مظہر ہے، اس گونگے، بے زبان اور بے شعور بچہ کو کس نے سکھایا کہ دکھ اور درد کا اظہار رو کر اور خوشی کا اظہار ہنس کر اور مسکرا کر کیا جاتا ہے؟

تو جب خدا نے ہر چیز کو ایک مقصد کے لئے پیدا کیا ہے اور اسے قدرتی طور پر دنیا میں رہنے سہنے کا طریقہ بتادیا ہے، تو کیا انسان کو اپنی زندگی بسر کرنے کے لئے کسی طریقہ اور نظام کی ضرورت نہ ہوگی؟ یقیناً ہوگی، بلکہ زیادہ ہوگی، کیوں کہ انسان ایک گونہ بااختیار مخلوق ہے اور عقل وخرد کی نعمت نے اس کی نیکی اور بدی کے دائرہ کو بہت وسیع کردیا ہے، شیر ایک وقت میں ایک ہی انسان یا حیوان کو شکار بناتا ہے، سانپ ایک بار ڈس کر ایک وجود کو فنا کرسکتا ہے، لیکن انسان کا حال یہ ہے کہ وہ ایک ایٹم بم کے ذریعہ بیک وقت ایک پورے خطہ کو تباہ وبرباد کرسکتا ہے اور بیک جنبش پلک لاکھوں انسانوں کی جان لے سکتا ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ وہ سب سے زیادہ اس بات کا محتاج ہے کہ جینے اور مرنے کا سلیقہ سیکھے اور زندگی گذارنے کا طور وطریق جانے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کہ انسان کو زندگی گذارنے کا طریقہ کون بتائے؟ —— ہم اپنی عملی

زندگی میں غور کریں تو ایک سیدھی سادھی اور دیکھی جانی حقیقت یہ ہے کہ جو شخص کسی مشین کو بناتا ہے اور کسی شئی کو ایجاد کرتا ہے، وہی اس کی ضروریات سے آگاہ بھی ہوتا ہے اور اس کے لئے مناسب اور غیر مناسب اور درست و نادرست طریقہ استعمال کے فیصلے بھی کرسکتا ہے، صانع ہی بتاسکتا ہے کہ اس کی صنعت کو کس طرح استعمال کیا جائے؟ اور موجد ہی رہنمائی کرسکتا ہے کہ اس کی ایجاد کس طور کام میں لائی جائے؟ اس لئے جب اللہ تعالیٰ انسان کے خالق اور رب ہیں، اسی نے ہمیں پیدا کیا ہے اور اسی کے اشارۂ وحکم سے ہم اس کائنات میں زندہ ہیں، تو ضرور ہے کہ وہی ہمیں زندگی کے طور وطریق بھی سمجھائے اور اسی کا دیا ہوا نظام حیات ہمارے لئے مفید ہوسکتا ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **الا لہ الخلق و الامر** (اعراف:۵۴) کہ اللہ ہی انسان کا خالق ہے اور اسی کے اوامر واحکام انسان کے لئے واجب لطاعت ہے، ایک اور موقعہ پر ارشاد ہوا کہ حکم اور فیصلہ کا حق صرف اللہ ہی کو ہے، **ان الحکم الا للہ** ۔(انعام:۵۷)

دنیا میں بھی آپ جب کسی کمپنی سے کوئی بڑی مشین حاصل کرتے ہیں تو وہ ایک طرف اس مشین کی تفصیلات پر مشتمل کتاب ورسالہ آپ کے حوالہ کرتی ہے اور ساتھ ساتھ اپنے ایک انجینئر کو بھی آپ کی مدد کے لئے بھیجتی ہے کہ کتاب میں جو نظریہ اور تھیوری بیان کی گئی ہے یہ انجینئر اور ماہر کاریگر اس کو عملی طور پر برت کر دکھائے اور محسوس طریقہ پر سمجھائے، کسی تمثیل کے بغیر یہی صورت آسمانی کتاب اور انبیاء کی ہے، اللہ کی کتابیں نظام حیات کی رہنمائی کرتی ہیں کہ انسان کو اس دنیا میں اپنی صلاحیتیں کس طرح استعمال کرنی چاہئے؟ یہ کتابیں دستور ہیں اور پیغمبر کی زندگی اس کی عملی تصویر ہے، گویا پیغمبر کتاب الٰہی کی شرح اور اس کا بیان ہوتا ہے، ایک ایک حرف جو اس کی زبان سے نکلے، ایک ایک عمل جو اس کے اعضاء و جوارح سے صادر ہوں اور ایک ایک اختیاری کیفیت جو اس پر طاری ہو، منشاءِ ربانی کا عملی اظہار اور انسانیت کے لئے اسوۂ و نمونہ ہے، اسی لئے فرمایا گیا کہ جس نے رسول کی اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی، **مـن یطع الرسول فقد اطاع اللہ** ۔(النساء:۸۰)

گویا نبوت محض قلب و ذہن کی تسلی کا سامان اور آخرت کی فلاح ونجات ہی کا ذریعہ نہیں؛

بلکہ یہ سب سے بڑی انسانی ضرورت ہے، جیسے وہ اپنے پیٹ کے لئے غذا کا، تن ڈھکنے کے لئے لباس و پوشاک کا، علاج کے لئے دوا کا اور اپنی مدافعت اور حفاظت کے لئے اسلحہ اور ہتھیار کا محتاج ہے، اس سے بڑھ کر وہ ابنیاء اور ابنیاء کی تعلیمات کا محتاج ہے؛ کیوں کہ انبیاء کی تعلیمات اس کے پورے وجود کے لئے غذا ہیں، وہ ذہن و دماغ کو بتاتی ہیں کہ انھیں کیا سوچنا چاہئے؟ وہ آنکھوں کی رہنمائی کرتی ہیں کہ انھیں کیا دیکھنا اور کیا نہ دیکھنا چاہئے؟ وہ زبان کو ہدایت دیتی ہیں کہ اللہ کی اس عظیم نعمت کا استعمال کن مقاصد کے لئے کیا جائے اور کن مفاسد سے بچا جائے؟ وہ ہاتھوں سے کہتی ہیں کہ یہ ظلم اور ظالموں کے خلاف اُٹھے نہ کہ مظلوموں اور کمزوروں کے خلاف، وہ پاؤں کو بتاتی ہیں کہ اسے نیکی اور حق کی راہ میں چلنا چاہئے نہ کہ باطل اور برائی کے راستہ میں، اور اس کی چال تواضع وانکسار اور عجز و فروتنی کی ہونی چاہئے نہ کہ کبر وافتخار اور غرور واستکبار کی۔

انسان خلوت میں ہو یا جلوت میں، بزرگوں کے ساتھ ہو یا عزیزوں کے ساتھ، محفل طرب میں ہو یا کارزار حرب میں، دشمنوں کا سامنا ہو یا دوستوں کا، عدالت کی کرسی پر ہو یا ملزم کے کٹھرے میں، تخت اقتدار پر ہو یا کسی کے اقتدار کے تحت، استاذ ہو یا طالب علم، آقا ہو یا غلام، تجارت و کاروبار میں ہو یا اللہ تعالیٰ سے راز و نیاز میں، رنج والم کی شام ہو یا مسرت وشادمانی کی صبح، فتح سے ہمکنار ہو یا شکست سے دوچار، وہ اولاد ہو یا ماں باپ، شوہر و بیوی ہو یا بھائی بہن ہو، مریض ہو یا معالج ہو، تیماردار ہو یا خود تیمارداری کا محتاج، سرمایہ دار اور آجر ہو یا مزدور واجیر، قرض دہندہ ہو یا مقروض اور دولت مند ہو یا غریب، جوان ہو یا بوڑھا، سفر میں ہو یا حضر میں، عالم ہو یا جاہل، خدا کی توفیق سے نیک عمل اس نے کئے ہوں یا اس کا دامن عمل گناہ سے آلودہ ہو، غرض ہر موقعہ پر اور ہر حالت اور کیفیت میں اسے انبیاء کی پاکیزہ تعلیمات اور روشن ہدایات مطلوب ہیں ؛ اس لئے یقیناً انسانیت پر اس کے خالق کا سب سے بڑا احسان ابنیاء کی بعثت اور آسمانی کتابوں کے نزول کا نظام ہے، جو انسان اس سے محروم ہو وہ ایک کھاتا پیتا، سوتا جاگتا اور ہنستا بولتا ترقی یافتہ حیوان تو ہوسکتا ہے، لیکن حقیقی اور اپنی حقیقت سے آشنا انسان نہیں ہوسکتا!

○ ○ ○ ○

پیغمبر اسلام — انسانیت کے لئے واحد نمونہ

پیغمبر اسلام ﷺ تمام انسانیت کے لئے نمونۂ کامل اور مشعل راہ ہیں، اسی لئے آپ ﷺ کو قرآن مجید نے ''رحمۃ للعالمین'' کا لقب دیا ہے، تاہم پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں جب ہم اس طرح کا دعویٰ کرتے ہیں تو یہ محض مذہبی خوش گمانی نہیں ہوتی؛ بلکہ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس پر تاریخ کی شہادت موجود ہے۔

اس لئے کہ وہی شخصیت پوری انسانیت کے لئے نمونہ بن سکتی ہے، جس میں کم سے کم تین باتیں پائی جائیں، اول: یہ کہ اس کی سیرت تاریخی طور پر محفوظ ہو اور ایسے مستند اور معتبر ذریعوں سے ہم تک پہنچی ہو جس پر ہم اعتماد کر سکیں، دوسرے: اس کا پیغام اور اس کا عطا کیا ہوا دستورِ زندگی تمام انسانیت کے لئے ہو، کسی مخصوص علاقہ یا نسل کے لوگوں کے لئے نہ ہو، تیسرے: اس کی سیرت زندگی کے ہر گوشہ کے لئے رہنمائی کرتی ہو اور اس کو اپنا رہنما تسلیم کرنے کے بعد انسان اپنی زندگی میں کہیں کوئی تشنگی اور خلا نہ پائے۔

تاریخی تحفظ اور استناد

جہاں تک تاریخی تحفظ اور استناد کی بات ہے تو اس سلسلے میں پیغمبر اسلام کے علاوہ دوسرے پیشوایانِ مذاہب کی زندگی پر نظر ڈالیں تو آپ کو سخت مایوسی ہوگی —— تمام مذاہب کا تذکرہ کیا جائے تو بات خاصی طویل ہو جائے گی، اس لئے اسلام کے بعد دنیا کے دو بڑے مذاہب ہندومت اور عیسائیت کا ذکر کیا جاتا ہے، جس میں سے ایک دنیا کا قدیم ترین مذہب ہے —— بہ شرطیکہ اسے مذہب کہنا درست ہو —— دوسرا مذہب اسلام سے سب سے قریبی زمانہ کا ہے، ہندومت کے ماٴخذ کی حیثیت سے وید میں اپنشد، شاستر، پران، سمرتیاں، رامائن اور گیتا ذکر کی جاتی ہیں (شری کرشن دت بھٹ: ویدک دھرم کیا کہتا ہے؟ اول، دوم، سوم)، ان میں چاروں

ویدیں، رگ وید، یجروید، اتھروید اور سام وید، خصوصی اہمیت کی حامل ہیں، اس لئے کہ اکثر ہندو فرقوں کی نظر میں یہ ویدیں الہامی اور منزل من اللہ ہیں، ہندو مذہب کی معلومات کا دوسرا بڑا ذریعہ ''سمرتیاں'' ہیں، جن میں منوجی کی سمرتی زیادہ مشہور ہے۔

ہندومت میں بڑی دشواری یہ ہے کہ یہاں کوئی آئیڈیل اور نمونہ کی شخصیت نہیں ہے، جس کو ''اسوۂ'' کی حیثیت حاصل ہو، دوسری طرف توہماتی اور دیو مالائی خداؤں اور خدائی اوتاروں کا ایک جم غفیر ہے، جو قدم قدم پر ایسی غیر اخلاقی حرکتوں کا مرتکب ہوتا رہتا ہے، جس کو سن کر انسانوں کی جبینِ غیرت بھی عرق آلود ہو جاتی ہے، (اس کی تفصیل کے لئے مولانا عبید اللہ سندھی (نومسلم) کی ''تحفۃ الہند'' کے علاوہ خود ''رامائن'' کا ترجمہ از پنڈت پرکاش ملاحظہ ہو)۔

ویدوں کے بارے میں یہ بات بھی متفق علیہ نہیں ہے کہ یہ کن بزرگوں پر نازل ہوئی ہے؟ جب کہ بعض مشہور ہندو مفکرین مثلاً سوامی وویکانند، سوامی شیام شری جی اور پنڈت جواہر لال نہرو وغیرہ ویدوں کو الہامی نہیں مانتے، خود وید کے بعض مضامین سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے مثلاً وید کا بیان ہے: ''ہم قابل تعریف اگنی کے لئے اپنی عقل سے اسی منتر کو بناتے ہیں، جیسے بڑھئی رتھ بناتا ہے'' (رگ وید ا: ۹۵-۱۱) اس سے صاف ظاہر ہے کہ وید میں انسانی عقل کی پیداوار ہیں، الہامی نہیں اور اگر وید کو اپنی اصل کے لحاظ سے الہامی مان بھی لیا جائے تو کوئی ضعیف سے ضعیف سند بھی نہیں ہے، جو اس کے سلسلۂ روایت اور نقطۂ آغاز کو بتائے، چنانچہ اکثر ہندو اہل علم بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ وید اب اپنی اصل حالت میں موجود نہیں ہے، سوامی سیتا دھاری لکھتے ہیں: ''چوں کہ موجودہ کتاب وید کے علم میں بہت سے نقائص اور خامیاں موجود ہیں، اس لئے وہ غلط ہیں، اصل اور حقیقی وید کہلانے کے لائق نہیں''۔

(آفتاب حقیقت، ص: ۲۲۳، بھارت ورش کا دھارمک اتہاس، ص: ۱۲۰)

اور پنڈت شیو شنکر رقمطراز ہیں:

آتمارام جینی نے بھی لکھا ہے کہ قدیم چار وید دھرم کے لئے قابل تسلیم تھے، مگر جب سے ان میں برہمنوں نے آمیزش کی تب سے

وہ غیر مسلّم ہو گئے ہیں۔

اس طرح ہندو مذہب میں نہ کوئی نمونہ کی شخصیت ہمیں دستیاب ہے، جس کو مرکزی اہمیت حاصل ہو اور مختلف شخصیتوں کے جو چیدہ چیدہ واقعات ہیں ان کے لئے کوئی ضعیف سے ضعیف تاریخی سند بھی موجود نہیں ہے، جس پر اعتماد کیا جاسکے۔

عیسائیت میں حضرت مسیح علیہ السلام کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کو نبی برحق قرار دیا ہے، حضرت مسیح علیہ السلام کے حالات اور ان کی دعوت اور پیغام کو جاننے کے لئے واحد ذریعہ "بائبل" کے عہدِ جدید کا حصہ ہے، جو حضرت مسیح علیہ السلام کے الہامات، مواعظ و واقعات، ان کے بعض بالواسطہ اور بلاواسطہ فیض یافتہ بزرگوں کے مکاتیب اور مکاشفات کا مجموعہ ہے، یہ حصہ ۲۷ صحائف پر مشتمل ہے، جن میں سے سات صحیفے اور ایک صحیفہ کے کچھ فقرے عیسائی علماء کے نزدیک متفق علیہ نہیں ہیں۔ (مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، اظہار الحق، ج:۱)

پھر حضرت مسیح علیہ السلام کی زبان "آرمی" تھی، لیکن انجیل یونانی زبان میں مرتب کی گئی ہے، مرقس کی انجیل حضرت مسیح علیہ السلام کے ۶۵ سے ۷۰ سال، متّی کی انجیل ۸۵ سے ۹۰، لوقا کی انجیل ۹۰ سے ۹۵ اور یوحنا کی ۱۱۰ کے بعد مرتب کی گئی، ان مرتبین میں کوئی بھی حضرت مسیح علیہ السلام کا حواری نہیں تھا، نہ ان کتابوں کے لئے کوئی سند ہی ہے، جو حضرت مسیح علیہ السلام، یا خود ان انجیلوں کے مرتبین تک پہنچتی ہے، اس کے بعد عہد جدید کے پورے مجموعہ کی تدوین اور مستند اور غیر مستند ہونے کا فیصلہ بائبل پر منعقد ہونے والی تیسری کارتھیج کانسل میں ہوا، جو آنجناب کے ۳۹۷ء بعد منعقد ہوئی۔

یہ حال تو اس کی تدوین و ترتیب کا ہے، دوسرا مرحلہ اس کے ترجموں کا ہے، ۳۰۶ء میں قسطنطین اول رومی نے عیسائی مذہب قبول کیا، اس کے لئے سینٹ جیروم (S.T. Jerom) نے ۳۸۳ تا ۳۹۴ء میں بائبل کے دونوں حصوں (عہد عتیق، عہد جدید) کا رومی زبان میں ترجمہ کیا، جو عیسائی مؤرخین کے بقول ۴۰۰ء سے ۵۰۰ء تک مغربی کلیسا میں چلتا رہا۔ (تاریخ کلیسا، ص:۱۱۴)

لیکن خود اس ترجمہ کا حال یہ تھا کہ ابتداءً کلیسا نے اسے تسلیم نہیں کیا، مگر بعد میں کونسل

آف ٹرینٹ (Concil of trent) نے منظوری دے دی، چنانچہ بعض عیسائی علماء کے حسب تحریر یہ ترجمہ بہت جلدی میں کیا گیا اور بہت سی تبدیلیوں کے باعث بگڑ گیا۔

(کتاب سوال وجواب، ترجمہ پادری یونس سنگھ، ص:۲، مطبوعہ الہ آباد پریس ۱۸۶۴ء)

پھر اسی ترجمہ سے دوسرے ترجمے کیئے گئے، جن میں انگریزی کا وہ مشہور ترجمہ بھی ہے جو ہمپٹن کورٹ کانفرنس (Hampton cort confrance) میں بادشاہ جیمس کی ایماء پر کیا گیا، جو بارہ سالوں بعد ۱۶۱۶ء میں مکمل ہوا، پھر ۱۸۸۴ء میں اس پر نظر ثانی کی گئی، یہی ترجمہ ہے جو کنگ جیمس بائبل (King Jams Bible) سے مشہور ہوا۔

گویا حضرت مسیح علیہ السلام کے ایک طویل عرصہ بعد بالواسطہ اس کی ترتیب ہوئی، مرتبین میں کوئی آپ کا حواری نہیں تھا، کوئی سلسلہ سند نہیں جس سے اس کے مستند ہونے کا فیصلہ کیا جا سکے، اس کے بعض حصے بعض عیسائی فرقوں کے یہاں بھی مستند نہیں ہیں، ''آرمی زبان'' میں انجیل کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے، جو حضرت مسیح علیہ السلام کی اصل زبان تھی، گویا اس کا آغاز بھی ترجمہ سے ہی ہوا اور اب وہ اولین ترجمہ بھی محفوظ نہیں، بلکہ ترجمہ در ترجمہ کی صورت موجود ہے، اس ترجمہ کی صحت میں بھی عیسائی علماء کے درمیان اختلاف ہے اور کسی شاعرانہ مبالغہ آرائی کے بغیر: ''شد پریشاں خواب من از کثرتِ تعبیر ہا'' کا مصداق بنی ہوئی ہے، اب بھلا بتائیے کہ اسے کیوں کر حضرت مسیح علیہ السلام کے حالات وسیرت کے لئے مستند اور معتبر باور کیا جائے؟

چنانچہ بائبل کے مشہور مفسر ہارن اپنی تفسیر (ج:۱) کے ضمیمہ میں لکھتے ہیں:

> جب یہ کہا جاتا ہے کہ کتب مقدسہ خدا کی طرف سے وحی کی گئی ہیں، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہر لفظ اور پوری عبارت الہام الٰہی ہے، بلکہ مصنفین کے محاورات اور ان کے بیانات کے اختلاف سے پتہ چلتا ہے کہ ان کو اس بات کی اجازت دی گئی تھی کہ اپنی طبیعت اور عادت کے مطابق اور اپنی اپنی سمجھ کے موافق لکھیں اور علم الالہام اسی طرح استعمال کیا گیا، جس طرح رسمی علوم استعمال کیئے جاتے

ہیں، یہ خیال نہیں کیا جاسکتا کہ ہر وہ بات جوانھوں نے بیان کی ہے وہ الہام کی جاتی تھی، یا ہر وہ حکم جو بیان کرتے ہیں وہ الہام کردہ ہیں۔

اور ''انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا'' میں ہے :

جولوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ 'ہر وہ بات جو بائبل میں درج ہے' وہ الہامی ہے، اپنے دعویٰ کو آسانی سے ثابت نہیں کرسکتے۔

(انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا:۲۰/۱۹)

آپ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت دیکھئے، آپ ﷺ کی سیرت کے دو بنیادی ماخذ ہیں، کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ قرآن مجید کا یہ حال ہے کہ وہ نہ صرف اپنے الفاظ؛ بلکہ اپنے رسم الخط اور لب ولہجہ کے ساتھ آج تک محفوظ ہے، آپ ﷺ نے اپنی زندگی ہی میں خود اپنی نگرانی میں اس کی کتابت کرائی، (سیوطی ، الاتقان فی علوم القرآن :۶۴/۱) سورتوں اور آیتوں کو ترتیب دیا، (آلوسی ، روح المعانی :۲۶/۱) پھر آپ ﷺ کے وصال کے بعد ایک سال بھی نہ گذر پایا تھا کہ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے نوشتے حاصل کر کے اس کو یکجا کیا اور لب ولہجہ کا جو ہلکا سا اختلاف تھا، اسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ختم کر کے اپنے عہدِ خلافت میں تمام لوگوں کو ایک ہی لہجہ پر متفق کردیا، (زرکشی ،البرھان فی علوم القرآن : جلد اول ، مناع القطان : مباحث فی علوم القرآن :۱۳۳) ــــ وہ اس وقت سے آج تک ہر دور میں ہزاروں لاکھوں سینوں میں من وعن محفوظ ہے اور قرأت میں کہیں کوئی ایسا اختلاف نہیں ہے، جس کو معنی میں تغیر کی حد تک اختلاف کہا جاسکے۔

دوسرا ماخذ ''السنۃ'' ہے، احادیث تمام آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں، اس کے ایک قابل لحاظ حصہ کی کتابت خود آپ کے عہد میں ہو چکی تھی، (ملاحظہ ہو: مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی تدوین حدیث، مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کی ''کتابتِ حدیث'' اور مولانا محمد رفیع عثمانی کی ''عہد نبوی میں کتابت حدیث'') آپ ﷺ کے وصال کے سو سال بعد ہی احادیث کے بڑے بڑے مجموعے مرتب ہوگئے ، جس میں مؤطا امام مالکؒ اور امام ابویوسفؒ کی

کتاب الآثار خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، ہر حدیث کی سند محفوظ ہے اور کتابوں میں درج ہے، سند میں آنے والے تمام راویوں کے حالات بھی محفوظ ہیں، جو تاریخ کا ایک عدیم النظیر ریکارڈ ہے، جسے دیکھ کر آج بھی فیصلہ کیا جا سکتا ہے، کہ وہ کس حد تک مستند یا غیر مستند ہیں؟

اب ظاہر ہے تاریخی استناد اور تحفظ کے لحاظ سے ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ آپ ہی کی ذاتِ گرامی کی طرف رجوع کریں۔

عالمگیر دعوت

کسی مذہب کے عالمگیر اور تمام انسانیت کا مذہب بننے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی تعلیمات کے لحاظ سے عالمگیر ہو، وہ تمام انسانیت کو ایک نظر سے دیکھتا ہو اور ایسا نہ ہو کہ اس نے انسانیت کو مختلف طبقوں میں تقسیم کر رکھا ہو۔

اس نقطۂ نظر سے جب آپ ہندومت کا مطالعہ کریں گے تو دیکھیں گے کہ وہ اس کمزوری سے پُر ہے، اس نے انسانوں کو مستقل طور پر چار پیدائشی طبقوں میں تقسیم کر رکھا ہے: برہمن، چھتری، ویش اور شودر، ان کے درمیان اس قدر فرق ہے کہ اگر نیچی ذات والا اونچی ذات والے شخص کا پیشہ اختیار کرتا ہے تو راجہ اس کی دولت چھین کر اسے ملک بدر کر دے، (رگ وید:۱:۵۳:۱۴، یجر وید:۱۳:۲، ستیارتھ پرکاش:۱۵۲/۴) جو شخص برہمن کے مقابلہ میں مزاحمت کرے، اس کو سوکھی لکڑی کی طرح الٹا لٹکا کر جلا دے، (ملاحظہ ہو: منوسمرتی مع شرح ہندی جناب ڈاکٹر چمن لال گوتم صاحب، مطبوعہ ویدنگر، بریلی) نیز یجر وید ادھیائے ۲۱ منترا ۱ کا مفہوم ہے کہ براہمن ایشور کے منہ سے، چھتری بازو سے، ویش ران سے اور شودر پاؤں سے پیدا ہوا ہے، اس لئے جیسے نہ منہ بازو اور نہ بازو منہ ہو سکتے ہیں، اسی طرح نہ براہمن چھتری اور نہ چھتری براہمن ہو سکتے ہیں، ہندو مذہب کی ثانوی کتاب ''منوسمرتی'' میں تخلیق، عبادت، رسم ورواج، مذہبی تعلیم، لباس، پوشاک اور خوراک، تمام اُمور میں مختلف طبقوں کے درمیان امتیاز وتفریق کا ذکر موجود ہے۔

جہاں تک عیسائی مذہب کی بات ہے، تو حضرت مسیح علیہ السلام نے اس کی خود ہی صراحت کر دی ہے:

میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔(انجیل متّی:۱۰،۵-۶)

ایک موقع پر خود اپنے شاگردوں کو ہدایت دیتے ہیں کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے شہر میں داخل نہ ہونا، بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا، (انجیل متّی:۱۰:۶) چنانچہ حضرت مسیح علیہ السلام کے حواری کا حال یہ تھا کہ اگر کوئی کسی غیر اسرائیلی کے پاس دعوتِ دین کے لئے چلا جاتا تو یہ بات ان کے درمیان موضوعِ بحث بن جاتی۔

یہ اور اس قسم کی بہت سی تصریحات اس بات کو بالکل بے غبار کر دیتی ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی نبوت اور ان کا پیغام عالمگیر نہیں تھا، بلکہ صرف بنی اسرائیل کے لئے تھا، اس کے بعد بھی جو لوگ حضرت مسیح علیہ السلام کے پیغام کو عالمگیر ثابت کرنا چاہتے ہیں وہ دراصل ''مدعی سست گواہ چست'' کے مصداق ہیں۔

اب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھئے، قرآن مجید نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا کہ ''آپ تمام کائنات کے لئے رحمت ہیں'' (الانبیاء:۱۰۷) آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی کتاب قرآن مجید خود کو ''ھدیً للناس'' (البقرہ:۱۸۵) کہتی ہے، قرآن نے جگہ جگہ ''یٰایھا الناس'' کہہ کر تمام انسانیت کو مخاطب کیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی ہی میں دنیا کے مختلف ملکوں کے بادشاہوں کے نام دعوتِ اسلام کے خطوط لکھے، خود آپ کی بارگاہِ نبوت میں مختلف رنگ و نسل اور علاقہ کے اصحاب موجود تھے، حبش کے بلال رضی اللہ عنہ، روم کے صہیب رضی اللہ عنہ، فارس کے سلمان رضی اللہ عنہ، بنی اسرائیل کے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ، یمن کے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی تحقیق کے بموجب ہندوستان کے بھی ایک صحابی رتن نامی۔

یہاں جو بات لکھی گئی ہے وہ حضرت مسیح علیہ السلام کی اس تصویر کے مطابق ہے جو بائبل نے کھینچی ہے، ورنہ تو ہر نبی اپنے اپنے زمانہ اور عہد کے لئے نمونۂ کامل ہوتا ہے، اس میں شبہ نہیں کہ زندگی کے بہت سے مرحلے حضرت مسیح علیہ السلام کی حیات میں آئے ہی نہیں، لیکن ضرور ہے کہ آنجناب نے اس کے لئے ہدایات دی ہوں گی، دوسرے حضرت مسیح علیہ السلام کو خود اس کا

اعتراف تھا کہ وہ شریعتِ سابقہ پر مامور ہیں اور تورات کا کوئی حکم ٹل نہیں سکتا، مگر سینٹ پال نے آکر قریب قریب دین مسیح کا تورات اور عہد عتیق سے رشتہ ہی کاٹ دیا، اس لئے اب تحریف کے علاوہ عیسائیت میں واضح خلاء بھی پایا جاتا ہے۔

پھر آپ ﷺ نے واضح طور پر انسانیت کے لئے مساوات اور برابری کی تعلیم دی اور تفوق و برتری کا معیار نسلی چیزوں کو نہیں بلکہ ''کسبی خوبیوں'' کو قرار دیا،''وإن اکرمکم عند اللہ أتقکم ''(الحجرات :۱۳) اس لئے ظاہر ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ ہی کی دعوت اور پیغام ایک عالمگیر نسخۂ حیات اور تمام انسانیت کے لئے دوائے دل ہوسکتی ہے۔

جامع رہنمائی

جامعیت سے مراد ایسی شخصیت ہے، جس کی سیرت میں زندگی کے تمام گوشوں کے لئے رہنمائی موجود ہو؛ تاکہ انسان اس کی زندگی کو مشعلِ راہ بنانے کے بعد کہیں بھی رہنمائی کا کوئی خلا محسوس نہیں کرے۔

ہندومت کے بارے میں یہ بات واضح ہے کہ اس میں سرے سے کوئی آئیڈیل شخصیت ہی نہیں ہے اور جن شخصیات کا ذکر ملتا ہے وہ بھی ''عبد'' نہیں ہیں: بلکہ معبودیت کے منصب پر فائز ہیں، اس لئے ان سے حیرت انگیز اور مافوق العادۃ واقعات کا اظہار ہوتا رہتا ہے، عام انسان کے لئے جس کی اتباع ممکن نہیں ہے، ویدیں جو ان کتابوں میں اصل کی حیثیت رکھتی ہیں وہ زیادہ تر صرف تحمیدی منتر، پوجا کے طریقے، خبیث اور شیاطین سے بچاؤ کی ترکیب اور اخلاقی نظموں پر مشتمل ہے۔

یہی حال عیسائیت کا ہے، انسانی زندگی کو تین اہم خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، انفرادی زندگی، معاشرتی زندگی اور اجتماعی زندگی، —— انفرادی زندگی کے احکام کا علم اسی وقت ہوسکتا تھا، جب حضرت مسیح علیہ السلام کے عام معمولات زندگی روشنی میں ہوتے، مگر صورتِ حال یہ ہے کہ سوائے چند معجزاتی واقعات، اسفار اور اخلاقی نصائح کے بائبل میں ہمیں اس بارے میں کچھ تفصیل نہیں مل سکتی، خورد ونوش، خواب و بیداری، لباس و پوشاک، گفتگو، ملاقات

اور طہارت وعبادت وغیرہ کے کیا آداب واطوار آنجناب کے تھے؟ بائبل اس کی کوئی وضاحت نہیں کرتا، معاشرتی زندگی کے لئے یہاں کوئی نمونہ مل ہی نہیں سکتا، اس لئے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو اس کا موقع ہی نہیں مل سکا کہ نکاح فرماتے اور متاہل زندگی بسر کرتے، اب ظاہر ہے کہ ازدواجی تعلقات، زوجین کے حقوق، اولاد کے حقوق، والدین کے فرائض اور کسبِ معاش کے حلال وحرام طریقوں کی تفصیل آپ کے یہاں نہیں مل سکتی، یہی حال اجتماعی زندگی کا ہے، حضرت مسیح علیہ السلام کو کبھی حکومت اور اقتدار حاصل نہ ہوسکا، اس لئے حکومت کا نظم ونسق، حکمراں اور رعایا کے تعلقات، صیغۂ عدل، جنگ وصلح کے بین ملی اُصول، فوجی اور دفاعی نظام کے باب میں یہاں کوئی رہنمائی حاصل نہیں ہوسکتی، بائبل سے ہمیں حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت کے ابتدائی حالات معلوم ہوتے ہیں، اس کے بعد پھر ان کی شخصیت پردہ میں چلی جاتی ہے اور یکبارگی نبوت کے وقت سامنے آتی ہے، اس کے بعد ایک دو سال کے عرصہ میں پہاڑی کا وعظ اور چند گنے چنے واقعات ملتے ہیں، حد یہ ہے کہ عیسائیوں کے یہاں یہ بات بھی متفق علیہ نہیں ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا مقام پیدائش بیت اللحم ہے یا ناصرہ، اب بھلا بتائیے کہ جن کی شخصیت اس قدر پردہ میں ہو اور زندگی کے اہم ترین مرحلے نہ ان کی زندگی میں آئے ہوں، نہ ان کی ہدایت دی گئی ہو، آخر ان سے انسانیت اپنی ہمہ گیر زندگی میں کس طرح رہنمائی حاصل کرسکتی ہے؟

اب اس نقطۂ نظر سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا مطالعہ کیجئے، خوشی وغم، فتح وشکست، موت و پیدائش، خواب و بیداری، نشست و برخاست، ملاقات، تعزیت، عبادات، مالی لین دین، خرید وفروخت، قرض ورہن، ہبہ ومضاربت، نکاح، ازدواجی زندگی، طلاق وتفریق، جرم وسزا، زراعت ومزدوری، اُصولِ حکمرانی، جنگ وامن کے قوانین، عدل وانصاف کے ضوابط، بین ملی ربط وتعلق، زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوہ موجود نہ ہو، یہاں تک کہ استنجاء کے آداب اور میاں بیوی کے نجی تعلقات میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات اور اطوار ہمارے سامنے ہیں اور پیدائش سے وفات تک آپ کی پوری سیرت اس طرح ہمارے سامنے

ہے گویا کوئی کاغذی فلم تیار کردی گئی ہو۔

افسوس کہ انسانیت آج اپنی زندگی کے معمولی معمولی مسائل کے لئے سرگرداں ہے، وہ مادوں اور انسانی وحیوانی جسموں پر دادِ تحقیق وصول کر رہی ہے اور اس کی کاوش فکر اور طبع آزمائی سے کوئی چیز نہیں جو مستثنیٰ رہ گئی ہو، لیکن کائنات خدا کے ایسے بندوں سے خالی ہوتی جارہی ہے، جو انسانیت کے مقصد وجود پر غور کرے اور جو سوچے کہ اس دنیا سے گذر کر اسے کسی اور عالم میں قدم رکھنا ہے؟ پھر یہ فکر اس کے دل کو تڑپا دے، اس کے دماغ کو بے چین کردے، اس سے اس کا ذہنی سکون چھین لے اور وہ تلاش حق کا سفر شروع کردے، تاہم یقین ہے کہ جو بے چینی اور تڑپ کی یہ چنگاری لے کر آگے بڑھے گا اور انسانی تاریخ کے بے شمار مذاہب اور مذہبی اور غیر مذہبی پیشواؤں پر نظر ڈالے گا، اسے اس کا ذوق وجستجو یقیناً پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ تک پہنچائے گا، صلی اللہ علیہ وسلم۔

○ ○ ○ ○

نبی رحمت کی رحمت کے کچھ پہلو

قرآن مجید میں پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مختلف صفات کا ذکر آیا ہے، یہ تمام صفات اپنی جگہ اہم ہیں اور آپ کے محاسن کو ظاہر کرتے ہیں، لیکن ان میں سب سے اہم صفت یہ ہے کہ آپ کو تمام عالم کے لئے رحمت قرار دیا گیا، وما أرسلنک الا رحمة للعالمین ، (الانبیاء:۱۰۷) ــــــ اس تعبیر کی وسعت اور ہمہ گیری پر غور فرمائیے کہ آپ کی رحمت مکان و مقام کی وسعت کے لحاظ سے پوری کائنات کو شامل ہے اور زمانہ وزمان کی ہمہ گیری کے اعتبار سے قیامت تک آنے والے عرصہ کو حاوی ہے، یہ کوئی معمولی دعویٰ نہیں، اور شاید ہی تاریخ کی کسی شخصیت کے بارے میں ایسا دعویٰ کیا گیا ہو، یہ دعویٰ جتنا عظیم ہے اسی قدر واقعہ کے مطابق بھی ہے، آپ کی رحمت کا دائرہ یوں تو پوری کائنات تک وسیع ہے، زندگی کے ہر گوشہ میں آپ کا اسوہ رحمت کا نمونہ ہے، لیکن اس وقت انسانیت پر آپ کی رحمت کے چند خاص پہلوؤں پر روشنی ڈالنا مقصود ہے۔

ان میں پہلی بات یہ ہے کہ آپ نے انسانیت کو وحدت الٰہ کا تصور دیا، خدا کو ایک ماننا بظاہر ایک سادہ سی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن بمقابلہ الحاد و انکار اور شرک و مخلوق پرستی کے یہ ایک انقلابی عقیدہ ہے، خدا کا انکار انسان کو غیر ذمہ دار، گناہوں کے بارے میں جری اور مادہ پرست بنا دیتا ہے؛ کیوں کہ اسے جواب دہی کا کوئی خوف نہیں ہوتا اور دنیا اس کے لئے محض عشرت کدۂ حیات ہوتی ہے، گویا انسان خدا کی بندگی سے آزاد اور لذت وعیش کا غلام بن جاتا ہے، شرک انسانیت کی تذلیل ہے، کیوں کہ مشرک ادنیٰ سے ادنیٰ شئ کے سامنے بھی پیشانی جھکانے میں کوئی حیا محسوس نہیں کرتا، مشرک خدا کے بجائے مخلوق سے نفع ونقصان کی اُمیدیں وابستہ کر لیتا ہے، اس لئے اس میں توہم پرستی پیدا ہوتی ہے، اسے قدم قدم پر نحس اور بے برکتی کے خطرات پریشان کرتے رہتے ہیں اور معمولی چیزوں کے خوف سے بھی اس کا دل بیٹھا رہتا

ہے، اللہ کے ایک ہونے کے تصور سے انسانیت کی تکریم اور اس کا اعزاز متعلق ہے، یہ اس بات کا اعلان ہے کہ اس کی پیشانی غیر اللہ کے سامنے جھکنے سے ماوراء ہے اور خدا نے اس کو پوری کائنات پر فضیلت بخشی ہے، اسی لئے قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ نے فرشتوں سے بھی حضرت آدم کو سجدہ کرایا، اور اس طرح انسانی کرامت وشرافت کو ظاہر فرمادیا، عقیدہ توحید نے انسانیت کو اوہام پرستی سے نجات دلایا؛ کیوں کہ توحید پر ایمان رکھنے والا اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ مخلوق اسے نفع ونقصان پہنچانے سے عاجز ہے، توحید کا عقیدہ انسان کے اندر خدا کی محبت اور خدا کا خوف پیدا کرتا ہے اور یہ خشیت اور خدا کے راضی کرنے کا جذبہ فرائض کی ادائے گی اور ذمہ داری کا احساس پیدا کرتی ہے اور وہ دنیا کو قصر عشرت سمجھنے کے بجائے محل امتحان سمجھ کر پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے، اس لئے توحید کا عقیدہ انسانیت کے لئے بہت بڑی نعمت اور سامان رحمت ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ انسانیت کو حاصل ہوا۔

گو حضور ﷺ سے پہلے بھی انبیاء نے توحید کی تعلیم دی اور بہت سے مصلحین نے بھی شرک کی تردید وانکار کا فریضہ انجام دیا، لیکن حضرت نوحؑ سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک ہمیشہ انسانیت پر مشرکانہ فکر کا غلبہ رہا، یہاں تک کہ جو مذاہب توحید کا علم لے کر اُٹھے، وہ خود بھی شرک کے رنگ میں رنگ گئے، یہودی اصلاً موحد تھے، لیکن یہود کے بعض فرقوں نے حضرت عزیر کو خدا کا شریک قرار دیا، عیسائیوں نے تو حضرت مسیح کی الوہیت کو اپنے عقیدہ کا بنیادی جزو ہی بنالیا، ہندو مذہب میں بھی توحید کا عنصر موجود ہے، مگر انھوں نے خود اپنے لاتعداد خدا تخلیق کر لئے، بودھ مذہب کی بنیاد مذہب کے شارحین کے خیال کے مطابق خدا کے انکار پر ہے، لیکن بودھ مذہب کے متبعین نے خود بودھ جی کی پرستش شروع کردی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کی فکر کو اس طرح غالب فرمایا کہ وہ قیامت تک کے لئے ایک غالب فکر بن گئی، یہاں تک کہ جن مذاہب کی اساس شرک پر تھی، ان میں بھی ایسی تحریکات اٹھیں جو توحید کی داعی تھیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفتِ رحمت کا دوسرا مظہر ''انسانی وحدت'' کا تصور ہے،

آپ کی بعثت سے پہلے قریب قریب دنیا کی تمام تہذیبوں اور مذاہب میں انسان اور انسان کے درمیان تفریق اور کچھ لوگوں کے پیدائشی طور پر معزز اور کچھ لوگوں کے حقیر ہونے کا تصور موجود تھا، یہودی اسرائیلی اور غیر اسرائیلی میں تفریق کرتے تھے اور جو لوگ حضرت یعقوب علیہ السلام کی نسل سے ہوں ان کو پیدائشی طور پر افضل و برتر جانتے تھے، ایران کے لوگوں کا خیال تھا کہ جو لوگ بادشاہ کی نسل سے ہوں وہ خدا کے خاص اور مقرب بندے ہیں بلکہ خدا کا کنبہ ہیں، ہندوستان کا حال تو شاید سب سے خراب تھا کہ انسانیت کو مستقل طور پر چار طبقوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا، کچھ لوگوں کے بارے میں تصور تھا کہ وہ خدا کے سر سے پیدا کئے گئے ہیں، کچھ لوگ خدا کے بازو سے، کچھ کی پیدائش خدا کے ران سے ہوئی ہے اور کچھ کی پاؤں سے، یہ برہمن، ویش، کھتری اور شودر کہلاتے تھے، شودر اتنا بد قسمت گروہ تھا کہ تاریخ عالم میں شاید ہی ایسی اجتماعی اور قومی مظلومیت کی مثال مل سکے، ان پر تعلیم کا دروازہ بند تھا، ان کے لئے کچھ ذلیل سمجھے جانے والے پیشے مخصوص تھے اور وہ اونچی ذاتوں کے لئے پیدائشی غلام سمجھے جاتے تھے، کم و بیش یہی حال دنیا کے مختلف علاقوں اور مختلف قوموں میں تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی وحدت کا تصور پیش کیا اور پیدائشی طور پر افضل و برتر اور حقیر و کہتر ہونے کے تصور کو رد فرما دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف اعلان کیا کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی گورے کو کسی کالے پر محض رنگ و نسل کی وجہ سے کوئی فضیلت نہیں، بلکہ فضیلت کا معیار انسان کا تقویٰ اور اس کا عمل ہے، اس اعلان نے عرب کے معزز قبائل اور حبش و روم کے بلال رضی اللہ عنہ وصہیب رضی اللہ عنہ کو ایک صف میں کھڑا کر دیا، بلکہ یہ عجمی نژاد غلام جو کبھی حقارت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، زعماء عرب کے لئے وجہ رشک بن گئے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے فرمانروا بھی انھیں اپنے ''سردار'' کے لفظ سے مخاطب کرتے تھے، یہ آپ ہی کی تعلیمات کا نتیجہ ہے کہ اسلام کے پھیلنے کے ساتھ ہی تفریق و امتیاز کی زنجیریں کٹنے لگیں، انسانی مساوات کے نعرے ہر سو بلند ہوئے اور دنیا کی مظلوم و مقہور قوموں کو پیدائشی غلامی سے آزادی نصیب ہوئی اور اگر کہیں کسی انسان گروہ نے اپنی شقاوت اور جور و جفا سے اس ظلم کے سلسلہ کو جاری بھی رکھا، تو

ان کو ہر طرف سے طعن و تشنیع کے الزام سننے پڑے اور مظلوموں کو ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کا موقعہ فراہم ہوا، یہ آپ کی رحمت عامہ کا ایسا پہلو ہے کہ کوئی صاحب بصیرت اسے نظر انداز نہیں کرسکتا۔

اس وحدت انسانی کے تصور نے زندگی کی تمام شعبوں پر اپنا اثر ڈالا، تمام لوگوں کے لئے ہر طرح کے پیشہ کا دروازہ کھل گیا اور پیشوں کی تحقیر و تذلیل کا تصور ختم ہوا، علم کی روشنی عام ہوئی اور ہر ایک کے لئے تعلیم کا دروازہ کھلا، سماجی زندگی میں ہر ایک کے لئے باعزت طریقہ پر زندگی بسر کرنے کا موقع فراہم ہوا، جرم وسزا کے باب میں انصاف کا قائم کرنا ممکن ہوا اور ہر ایک کے لئے اپنی تہذیب اور اپنی روایات کا تحفظ ممکن ہوسکا، لیکن اس انسانی وحدت کے تصور نے سب سے زیادہ اثر سیاسی نظام پر ڈالا، اسلام سے پہلے پوری دنیا کے سیاسی اُفق پر ملوکیت کا تصور چھایا ہوا تھا اور اس کے مقابلہ میں کوئی اور نظام سیاست عملاً موجود نہیں تھا، ظہور اسلام کے وقت جتنی معلوم طاقتیں تھیں وہ سب ملوکیت کی نمائندہ تھیں، روم میں بادشاہت تھی، ایران میں بادشاہت تھی، حبش میں بادشاہت تھی، یمن میں بادشاہت تھی، ہندوچین کے علاقوں میں بھی چھوٹے بڑے راجا تھے، غرض پوری دنیا بادشاہت کے آمرانہ نظام اور پنجہ استبداد کے تحت تھی، یہاں تک کہ یونان کے فلاسفہ نے جس جمہوریت کا نقشہ پیش کیا تھا، اس میں بھی ''اشراف'' کی حکومت کا تصور تھا اور عام لوگوں کے اقتدار میں شرکت کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

اسلام نے انسانی وحدت اور مساوات کا جو تصور پیش کیا اس نے محض خاندانی بنیاد پر حکومت واقتدار کے ارتکاز اور فرمانروائی کے تصور کو پاش پاش کردیا اور جمہوریت کے تصور نے غلبہ حاصل کیا، چنانچہ آج صورت حال یہ ہے کہ پوری دنیا میں جمہوری نظام قائم ہے جو اسلام کے تصور خلافت سے مستعار اور اپنی بعض خامیوں کے باوجود انسانی وحدت و مساوات کا علمبردار ہے، یہاں تک کہ آج یا تو بادشاہت کا وجود ہی نہیں، یا ہے تو محض دستوری اور علامتی بادشاہت ہے، اور اگر کہیں جبراً آمرانہ ملوکیت باقی ہے تو وہ پوری دنیا کی نگاہ میں قابل تحقیر اور لائق ملامت ہے۔

رحمت نبوی کا تیسرا اہم پہلو علم کی حوصلہ افزائی ہے، آپ جس سماج میں تشریف لائے وہاں لوگ اس بات کو سرمایۂ افتخار سمجھتے تھے کہ وہ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے، وہ بہت ہی فخر کے ساتھ اپنے ''اُمّی'' ہونے کی بات کہتے تھے، آپ ﷺ نے تعلیم و تعلم کی حوصلہ افزائی فرمائی اور علم کو بلا امتیاز و تفریق ہر طبقہ کے لئے عام فرمایا، پھر آپ نے علم کے معاملہ میں دین اور دنیا کی کوئی تقسیم نہیں کی، بلکہ ہر وہ علم جو انسانیت کے لئے نفع بخش ہو خدا سے اس کے لئے دُعاء فرمائی اور فرمایا کہ علم و حکمت کی جو بات جہاں سے مل جائے، اس کی طرف ایسا لپکنا چاہئے، جیسے انسان اپنی گم شدہ چیز کے لئے لپکتا ہے، الحکمة ضالة المؤمن، (ترمذی: ابواب العلم، حدیث نمبر: ۲۶۸) آپ ﷺ نے مسلمانوں بچوں کو بدر کے مشرک قیدیوں سے تعلیم دلائی اور مدینہ میں یہودیوں کی درس گاہ ''بیت المدراس'' میں تشریف لے گئے، جس سے علم کے باب میں آپ کی فراخ قلبی اور کشادہ چشمی کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس سے نہ صرف یہ کہ علم کا دور دورہ ہوا، بلکہ غیر سائنٹفک کی جگہ سائنٹفک فکر کا غلبہ ہوا اور توہمات کی زنجیریں کٹیں، شرک چوں کہ مخلوقات کو معبود کا درجہ دیتا ہے اور جو معبود ہو اس کی عظمت اور اس کا احترام تحقیق و تجسس میں مانع بن جاتا ہے؛ اس لئے وہ علمی ترقی اور تحقیق و سائنس کے ارتقاء میں رکاوٹ بن جاتی ہے، توحید چوں کہ مخلوقات کے معبود ہونے کی نفی کرتی ہے، اس لئے کائنات کی تمام اشیاء پر غور و فکر، بحث و تحقیق اور تفحص و تجسس کا راستہ کھلتا ہے اور انسان علم میں جتنا آگے بڑھتا جائے اور کائنات کے حقائق پر جو پردے پڑے ہوئے ہیں، ان کو جس قدر اٹھاتا جائے وہ اسی قدر توہمات سے آزاد ہوتا جاتا ہے۔

پس اسلام نے علم و تحقیق کی راہ کھولی، مخلوق کی مبالغہ آمیز عظمت دلوں سے نکالی اور اوہام کا پردہ چاک کیا، اسلام سے پہلے لوگ عورتوں کو، جانوروں میں گدھے کو، پرندوں میں اُلّو کو، مہینوں میں شوال اور صفر، کو دنوں میں چہارشبہ کو منحوس تصور کرتے تھے اور خود اپنے لکھے ہوئے پانسوں پر کامیابی اور ناکامی کی اُمیدیں قائم کرتے تھے، نحس کے سلسلہ میں اور بھی بہت سے تصورات تھے، جو عربوں میں پائے جاتے تھے، ہندوستان وغیرہ میں آج بھی یہ تصورات اچھے

خاصے پڑھے لکھے لوگوں پر بھی مسلط رہتا ہے، بلکہ خود یورپ میں بھی عام لوگ توہمات میں مبتلا ہیں، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اس توہم پرستی کی تردید فرمائی، اُصولی طور پر اس بات کو واضح فرمایا کہ نفع ونقصان کس مخلوق سے متعلق نہیں، بلکہ یہ خالق کے ہاتھ میں ہے، اور جن جن باتوں کے بارے میں نحس و بے برکتی کا تصور تھا صراحت کے ساتھ ان کی تردید فرمائی، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت عامہ کا ایک اہم پہلو ہے، جس نے انسانیت کو توہمات کی بیڑیوں سے نکال کر علم وتحقیق کی دنیا میں پہنچایا اور اس تحقیق نے نئی نئی ایجادات واختراعات کی تحریک کی، جس کے مظاہر اور جس کے فوائد آج ہمارے سامنے ہیں۔

اسلام سے پہلے اہل مذاہب نے دین اور دنیا کا بٹوارہ کر رکھا تھا اور دین و دنیا کی اس تقسیم نے قانون فطرت کے خلاف بغاوت کر رکھی تھی، نکاح کو بری بات سمجھا جاتا تھا، قرب خداوندی کے لئے تجرد کی زندگی ضروری سمجھی جاتی تھی اور مرد و عورت کے فطرت تعلق کو بہر صورت گناہ باور کیا جاتا تھا، کسب معاش کی محنتوں کو دین الٰہی اور رضائے خداوندی کے خلاف گمان کیا جاتا تھا، یہاں تک کہ رہبانیت کے غلبہ کا عیسائیت میں ایک ایسا دور بھی گذرا ہے کہ لوگ نہانے، دھونے، صاف ستھرے کپڑے پہننے اور خوشبو استعمال کرنے کو بھی للّٰہیت کے خلاف سمجھتے تھے اور دسیوں سال غسل سے مجتنب رہتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت کا ایک اہم بات رہبانیت کے اس تصور کا خاتمہ ہے، آپ ﷺ نے تعلیم دی کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے حدود میں رہتے ہوئے دنیا سے نفع اُٹھانا بھی دین کا ایک حصہ ہے، 'دین' دنیا سے نفع اُٹھانے میں حلال وحرام کی تمیز کا نام ہے نہ کہ دنیا کو ترک کردینے کا، چنانچہ آپ نے نکاح کرنے کا حکم دیا اس کو اپنی اور انبیاء کی سنت قرار دیا اور تجرد کی زندگی کو ناپسند فرمایا، کسب معاش کو ایک اہم فریضہ قرار دیا اور اس کی حوصلہ افزائی فرمائی، صفائی ستھرائی کی تعلیم دی اور کوئی ایسا حکم نہیں دیا جو انسانی فطرت سے متصادم ہو؛ بلکہ انسانی فطرت میں جو تقاضے اور داعیے رکھے گئے ہیں ان سب کو جائز رکھا گیا اور کوئی ایسا حکم نہیں دیا گیا جو فطرت انسانی کے خلاف ہو۔

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت عامہ کے وہ پہلو ہیں، جنھوں نے انسانی تاریخ

پر گہرے اور دوررس اثرات ڈالے ہیں، جن کے ذریعہ انسانی کرامت وشرافت بحال ہوئی، جن کی وجہ سے انسانیت عدل و مساوات اور اخوت و بھائی چارگی کی نعمت سے سرفراز ہوئی اور تفریق کی مصنوعی دیواریں جن کی وجہ سے زمین بوس ہوئیں، جن کے باعث انسان نے اوہام کے بجائے عقل وخرد سے کام لینا سیکھا، اوران میں علم وتحقیق کا حوصلہ پیدا ہوا جس نے انسان کو معتدل، متوازن، قانونِ فطرت سے ہم آہنگ اور تمام انسانی ضروریات کو پوری کرنے والا نظام حیات عطا کیا، انسانیت قیامت تک اس کے لئے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی احسان مندر ہے گی اور ''ماأرسلناک الا رحمة للعالمین'' کے مژدۂ خداوندی اور شہادت الٰہی کا اعتراف کرتی رہے گی، و صلی اللہ علی خیر خلقه محمد و اٰ له و اصحابه اجمعین۔

○ ○ ○ ○

باب دوم

حیاتِ طیبہ ﷺ — ایک نظر میں

نبوت سے پہلے کی زندگی

○ ۲۰/اپریل ۵۷۱ء، پیر کے دن آپ ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی، محققین کے نزدیک یہ ربیع الاول کی ۹/ تاریخ تھی، دادا نے آپ کا نام محمد رکھا اور بعض روایت کے مطابق والدہ نے احمد، جب آپ ﷺ بڑے ہوئے تو صاحبزادے کی نسبت سے 'ابوالقاسم' کنیت اختیار فرمائی، والد ماجد کا نام حضرت عبداللہ، دادا کا عبدالمطلب اور پردادا کا ہاشم، نانا کا وہب، دادی کا فاطمہ اور نانی کا برہ، آپ کے والد دس بھائی تھے :

(۱) عباس (۲) حمزہ (۳) ابولہب (۴) ابوطالب (۵) زبیر
(۶) حارث (۷) مقدم (۸) حجل (۹) ضرار (۱۰) قثم

ان میں سے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ مشرف بہ اسلام ہوئے، ابو طالب آپ کے نہایت ہی محسن اور محبوب چچا تھے اور ابولہب اسی قدر بدترین دشمن، —— آپ کی پھوپھیاں چھ تھیں :

(۱) اُم حکیم (۲) عاتکہ (۳) برہ
(۴) امیمہ (۵) اروی (۶) صفیہ

ان میں سے حضرت صفیہ ؓ نے اسلام قبول کیا تھا، اور اُم حکیم آپ ﷺ کے والد کی جڑواں بہن تھیں۔

آپ ﷺ کا خاندان والد کی طرف سے اس طرح ہے :

عبداللہ —— عبدالمطلب —— ہاشم —— عبدمناف —— قصی —— کلاب —— مرۃ —— کعب —— لؤی —— غالب —— فہر بن مالک (قریش)۔

والدہ کی طرف سے آپ کا خاندان، کلاب پر جا کر مل جاتا ہے :

آمنہ —— وہب —— عبدمناف —— زہرہ —— کلاب۔

○ آپ ﷺ کی ولادت سے دو ماہ قبل ہی آپ ﷺ کے والد ماجد کی وفات ہوگئی، ولادت کے بعد پہلے خود آپ ﷺ کی والدہ حضرت آمنہ اور پھر ابولہب کی باندی حضرت ثویبہؓ نے دودھ پلایا، عرب کا دستور تھا کہ دیہات کی خواتین شہر آتیں اور معزز قبائل کے بچوں کو دودھ پلانے کے لئے لے جاتیں، بچوں کے سرپرست ان کی مالی مدد کرتے، اور وہ بھی اس کو پسند کرتے؛ کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ شہر کے لوگوں کی زبان مختلف قبائل کے اختلاط کی وجہ سے بگڑ جاتی ہے اور دیہات کے لوگوں کی زبان اصل حالت میں محفوظ رہتی ہے، چنانچہ حضور ﷺ اس دستور کے مطابق حضرت حلیمہ سعدیہؓ کے حوالہ ہوئے، یہ قبیلہ بنوسعد سے تعلق رکھتی تھیں، جن کی فصاحت و بلاغت اور عربی زبان و اُسلوب میں مہارت مشہور تھی، دو سال کی عمر تک حضرت حلیمہ سعدیہؓ نے آپ ﷺ کو دودھ پلایا اور آپ ﷺ کی وجہ سے ہونے والی برکتوں کو دیکھتے ہوئے حضرت حلیمہ کی خواہش پر آپ نے مزید دو سال ان کے یہاں گزارے، آپ کے رضاعی بھائیوں (یعنی حضرت حلیمہؓ کے بچوں کے نام) عبداللہ، حذیفہ، انیسہ اور شیما ہے، آپ ﷺ کے رضاعی والد یعنی حضرت حلیمہؓ کے شوہر کا نام حارث بن عبدالعزیٰ تھا، حضرت ثویبہؓ اور حضرت حلیمہؓ آپ ﷺ پر پہلے ایمان لائیں، حارث بن عبدالعزیٰ، عبداللہ اور شیما کو بھی بعد میں قبول اسلام کا شرف حاصل ہوا۔

حضرت ثویبہ کا دودھ حضرت حمزہ، حضرت جعفر، حضرت اُم سلمہ کے پہلے شوہر حضرت ابوسلمہ اور حضرت ثویبہ کے صاحبزادے حضرت مسروح رضی اللہ عنہم نے بھی پیا تھا، نیز حضرت حلیمہ کے دودھ پینے والوں میں آپ کے چچازاد بھائی حضرت سفیان بن حارث رضی اللہ عنہ بھی تھے، اس طرح یہ سب آپ رضی اللہ عنہ کے رضاعی بھائی ہوئے، ان کے علاوہ بعض اور خواتین نے بھی آپ ﷺ کو مختصر عرصہ کے لئے دودھ پلایا ہے۔

حضرت آمنہ کا میکہ مدینہ میں تھا، حضرت عبداللہ کی وہیں وفات ہوگئی تھی، چنانچہ حضرت آمنہ اپنے صاحبزادے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنی وفادار باندی حضرت ام ایمن کے

ساتھ مدینہ گئیں اور واپسی میں ''ابوا'' کے مقام پر حضرت آمنہ کی وفات ہوگئی، اس وقت آپ ﷺ کی عمر مبارک ۶ سال تھی، یہاں سے حضرت ام ایمن آپ ﷺ کو اپنے ساتھ لے کر مکہ واپس آئیں اور آپ ﷺ اپنے دادا حضرت عبدالمطلب کی پرورش میں آگئے، حضرت ام ایمن نے ایک ماں کی طرح بھرپور شفقت ومحبت کے ساتھ آپ کی پرورش کی، آپ ﷺ کہتے تھے کہ یہ میری ''ماں'' کے بعد ''ماں'' ہیں، جو آپ ﷺ سے بے حد محبت کرتی تھیں، جب عمر مبارک آٹھ سال کی ہوئی تو دادا نے بھی داغ فراق دیا۔

حضرت ابوطالب آپ کے والد ماجد کے سگے بھائی تھے، یعنی دونوں کی ماں ایک تھیں، حضرت عبدالمطلب نے اپنی وفات سے پہلے آپ ﷺ کو حضرت ابوطالب کے حوالہ کردیا، ان کی زوجہ حضرت فاطمہ بنت اسد بھی آپ سے بے حد پیار کرتی تھیں، جس کا آپ ﷺ نے خود ذکر فرمایا ہے، ان چچا اور چچی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو والدین کی محبت عطا کی، عبدالمطلب نے حضرت ام ایمن کو بھی آپ ﷺ کی پرورش کے بارے میں خصوصی ہدایت فرمائی، حضرت عبدالمطلب کے بعد آپ کے حسب وصیت آپ کے چچا 'زبیر' بنو ہاشم کے سردار ہوئے اور تیرہ سال تک سردار رہے، ان کے انتقال کے وقت آپ ﷺ کی عمر ۲۱-۲۲ سال تھی، پھر حضرت ابوطالب بنو ہاشم کے سردار رہے اور ۲۸ سال تک اس ذمہ داری پر رہے، ان کی وفات کے بعد ابولہب سردار ہوئے جب آپ ﷺ کی عمر مبارک تقریباً پچاس سال کی تھی۔

عرب کے عام دستور کے مطابق آپ ﷺ نے بچپن میں بھیڑ بکریاں بھی چرائی ہیں، جب آپ ﷺ کی عمر مبارک بارہ سال تھی، تو حضرت ابوطالب نے شام کے تجارتی سفر کا ارادہ کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اصرار پر آپ ﷺ کو بھی حضرت ابوطالب نے ساتھ رکھ لیا، راستہ میں ''تیماء'' نامی مقام پر قیام کا موقع ہوا، وہاں ''بحیرہ'' نامی ایک راہب تھا، اس نے آپ ﷺ کے اندر ''خاتم النبیین'' ہونے کی علامتیں دیکھیں، اس کو اندیشہ ہوا کہ اگر شام کے یہود آپ ﷺ کو پہچان لیں تو کہیں آپ ﷺ کی جان کے درپئے نہ ہوجائیں، چنانچہ بحیرہ کی خواہش پر حضرت ابوطالب نے آپ ﷺ کو واپس کردیا، دوبارہ جب عمر مبارک ۲۵ سال کے

قریب ہوئی تو حضرت خدیجہ الکبریٰ کی خواہش پر ان کا مال لے کر آپ ﷺ نے شام کا سفر فرمایا؛ تاکہ وہاں تجارت کریں اور نفع میں دونوں شریک ہوں، حضرت خدیجہ نے اپنے غلام میسرہ کو بھی آپ ﷺ کے ساتھ کر دیا تھا، اس تجارت میں بہت نفع ہوا۔

آپ ﷺ کی دیانت و امانت سن کر اور میسرہ کے ذریعہ آپ ﷺ کے احوال جان کر حضرت خدیجہ بے حد متاثر ہوئیں اور انھوں نے آپ ﷺ کو پیغام نکاح بھیجا، اس وقت آپ کی عمر مبارک ۲۵ سال تھی، حضرت خدیجہؓ کی عمر مشہور قول کے مطابق چالیس سال تھی اور بعض حضرات کی رائے میں اٹھائیس سال، آپ نے اسے قبول فرمایا، اس زمانہ میں نکاح کے موقع پر عاقدین میں سے ہر ایک کی طرف سے خطبہ دیا جاتا تھا، جس میں اپنے اپنے خاندان کی تعریف ہوتی تھی، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حضرت ابوطالب نے اور حضرت خدیجہ کی طرف سے ورقہ بن نوفل نے نکاح کا خطبہ دیا، مہر کے بارے میں تین روایتیں ہیں، بیس اونٹ، چار سو دینار یا پانچ سو درہم، آپ ﷺ کی طرف سے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور دوسرے سرداران قریش مجلس نکاح میں موجود رہے۔

حضرت خدیجہؓ سے نکاح کے بعد آپ ﷺ محلّہ بنو ہاشم سے حضرت خدیجہ کے گھر 'دار خزیمہ' منتقل ہو گئے حضرت خدیجہ کو ان کے بھتیجے حکیم بن حزام نے ایک غلام "زید بن حارثہ" دیا تھا، جو اصل میں یمن کے قبیلہ بنو خزاعہ کے سردار حارثہ بن شراجیل کے صاحبزادے تھے، جنھیں ڈاکوؤں نے زبردستی آٹھ سال کے عمر میں اغوا کر کے بیچ دیا تھا، حضرت خدیجہ نے اپنے ہونہار غلام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دے دیا، وہ آپ ﷺ کے ایسے جان نثار ثابت ہوئے کہ والد اور چچا جب لینے کے لئے آئے تو پھر بھی آپ کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی، نبوت کے بعد بھی وہ آپ کے جاں نثار و محبوب صحابہ رضی اللہ عنہ میں ہوئے۔

نبوت سے پہلے کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ کچھ لوگ عبداللہ بن جدعان کے گھر میں اس مقصد سے جمع ہوئے کہ سب لوگ مل کر ظالم کو ظلم سے روکنے کی کوشش کریں، اور مظلوم کی مدد

کریں، اس معاہدہ کو "حلف الفضول" کہتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس میں شریک ہوئے، آپ کو یہ معاہدہ اس قدر پسند تھا کہ آپ ﷺ نبوت کے بعد بھی فرماتے تھے کہ اگر اب بھی مجھے ایسے معاہدہ کی طرف دعوت دی جائے تو میں اسے قبول کروں گا۔

جب عمر مبارک ۲۵ سال کی ہوئی، تو خانہ کعبہ میں بارش کی وجہ سے شگاف پڑ جانے کے سبب کعبۃ اللہ کی تعمیر نو انجام پائی، تعمیر کعبہ میں دروازے والی دیوار بنی عبد مناف اور بنی زہرہ کے ذمہ آئی، رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیانی دیوار بنو مخزوم اور بنو تیم نے تعمیر کی، حطیم والا حصہ بنو عبد الدار اور بنو اسد اور بنو عدی کے حصہ میں آیا اور پیچھے کی دیوار بنو سہم اور بنو جمح نے تعمیر کی، اس میں جب حجر اسود کو اپنی جگہ پر رکھنے کا موقع آیا تو مختلف قبائل کے درمیان کشمکش شروع ہوئی، اور قتل وقتال کا اندیشہ پیدا ہو گیا، ایسے موقع پر مکہ کے ایک بزرگ "امیہ بن مغیرہ" نے تجویز پیش کی کہ کل جو شخص سب سے پہلے کعبۃ اللہ میں آئے وہ حجر اسود کو اپنی جگہ پر رکھے، کل سب سے پہلے کعبہ میں آنے والی شخصیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی، چنانچہ آپ ﷺ نے ایک چادر منگائی، اس کے وسط میں پتھر رکھا، ہر ہر قبیلہ سے ایک ایک نمائندہ طلب کیا، اور ان سب سے کہا کہ وہ چادر کے کنارے پکڑ کر حجر اسود کو اس جگہ تک لے جائیں، جہاں اسے نصب کیا جانا ہے، پھر جب وہاں پہنچے تو اپنے دستِ مبارک سے پتھر کو اپنی جگہ پر نصب فرمادیا۔

نبی بنائے جانے سے پہلے بھی آپ ﷺ نے کبھی بتوں کی پوجا نہیں کی، اور کوئی ایسا کام نہیں کیا جو گناہ کا ہو یا جو شرم وحیاء کے تقاضوں کے خلاف ہو، آپ ﷺ کے خصوصی احباب حضرت ابوبکر صدیق، حضرت حکیم بن حزام، اور حضرت ضماد بن ثعلبہ رضی اللہ عنہم تھے، اور یہ سبھی بعد کو مشرف بہ اسلام ہوئے، خوش اخلاقی اور راست گوئی کی وجہ سے نبی بنائے جانے سے پہلے بھی لوگ آپ کو "امین" اور "صادق" کہا کرتے تھے۔

مکی زندگی

جب آپ ﷺ کی عمر مبارک چالیس سال کے قریب ہوئی، تو ایک خاص کیفیت یہ پیدا ہوئی کہ آپ ﷺ تنہائی کو پسند فرماتے، مکہ کے قریب ایک پہاڑی ''حرا'' کی بلندی پر واقع غار میں جا کر کئی دنوں کے لئے قیام پذیر ہو جاتے اور مسلسل غور وفکر میں مشغول رہتے اور کعبۃ اللہ کی طرف دیکھتے رہتے، حرا کی پہاڑی مکہ سے تین میل کے فاصلہ پر واقع ہے، جس کی اونچائی تقریباً دو ہزار فٹ ہے اس پر موجود یہ غار مستطیل شکل میں ہے اور کعبہ رُخ ہے، نیز اندر سے تقریباً چار گز لمبا پونے دو گز چوڑا اور قد آدم اونچا ہے، اور فرش قدرتی طور پر مسطح ہے۔

ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ تقریباً چھ ماہ سے ایک خاص بات یہ پیش آنے لگی کہ آپ ﷺ خواب دیکھتے اور وہ دن کے اجالوں میں حقیقت بن کر ظہور پذیر ہوتا، اس درمیان ایک شب حضرت جبرئیل علیہ السلام آئے، انھوں نے آپ ﷺ کو اپنے سینہ سے لگا کر بھینچا اور کہا: ''پڑھیے! آپ ﷺ نے فرمایا: مین پڑھا ہوا نہیں ہوں''، تین بار اسی طرح ہوا، پھر ''اِقرا باسم ربک'' کی ابتدائی آیات آپ ﷺ پر نازل ہوئیں، اس طرح آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبوت کا تاج پہنایا گیا، اس وقت آپ ﷺ کی عمر مبارک چالیس سال چھ ماہ تھی، قرآن مجید کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ رمضان المبارک میں پیش آیا، بعض اہل علم کی تحقیق کے مطابق ۱۴/اگست ۶۱۰ء کا واقعہ ہے۔

آپ ﷺ اس واقعہ سے گھبرا گئے، گھر آئے، حضرت خدیجہ سے ذکر فرمایا، حضرت خدیجہؓ نے تسلی دی، کہ آپ ﷺ صلہ رحمی کرتے ہیں، لوگوں کی مصیبتوں میں کام آتے ہیں، مہمانوں کو پناہ دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو ضائع نہیں کر سکتے، مکہ میں توراۃ وانجیل کے ایک بڑے عالم ورقہ بن نوفل تھے، یہ حضرت خدیجہؓ کے قریبی عزیز تھے اور انجیل کا سریانی سے عربی زبان میں ترجمہ کیا کرتے تھے، حضرت خدیجہؓ آپ ﷺ کو ان کے پاس لے گئیں اور ان

سے پوری کیفیت سنائی، حضرت ورقہ بن نوفل نے حالات سن کر اور خود سوالات کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ وہی فرشتہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر آیا تھا، ورقہ نے اطمینان دلایا اور کہا کہ کاش! میں اس وقت زندہ ہوتا جب آپ ﷺ کو آپ ﷺ کی قوم نکال دے گی، آپ ﷺ کو اس پر حیرت ہوئی، ورقہ نے کہا کہ جس شخص کو بھی اس منصب سے نوازا گیا ہے، اس کے ساتھ ایسا ہی واقعہ پیش آیا ہے، اس کے بعد ابتداءً تین سال تک آپ خاموشی سے لوگوں کو دین کی طرف بلاتے رہے، پھر جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ آپ ﷺ اپنے قریبی رشتہ داروں کو دین حق کی طرف بلائیں، ''أنذر عشيرتک الأقربين واخفض جناحک لمن اتبعک من المؤمنين'' (الشعراء: ۲۱۴،۲۱۵) تو آپ ﷺ نے بنو ہاشم کو کھانے پر مدعو کیا اور ان کے سامنے دین حق کا پیغام رکھا، ابولہب نے سختی سے آپ ﷺ کی مخالفت کی اور تنہا حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے، جنھوں نے کمسنی کے باوجود تائید وتقویت کا اعلان کیا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا حکم نازل ہوا ''فاصدع بما تؤمر وأعرض عن المشركين'' (حجر: ۹۴) پھر تمام اہل مکہ کو دعوت دینے کے لئے آپ ایک صبح صفا کی پہاڑی پر چڑھے، اور مکہ کے قدیم دستور کے مطابق ندا لگائی، سارے لوگ جمع ہو گئے، آپ نے فرمایا: تم لوگوں نے مجھے سچا پایا یا جھوٹا؟ اور امانت دار پایا یا خائن؟ سبھوں نے کہا کہ آپ صادق وامین ہیں! پھر آپ نے مزید توثیق کے لئے فرمایا: اگر میں کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے دشمنوں کی فوج ہے جو حملہ کرنا چاہتی ہے، تو کیا تم اسے سچ مانو گے؟ لوگوں نے کہا: گو بظاہر یہ خبر غیر متوقع ہوگی، لیکن اگر آپ کہیں گے تو ہم قبول کریں گے، پھر آپ نے ان پر توحید و رسالت کو پیش فرمایا، ابوجہل اور ابولہب نے سنتے ہی مخالفت شروع کردی، اور کسی شخص نے آپ ﷺ کی دعوت قبول نہیں کی۔

نبوت کے بعد آپ ﷺ نے مکہ میں تیرہ سال گذارے، آپ ﷺ کی دعوت پر عورتوں میں سب سے پہلے حضرت خدیجہؓ نے، مردوں میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے، بچوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اور غلاموں میں زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے لبیک کہا، ابتدائی دور

میں جن لوگوں کو قبول اسلام کا شرف حاصل ہوا، ان کو ''سابقون اولون'' بھی کہا جاتا ہے، ان کے نام یہ ہیں :

حضرت بلال حبشی، حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ بن عبداللہ رضی اللہ عنہ، حضرت ابوسلمہ عبداللہ بن عبدالاسد رضی اللہ عنہ، حضرت ابوعبیدہ عامر بن عبداللہ بن الجراح رضی اللہ عنہ، حضرت ارقم رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ، حضرت فاطمہ بنت الخطابؓ، حضرت اُم الفضل لبابۃ الکبریٰؓ (زوجہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ)، حضرت اسماء بنت ابوبکر صدیقؓ، حضرت یاسر بن عامر رضی اللہ عنہ، حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ، حضرت سمیہ بنت مسلمؓ، حضرت عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ، حضرت خالد بن سعید بن عاص رضی اللہ عنہ، حضرت نعیم بن عبداللہ رضی اللہ عنہ، حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ، حضرت سائب بن مظعون رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن مظعون رضی اللہ عنہ، حضرت قدامہ بن مظعون رضی اللہ عنہ، حضرت سعد بن عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت مسعود بن ربیعہ رضی اللہ عنہ، حضرت خنیس بن حزامہ سہمی رضی اللہ عنہ، حضرت عیاش بن ربیعہ رضی اللہ عنہ اور مکہ کے باہر کے لوگوں میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ۔

نبوت کے بعد تیرہ سالہ مکی زندگی میں جو اہم واقعات پیش آئے، وہ اس طرح ہیں :

- چوں کہ اس دور میں کھلے طور پر اسلام کی دعوت نہیں دی جا سکتی تھی، اس لئے آپ

ﷺ نے اپنے جان نثار مسلمان حضرت ارقم رضی اللہ عنہ کے محفوظ مسکن دار ارقم کو اپنے کام کا مرکز بنایا، جو صفا کی پہاڑی پر واقع تھا، آپ یہیں سے دعوت و تبلیغ کا کام انجام دیتے اور جو لوگ مسلمان ہو جاتے ان کی تربیت فرماتے، یہاں ایمان لانے والے بیچارے شخص عمر فاروق رضی اللہ عنہ تھے۔

○ سن ۶/ نبوی میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا، ان دونوں کے مسلمان ہونے سے اسلام کو بہت قوت پہنچی۔

○ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پوری قوت اور توجہ کے ساتھ دعوت کا کام کرتے رہے، جو صحابہ ایمان لا چکے تھے، انھوں نے بھی اپنے دوستوں کو ایمان کی دعوت دی اور اس کی وجہ سے بہت سے لوگ مسلمان ہوئے، آپ ﷺ نے حج کے اجتماع اور عکاظ کے میلہ میں بھی دعوت پیش فرمائی، اس طرح پورے جزیرۃ العرب میں اسلام کی آواز پہنچ گئی۔

○ اہل مکہ نے مسلمانوں اور خاص کر اسلام قبول کرنے والے غلاموں کو بڑی تکلیفیں پہنچائیں، لیکن سب کے سب ایمان پر ثابت قدم رہے، جن غلاموں کو سخت اذیتیں پہنچائی گئیں ان میں حضرت بلال، حضرت خباب، حضرت زبیر، حضرت حمامۃ، حضرت یاسر، حضرت سمیہ اور حضرت عمار رضی اللہ عنہم خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، راہ حق میں جن کا پہلا خون ناحق بہایا گیا وہ حضرت سمیہؓ ہیں، جنھیں ابو جہل نے نہایت بے دردی سے شہید کر دیا، جو لوگ غلام نہیں تھے، ان کو بھی کچھ کم تکلیفیں نہیں دی گئیں، ان تکلیف اٹھانے والوں میں حضرت ابو بکر، حضرت عثمان، حضرت زبیر، حضرت طلحہ، حضرت عبد الرحمٰن بن عوف، حضرت ابو حذیفہ بن عتبہ اور حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

○ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائی گئیں، آپ کے مکان کی دونوں جانب ابولہب اور عقبہ بن ابی معیط کا مکان تھا، یہ دونوں پڑوسی آپ کے گھر میں گندگی اور کوڑا کرکٹ پھینک دیتے، آپ کی دونوں صاحبزادیاں حضرت رقیہؓ اور حضرت اُم کلثومؓ نبوت سے پہلے ابولہب کے دو بیٹوں عقبہ اور عتبہ سے منسوب تھیں، ابولہب نے دباؤ ڈال کر یہ نسبتیں توڑ دیں، ابولہب کی بیوی ام جمیل بھی آپ کو ہمیشہ برا بھلا کہتی رہتی، آپ کی

عداوت میں ابوجہل بن ہشام، عقبہ بن ابی معیط اور ابولہب خاص طور پر پیش پیش تھے۔

○ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوتِ دین سے روکنے کے لئے پیش کش کی گئی کہ اگر آپ ﷺ حکومت چاہتے ہیں تو اہل مکہ آپ ﷺ کو اپنا بادشاہ بنالیں گے، دولت چاہتے ہیں تو سب لوگ مل کر دولت وثروت اکٹھا کردیں گے، اور کسی حسین لڑکی سے نکاح کے خواہش مند ہیں تو ان سے نکاح کردیں گے، آپ ﷺ نے اس کے جواب میں قرآن کریم کی چند آیات پڑھیں اور انھیں دین کی حقیقت سمجھانے کی کوشش کی۔

○ جب وہ اس سے مایوس ہوگئے تو انھوں نے آپ ﷺ کے محسن اور سب سے بڑے پشت پناہ حضرت ابوطالب سے کہا، کہ یا تو آپ اپنے بھتیجے کو اس نئے دین کی دعوت سے روکیں یا پھر آپ بھی میدان میں آجائیں؟ —— حضرت ابوطالب نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: بھتیجے! بوڑھے چچا پر اتنا ہی بوجھ ڈالو جتنا وہ برداشت کرسکے، یہ سن کر آپ کی آنکھوں میں آنسو آگئے، آپ ﷺ نے سمجھا کہ شاید چچا کا سہارا بھی ختم ہونے والا ہے، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور ایک ہاتھ میں چاند رکھ دیں تب بھی میں اس دعوت سے باز نہیں آسکتا —— آپ ﷺ کے اس عزم کو دیکھ کر ابوطالب نے کہا: تم جو کچھ کرتے ہو کرتے رہو، میرے جیتے جی کوئی تم کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

مکہ والوں کی اذیت رسانی کو دیکھتے ہوئے نبوت کے پانچویں سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو ہجرت حبشہ کی اجازت دیدی، چنانچہ رجب ۵ر نبوی، مطابق ۶۱۴ء میں ۱۱ر مرد اور ۶ عورتیں شعیبہ کی بندرگاہ سے حبش کے لئے روانہ ہوئے، ان کے نام اور ان کے قبائل کے نام اس طرح ہیں :

(۱) حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ	(بنی امیہ)
(۲) حضرت ابوحذیفہ بن عتبہ رضی اللہ عنہ	(بنی عبد شمس)
(۳) حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسد رضی اللہ عنہ	(بنی مخزوم)

(۴) حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ	(بنی عدی کے حلیف)
(۵) حضرت ابوسبرہ بن ابی رہم عامر رضی اللہ عنہ	(بنی عامر)
(۶) حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ	(بنی اسد)
(۷) حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ	(بنی زہرہ)
(۸) حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ	(بنی جمح)
(۹) حضرت ابوحاطب بن عمرو رضی اللہ عنہ	(بنی جمح)
(۱۰) حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ	(بنی عبدالدار)
(۱۱) حضرت سہیل بن بیضاء رضی اللہ عنہ	(بنی حارث)
(۱۲) حضرت رقیہؓ زوجہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ	(بنی ہاشم)
(۱۳) حضرت سہلہؓ زوجہ حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ	(بنی عامر)
(۱۴) حضرت ام سلمہؓ زوجہ حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ	(بنی مخزوم)
(۱۵) حضرت لیلیٰؓ زوجہ حضرت عامر رضی اللہ عنہ	(بنی عدی)

مہاجرین حبشہ کو کسی طرح یہ غلط خبر پہنچی کہ مکہ کے لوگ مسلمان ہو چکے ہیں، چنانچہ کچھ لوگ واپس آ گئے، لیکن مکہ میں تو مسلمانوں کے خلاف جور وستم اپنے شباب پر پہنچ چکا تھا، اس لئے نبوت کے چھٹے سال کے اوائل میں دوبارہ مسلمانوں کا وفد حبشہ کی طرف ہجرت کر گیا، اس طرح حبشہ میں تراسی مرد اور اٹھارہ عورتیں جمع ہو گئے، انھیں جانے والوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ بھی تھے، اہل مکہ نے پہلے تو ہجرت کرنے والوں کا تعاقب کیا اور روکنے کی کوشش کی، لیکن جب اس میں کامیابی نہ ہو سکی تو حبشہ کو تحائف لے کر اپنا نمائندہ بھیجا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے ساتھ شاہ حبش کے نام ایک خصوصی مکتوب روانہ فرمایا تھا، جس میں مہاجرین کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین کی گئی تھی، اہل مکہ کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف جو نمائندے گئے تھے، وہ تھے عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ربیعہ، ان نمائندوں نے پہلے تو شاہ حبش اصحمہ نجاشی کو تحفہ پیش کیا اور دوسرے مذہبی پیشواؤں

کو تحائف دے کر ہموار کیا، پھر بادشاہ کے سامنے اپنی درخواست پیش کی: کہ یہ ہمارے بھاگے ہوئے غلام ہیں، انھیں واپس کر دیا جائے، بادشاہ نے مسلمانوں سے صفائی طلب کی مسلمانوں نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو اپنا ترجمان بنایا، انھوں نے نہایت برجستہ، مؤثر اور حقیقت پسندانہ خطاب کیا اور سورۂ مریم کا ابتدائی حصہ سنایا، بادشاہ ان کے خطاب سے بہت متأثر ہوا اور مسلمانوں کو اپنے ملک میں امان دے دی۔

قریش کے نمائندوں کو یہ بات بہت گراں گذری، چنانچہ دوسرے دن انھوں نے ایک نیا نکتہ اٹھایا کہ مسلمان لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ایسی بات کہتے ہیں جو آپ کے لئے بالکل قابل قبول نہیں، مسلمانوں کو دوبارہ طلب کیا گیا، یہ بڑا نازک موقع تھا، تمام مسلمانوں نے طے کیا کہ اسلام کا جو عقیدہ ہے اس کو بے کم و کاست پیش کیا جائے، چنانچہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ہمارا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ اللہ کے بندے اور رسول ہیں، وہ اس کی طرف سے ایک روح اور کلمہ ہیں، جسے اللہ نے کنواری مریم پر القاء کیا تھا'' نجاشی نے کہا کہ تم نے جو کہا وہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں صحیح عقیدہ ہے۔

حبشہ میں اہل مکہ کی مہم ناکام ہونے کے بعد قریش کا ایک اور وفد حضرت ابوطالب کی خدمت میں حاضر ہوا اور ایک خوبصورت قریشی نوجوان عمارہ بن ولید بن مغیرہ کو ساتھ لایا اور پیش کش کی کہ اس خوبصورت نوجوان کو قبول کرلیں اور اس کے بدلہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے حوالہ کر دیں، حضرت ابوطالب نے اس کو قبول نہیں کیا اور فرمایا: یہ بات تو خوب رہی کہ میں تمہارے بچے کی پرورش کروں اور اپنے لڑکے کو قتل کے لئے حوالہ کر دوں، —— اس طرح آپ نے اس نامعقول پیشکش کو نامنظور فرمادیا۔

نبوت کے ساتویں سال کا ایک اہم ترین واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابوطالب کی طرف سے حضور صلی اللہ کی پشت پناہی کے پس منظر میں بنوہاشم، بنومطلب اور بنوعبدمناف کا بائیکاٹ کر دیا گیا، اس بائیکاٹ میں جو دفعات لکھی گئیں، وہ یہ تھیں: ''ان لوگوں سے کوئی خرید

وفروخت نہ کی جائے ، نہ انھیں لڑکیاں دی جائیں اور نہ ان سے لڑکیاں لی جائیں ، ان سے گفتگو نہ کی جائے ، کوئی حمایتی خوراک پہنچائے تو پہنچنے نہ دیا جائے ، اور انھیں گلیوں اور بازاروں میں گھومنے پھرنے نہ دیا جائے ، یہ بائیکاٹ اس وقت تک رکھا جائے جب تک بنو ہاشم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حوالہ نہ کردیں'' —— نیز انھیں واجب التعمیل بنانے کے لئے بیت اللہ کی چھت سے لٹکا دیا گیا، یکم محرم سن ۷ نبوی میں یہ معاہدہ لکھا گیا، حضرت ابوطالب بنو ہاشم اور بنو مطلب کو ساتھ لے کر شعبِ ابی طالب نامی گھاٹی میں مقیم ہوگئے ، بنو ہاشم میں ابولہب حضرت ابوطالب کے ساتھ نہیں آیا اور وہ دشمنان رسول کے ہی خیمہ میں رہا ، نبوت کے نویں سال کے اختتام پر یہ بائیکاٹ ختم ہوا، اس بائیکاٹ کو ختم کرنے میں ہشام بن عمرو بن حارث ، زبیر بن ابی امیہ، مطعم بن عدی بن نوفل ، ابوالبختری بن ہشام اور زمعہ بن اسود پیش پیش تھے، جب ان سرداران نے معاہدہ نامہ پھاڑنے کے لئے نکالا تو پورا معاہدہ نامہ دیمک خوردہ تھا، صرف اللہ تعالیٰ کا مبارک نام محفوظ تھا۔

نبوت کے ۱۰/ ویں سال آپ ﷺ کے ساتھ دو بڑے حادثات پیش آئے ، ایک یہ کہ ۱۱ رمضان ۱۰ نبوی میں آپ ﷺ کی غمگسار رفیق حیات ام المومنین حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہوگیا، دوسرے آپ ﷺ کے چچا حضرت ابوطالب بھی داغ فراق دے گئے، اہل مکہ کی ایذا رسانیوں کے مقابلہ میں ظاہری طور پر آپ ﷺ کو سہارا دینے والے اور دلداری کرنے والے یہی دونوں تھے، اس لئے اس واقعہ سے آپ ﷺ کو بڑا صدمہ ہوا اور آپ ﷺ نے اس سال کو ''عام الحزن'' (غموں کا سال) قرار دیا۔

سن ۱۰/ نبوی ہی میں آپ ﷺ نے اہل مکہ کی بے رُخی دیکھتے ہوئے طائف کا سفر فرمایا، کہ شاید وہاں کے لوگ اسلام قبول کرلیں ، لیکن اہل طائف کا سلوک اہل مکہ سے بھی بدتر ثابت ہوا، انھوں نے آپ ﷺ کے ساتھ بہت بدسلوکی کا معاملہ کیا، اس طرح آپ ﷺ پر پتھر برسائے کہ جسم لہولہان ہوگیا، اور نعلین مبارکین میں خون کی تہیں جم گئیں، اس سفر میں آپ

ﷺ کے ساتھ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ بھی تھے، یہ سفر ۲۷/شوال ۱۰ نبوی میں ہوا تھا۔

رجب سن ۱۰/ نبوی میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو معراج سے سرفراز فرمایا، حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ ﷺ کو اپنے ساتھ لے کر مکہ سے بیت المقدس گئے، بیت المقدس میں آپ ﷺ نے انبیاء کی امامت فرمائی، پھر وہاں سے آپ ﷺ کو آسمان پر لے گئے، ساتوں آسمان کی سیر کرائی، حضرت آدم علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت ادریس علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام وغیرہ سے ملاقاتیں ہوئیں اور جنت و دوزخ کے بھی مناظر دکھائے گئے، اسی موقعہ سے آپ ﷺ پر پچاس نمازیں فرض کی گئیں، جو بار بار کی درخواست پر پانچ باقی رہ گئیں، اسی موقعہ پر سورۂ بقرہ کی آخری دو آیت اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر القاء فرمائی، ابوجہل اور اہل مکہ نے اس واقعہ پر خوب استہزاء کیا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خوب خوب تصدیق فرمائی، اور آخر ''صدیق'' قرار پائے۔

حج کے موقع سے عرب کے کونے کونے سے لوگ مکہ و منیٰ پہنچتے تھے اور آپ ﷺ ہمیشہ ان کو دعوت حق پیش فرماتے تھے، اکثر قبیلوں کا جواب انکار کا ہوتا تھا، سن ۱۰/ نبوی کے حج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات مدینہ کے وفد سے ہوئی، آپ ﷺ نے ان پر دعوت اسلام پیش کی، اور چار مردوں اور دو عورتوں نے اسلام قبول کیا، آئندہ سال حج کے موقع سے دوبارہ اہل مدینہ سے ملاقات ہوئی، یہ بارہ آدمی تھے، جن میں سے پانچ گذشتہ سال کے اہل ایمان تھے، اور سن ۱۳ نبوی میں ۷۳ مرد اور دو عورت مسلمان ہوئے، آپ ﷺ نے ان مسلمانوں کے لئے بارہ نقباء (سردار) بھی منتخب فرمائے، جن میں نو کا تعلق بنو خزرج تھا اور تین کا بنی اوس سے، اس موقعہ سے اہل مدینہ سے بات طے پا گئی کہ مسلمان اگر ہجرت کر کے مدینہ جائیں گے تو مدینہ کے لوگ پناہ دیں گے، پھر جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت ملی تو آپ ﷺ نے مسلمانوں کو ہجرت کرنے کا حکم دیا، آہستہ آہستہ لوگ مدینہ منتقل ہونے لگے، یہاں تک کہ صرف چند مسلمان مکہ میں باقی رہ گئے، آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے حکم کے انتظار میں تھے، بالآخر آپ ﷺ کو بھی ہجرت کا حکم ملا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رفاقت طے پائی، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ

نے دو اونٹنیاں خاص اسی مقصد کے لئے خرید رکھی تھیں اور مدینہ کا راستہ بتانے کے لئے ایک رہنما بھی طے کرلیا تھا، ایسے راستہ بتانے والے کو "دلیل" کہا جاتا تھا۔

ادھر جب اہل مکہ نے دیکھا کہ مسلمان مدینہ میں جمع ہو گئے ہیں اور انھیں خیال ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی چلے جائیں گے تو انھوں نے دارالندوہ میں مشورہ کیا اور مشورہ میں یہ بات طے پائی کہ ہر قبیلہ سے ایک ایک نوجوان تلوار لے کر آپ ﷺ کے دولت خانہ کا محاصرہ کرلے، اور سب لوگ مل کر یکبارگی آپ ﷺ پر اس وقت حملہ کریں جب آپ ﷺ صبح کو باہر آئیں، تمام قبائل کی شرکت کی وجہ سے بنو ہاشم سبھوں سے بدلہ نہیں لے سکیں گے، اسی رائے پر اتفاق ہوا، اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اس کی خبر دے دی، آپ ﷺ نے لوگوں کی امانتیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حوالہ کیں، اپنے بستر پر ان کو سلا دیا اور ایک مشت خاک پھینکتے ہوئے گھر سے باہر نکل آئے، دشمنوں کو کوئی خبر بھی نہ ہو سکی، آپ ﷺ سیدھے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر آئے اور ۲۷/ صفر ۱۳ نبوی بروز جمعرات ان کو ساتھ لے کر کوہ ثور کے اونچے غار کی پناہ لی، تین دنوں وہیں مقیم رہے، پھر یکم ربیع الاول ۱۳ نبوی بروز اتوار شب کو مدینہ کی طرف نکلے، یہ قافلہ چار آدمیوں — آپ ﷺ، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت ابوبکر کے غلام اور راستہ بتانے والے والا شخص عبداللہ بن اریقط — پر مشتمل تھا، مورخہ ۸/ ربیع الاول ۱۳ نبوی مطابق ۲۰/ ستمبر ۶۲۲ء روز پیر کو قباء پہنچے، قباء میں آپ ﷺ کا قیام چودہ دنوں تک رہا اور یہیں آپ ﷺ نے مسجد قباء کی بنیاد رکھی، قباء میں انصار کے قبائل نے آپ ﷺ کا نہایت گرم جوش استقبال کیا، آپ ﷺ نے جمعہ کے دن یہیں نماز جمعہ ادا فرمائی، یہ اسلامی تاریخ کا پہلا جمعہ تھا، پھر اسی دن قباء سے مدینہ تشریف لائے، مدینہ میں انصار نے بڑی ہی محبت کے ساتھ آپ ﷺ کا گرم جوش خیر مقدم کیا، ہر شخص چاہتا تھا کہ آپ ﷺ کا قیام اس کے گھر پر ہو، آخر آپ ﷺ کی اونٹنی حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مکان پر رکی اور آپ ﷺ انھیں کے مہمان ہوئے، اس طرح اسلام کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

مدنی زندگی

مدینہ آنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر دو اہم کام تھے، ایک مسلمانوں کی تربیت، دوسرے پورے جزیرۃ العرب اور اس سے باہر اسلام کی دعوت پہنچانا، اس مقصد کے لئے آپ ﷺ نے مدینہ میں امن وامان اور بھائی چارہ کا ماحول پیدا کرنے کی کوشش فرمائی اور اس سلسلہ میں دو اہم قدم اٹھائے، ایک تو مسلمان، یہودیوں اور مدینہ کے دوسرے غیر مسلموں کے درمیان ایک تحریری معاہدہ کرایا اور اس پر تمام قبائل کے نمائندوں کے دستخط لئے، اس معاہدہ کا حاصل یہ تھا کہ ہم سب باہم امن کے ساتھ رہیں گے، اپنے اپنے مذہب پر عمل کرتے ہوئے دوسرے کے معاملہ میں دخل دینے سے گریز کریں گے، اور اگر کوئی دشمن مدینہ پر حملہ آور ہو تو ہم سب مل کر مدافعت کریں گے، یہ معاہدہ ہجرت کے پانچویں ماہ ہوا۔

دوسرے آپ ﷺ نے مکہ سے آنے والے مہاجرین اور مدینہ کے رہنے والے انصار کے درمیان 'مواخات' یعنی بھائی چارہ قائم فرمایا، اس طرح کہ ایک انصاری اور ایک مہاجر کو بھائی بھائی بنا دیا گیا اور ان کے تمام تعلقات بھائی بھائی کی طرح رکھے گئے، اس سے جہاں بے سہارا مہاجرین کے لئے ٹھکانہ کا نظم ہوا، وہیں محبت واخوت کا ماحول پیدا ہو گیا۔

مدینہ میں آپ ﷺ نے آنے کے ساتھ ہی مسجد کی فکر کی اور دو یتیم بچے سہل اور حضرت سہیل کی زمین خرید کر (جس کی قیمت دس دینار طے ہوئی) خود اپنے رفقاء کے ساتھ مسجد کی تعمیر فرمائی، اس مسجد کا طول وعرض مشہور محدث امام زہریؒ کے بقول تقریباً سوسو ہاتھ تھا اور سطح زمین سے مسجد کی اونچائی اٹھارہ انچ رکھی گئی تھی۔

مدینہ میں مسلمانوں کا اس طرح سکون سے رہنا اور اپنے دین کی تبلیغ کرنا اہل مکہ کو

گوارہ نہ ہوا، اس لئے انھوں نے مسلمانوں کے خلاف جنگی مہمات شروع کردیں، چنانچہ بارہ صفر سن دو ہجری میں مسلمانوں کو جہاد اور ظالموں کے خلاف تلوار اٹھانے اور اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے مسلح جدوجہد کی اجازت ملی اور جہاد کے سلسلہ کی اجازت میں آیت نازل ہوئی، یہ آیت سورہ حج کی آیت نمبر: ۳۹ ہے، بعض روایات میں پہلی آیت جہاد کی حیثیت سے سورہ بقرہ کی آیت نمبر: ۱۹۰ کا ذکر آیا ہے، مشرکین مکہ کی طرف سے مسلمانوں پر پہلا باضابطہ حملہ رمضان ۲ھ میں ہوا، مسلمانوں کو اطلاع ہوئی، وہ بھی آگے بڑھے اور مدینہ سے ۸۰ میل فاصلہ پر بدر کے میدان میں دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا، مشرکین مکہ کی تعداد ایک ہزار تھی اور مسلمانوں کی تعداد ۳۱۳ تھی، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح سے ہمکنار کیا، ۱۴ مسلمان شہید ہوئے، ۷۰ مشرکین مکہ مارے گئے اور ۷۰ قید کئے گئے، آپ ﷺ نے ان قیدیوں کے ساتھ بہت ہی حسن سلوک فرمایا، ان میں جو پڑھنا لکھنا جانتے تھے، ان کے لئے دس مسلمان بچوں کو پڑھانا لکھانا فدیہ قرار دیا گیا اور بقیہ قیدیوں سے مالی فدیہ وصول کیا گیا، نیز انھیں بہت اعزاز واکرام کے ساتھ نئے کپڑے پہنا کر رخصت کیا گیا۔

مدنی زندگی کے ابتدائی واقعات میں ایک یہ ہے کہ مدینہ سے مکہ اور بیت المقدس دو مخالف سمتوں میں واقع تھے، اس لئے نماز میں کسی ایک ہی طرف رُخ کیا جاسکتا تھا، چنانچہ ابتداءً آپ ﷺ نے بیت المقدس کو قبلہ بنایا، پھر سولہ مہینوں کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے کعبۃ اللہ قبلہ نماز متعین ہوا، اسی سال غزوہ بدر کے بعد حضرت فاطمۃ الزہراؓ کا نکاح سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہوا، یہ واقعہ ذی الحجہ، محرم یا صفر کا ہے۔

بدر سے فارغ ہوکر آئے ہی تھے کہ آپ کو یہودیوں کے ایک قبیلہ بنی قینقاع کی بد عہدی کا سامنا کرنا پڑا، آپ ﷺ جنگ سے بچنا چاہ رہے تھے، لیکن ان کے معاندانہ رویہ سے مجبوراً جنگ کی نوبت آئی اور بنی قینقاع نے ہتھیار ڈال دیا، پھر انھیں جلاوطن کر دیا گیا۔

بدر کی شکست فاش نے اہل مکہ کو جذبۂ انتقام سے لبریز کر دیا، اور آئندہ سال پھر اہل مکہ زیادہ تیاریوں کے ساتھ مدینہ پر حملہ آور ہوئے، مسلمانوں نے مدینہ سے باہر نکل کر 'اُحد' کے دامن میں دشمنوں سے مقابلہ کیا، اس جنگ میں مشرکین مکہ کی تعداد تین ہزار تھی اور مسلمانوں سات سو کے قریب تھے، ابتداء میں مسلمان غالب تھے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فوجی دستہ جہاں مقرر کیا تھا اور اس پر جمے رہنے کی ہدایت کی تھی، مسلمانوں کو غالب آتے ہوئے دیکھ کر وہ وہاں سے ہٹ گیا، اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے —— جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے —— اس سمت سے حملہ کر دیا، اس طرح مسلمانوں کی فوج دونوں طرف سے گھر گئی، ٧٠ صحابہ رضی اللہ عنہم شہید ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بھی ان شہیدوں میں تھے، ان کی نعش مبارک کا دشمنوں نے مثلہ بھی کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دندانِ مبارک بھی شہید ہوئے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم خون سے لہولہان ہو گئے، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی خبر مشہور ہو گئی، یہ معرکہ شوال تین ہجری میں ہوا، تاریخ میں اختلاف ہے، لیکن زیادہ تر لوگوں کی رائے ہے کہ یہ سات شوال ہفتہ کا دن تھا اور شمسی لحاظ سے ۲۳/مارچ ۶۲۵ء کی تاریخ تھی۔

ہجرت کے چوتھے سال دو اہم واقعات پیش آئے، ایک یہ کہ نجد کے قبیلہ کلاب کا سردار ابو براء عامر بن مالک مدینہ حاضر ہوا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خواہش کی کہ آپ اپنے رفقاء کی ایک جماعت میرے ساتھ بھیجئے، اُمید ہے کہ نجد میں بسنے والے قبائل مسلمان ہو جائیں گے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل صفہ میں سے ستر قراء یعنی قرآن مجید کے عالموں کو ان کے ساتھ روانہ کر دیا اور حضرت منذر بن عمرو رضی اللہ عنہ کو ان کا امیر بنایا، لیکن قبیلہ کے لوگوں نے بدعہدی کی اور یہ ستر صحابہ شہید کر دیئے گئے، یہ واقعہ چوں کہ بیئر معونہ کے پاس صفر سن چار ہجری میں پیش آیا، اس لئے یہ اسی نام سے مشہور ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کے بعد چالیس دن تک نماز فجر میں ان کے خلاف قنوت نازلہ پڑھی، آخر یہ پوری بستی طاعون کی وباء میں مبتلا ہو کر ہلاک ہو گئی۔

یہودیوں کا ایک اہم قبیلہ بنو نضیر تھا، جو مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ میں شامل تھا، اس

نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کی ایک گھناؤنی سازش رچی جو کھل گئی اور کامیاب نہ ہوسکی، بالآخر مسلمانوں کو اس کے سوا چارہ نہیں رہا کہ کم سے کم انھیں شہر بدر کردیا جائے تاکہ مسلمان اندرون خانہ کی سازش سے محفوظ رہیں، یہ واقعہ ربیع الاول سن چار ہجری مطابق اگست ۶۲۵ء میں پیش آیا۔

پھر ہجرت کے پانچویں سال اہل مکہ نے بنو غطفان اور بعض دوسرے قبائل کو ساتھ لے کر دس ہزار کے لشکر جرار کے ساتھ مدینہ کی چھوٹی سی بستی پر حملہ کردیا، یہودی قبائل جو مسلسل مسلمانوں کے ساتھ خفیہ طور پر غداری کرر ہے تھے، اوران کو نقصان پہنچانے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھتے تھے، وہ بھی اس مشکل میں وقت میں اہل مکہ کے ساتھ ہوگئے، یہ مسلمانوں کے لئے بڑا نازک وقت تھا، چنانچہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورہ پر کوہ سلع کے دامن میں طویل خندق کھدوائی گئی، اس خندق کی لمبائی پانچ ہزار گز اور چوڑائی نو گز تھی، مسلمانوں کے سامنے خندق تھی اور پیچھے پہاڑ تھے، بیس روز تک اہل مکہ کی طرف سے محاصرہ جاری رہا، بالآخر اللہ کی مدد شامل حال ہوئی، ایسا طوفان آیا کہ ان کے خیمے اکھڑ گئے اور آپس میں اختلاف بھی پیدا ہوگیا، بالآخر ناکام و نامراد دشمنوں کی فوج واپس ہوئی، اس جنگ میں مشرکین کی فوج دس ہزار سے بھی زیادہ تھی، اہل ایمان کی کل تعداد تین ہزار تھی، آٹھ مشرکین مارے گئے اور چھ مسلمان شہید ہوئے، مسلمانوں کا محاصرہ تقریباً ایک ماہ تک جاری رہا، مشہور قول کے مطابق شوال ۵ ہجری میں غزوۂ خندق ہوئی۔

یہود کی اس بدعہدی کی وجہ سے جس سے مسلمان بار بار دوچار ہوچکے تھے، اوراس بار تو بدعہدی انتہا کو پہنچ گئی تھی، مسلمانوں نے جوابی کارروائی کی اور یہودیوں کے قبیلہ بنو قریظہ کے قلعہ کا محاصرہ کرلیا اور پھر یہودیوں کی حکم بنائی ہوئی شخصیت حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے فیصلہ پر یہ جنگ ختم ہوئی، اس میں چار سو سے زیادہ یہودی مارے گئے۔

○ ہجرت کے چھٹے سال آپ ﷺ نے عمرہ کے لئے چودہ سو مسلمانوں کے ساتھ مکہ کا رُخ کیا، مکہ میں قدیم روایت کے مطابق عمرہ سے کسی کو روکا نہیں جاتا تھا، اس لئے مسلمان احرام باندھ کر مدینہ سے نکلے، تاکہ غلط فہمی پیدا نہ ہو، پھر بھی اہل مکہ کی طرف سے رکاوٹ پیدا کردی گئی، آپ ﷺ چوں کہ امن چاہتے تھے، اس لئے آپ ﷺ نے اہل مکہ کی شرطوں پر معاہدہ کرلیا، شرطیں یہ تھیں :

(۱) مسلمان اس سال واپس چلے جائیں۔

(۲) آئندہ سال صرف تین دنوں کے لئے آئیں اور عمرہ کرلیں، اس موقع پر ان کے پاس تلوار کے علاوہ کوئی اور ہتھیار نہ ہو۔

(۳) مکہ سے کوئی شخص مسلمان ہوکر مدینہ جائے تو اسے واپس کردیں، اور مدینہ سے کوئی شخص مرتد ہوکر مکہ آئے تو اسے واپس نہیں کیا جائے گا۔

(۴) دس سال کے لئے دونوں فریق میں ناجنگ معاہدہ رہے گا، اور ایک دوسرے پر حملہ کرنے سے گریز کریں گے، نیز جو قبیلہ جس کا حلیف ہو، وہ اس معاہدہ میں شریک سمجھا جائے گا۔

چنانچہ بنو بکر اہل مکہ کے حلیف ہوئے اور بنو خزاعہ مسلمانوں کے، چوں کہ یہ صلح حدیبیہ نامی مقام پر ہوئی تھی، اس لئے اس کو ''صلح حدیبیہ'' کہا جاتا ہے، حدیبیہ میں آپ ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ انیس دن قیام فرمایا، اس صلح کو قرآن مجید میں ''فتح مبین'' سے تعبیر کیا گیا ہے (فتح:۱)؛ کیوں کہ اس صلح نے اہل مکہ اور عرب کے دوسرے قبائل میں دعوت اسلام کا راستہ کھول دیا، یہی وجہ ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع سے آپ ﷺ کے ساتھ چودہ صحابہ رضی اللہ عنہم تھے اور صرف دو سال بعد فتح مکہ کے موقع سے دس ہزار صحابہ رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کے ساتھ تھے۔

صلح حدیبیہ کے بعد آپ ﷺ نے بادشاہوں اور مختلف قبائل کے سرداروں کے نام دعوتِ اسلام کے خطوط بھیجے، یہ خطوط نہ صرف عرب کے قرب و جوار کے حکمرانوں قیصر و کسریٰ،

نجاشی وغیرہ تک پہنچے بلکہ شاہ چین تک بھی آپ نے مکتوبِ دعوت بھیجا، اوران کوششوں سے جزیرۃ العرب کے بہت سے قبائل نے اسلام قبول کیا، خود حبش کے بادشاہ نجاشی بھی مشرف بہ اسلام ہوئے۔

○ اس سلسلہ میں چھ خطوط کا عام طور پر سیرت کی کتابوں میں ذکر آیا ہے :

(۱) اصحمہ نجاشی (شاہ حبش) سفیر: حضرت عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ

(۲) ہرقل (قیصر روم) سفیر: حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبی رضی اللہ عنہ

(۳) خسرو پرویز (کسریٰ عجم) سفیر: حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ

(۴) جریج بن متی مقوقس (عزیز مصر) سفیر: حضرت حاطب بن بلتعہ رضی اللہ عنہ

(۵) حارث بن ابی شمر غسانی (شاہ دمشق) سفیر: حضرت شجاع بن وہب اسدی رضی اللہ عنہ

(۶) ہوزہ بن علی حنفی (والیٔ یمامہ) سفیر: حضرت سلیط بن عمرو عامری رضی اللہ عنہ

یہ خطوط آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سن چھ اور سات ہجری میں روانہ کئے۔

○ مدینہ منورہ سے تقریباً چھیانوے میل کے فاصلے پر خیبر واقع تھا، اس شہر میں بہت سے قلعے زمانہ قدیم سے بنے ہوئے تھے، جس میں یہودیوں کے مختلف خاندان آباد تھے، جو یہودی مدینہ سے جلاوطن کئے گئے، ان میں سے بھی بہت سارے لوگ یہیں آکر مقیم ہوگئے، وہ مدینہ کے شمال مشرق میں واقع مشہور جنگجو قبیلہ 'بنو غطفان' کے ساتھ مل کر مدینہ پر حملہ کے لئے کوشاں تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ملی تو دوبار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صورتِ حال کی تحقیق کے لئے نمائندے بھیجے، معلوم ہوا کہ خیبر کے یہود بنو غطفان اور دوسرے قبائل کے ساتھ مل کر بڑے حملہ کی تیاری کررہے ہیں، چنانچہ حدیبیہ سے واپسی پر محرم سن سات ہجری میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چودہ سو صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ خیبر کی طرف کوچ کیا، یہودی قلعہ بند ہوگئے، چنانچہ ایک ماہ ان کا محاصرہ جاری رہا، اس جنگ میں ترانوے یہودی ہلاک ہوئے اور پندرہ مسلمانوں کی شہادت ہوئی، آخر اس بات پر صلح ہوئی کہ خیبر یہودیوں کے قبضے میں چھوڑ دیا جائے گا اور وہ بطور خراج خیبر کے پیداوار کا نصف حصہ مدینہ کو ادا کیا کریں گے۔

حدیبیہ میں طے پائے معاہدے کے مطابق ذوقعدہ سن سات ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو ہزار صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ عمرہ کے لئے روانہ ہوئے اور معاہدہ کی پوری پاسداری کرتے ہوئے تین شب و روز کے بعد واپس ہوئے ، اسی موقع سے اُم المؤمنین حضرت میمونہؓ بنت حارث سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح ہوا۔

ہجرت کے آٹھویں سال ایک اہم واقعہ غزوہ موتہ کا پیش آیا ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر حضرت حارث بن عمیر ازدی روم کے سرحدی علاقہ 'بلقاء' سے گذر رہے تھے کہ قیصر روم کے گورنر شرحبیل عمرو غسانی نے انھیں گرفتار کر کے شہید کر دیا، یہ بات واضح طور پر سفارتی آداب کے خلاف تھی ،اس لئے آپ نے مسلمانوں کو شام کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا، بادشاہ روم ہرقل نے ایک لاکھ کی فوج مقابلہ کے لئے بھیجی ،ان کے علاوہ مختلف عرب قبائل کے مزید ایک لاکھ جنگ جواُن کے ساتھ ہو گئے ،مسلمانوں کی فوج صرف تین ہزار نفوس پر مشتمل تھی ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بالترتیب حضرت زید بن حارثہ، حضرت جعفر بن ابی طالب اور حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم کو کمانڈر مقرر کیا کہ ان میں سے ایک شہید ہو جائے تو دوسرا اپنے ہاتھ میں کمان لے لے ، اگر یہ تینوں شہید ہو جائیں تو جس پر لوگ متفق ہو جائیں وہ مسلمانوں کا سپہ سالار ہوگا ، چنانچہ یہ تینوں شہید ہو گئے اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے کمان سنبھالی اور وہ بڑی حکمت کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو باہر نکالنے میں کامیاب ہو گئے ،اسی موقع سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں ''سیف اللہ'' کا خطاب دیا —— اس جنگ میں بارہ مسلمان شہید ہوئے اور محض تین ہزار لشکر کے ذریعہ دو لاکھ کی فوج کا مقابلہ کرنے کی وجہ سے رومیوں کے درمیان مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی۔

ادھر ایسا ہوا کہ بنو بکر اور بنو خزاعہ کی پرانی خصومت جاگ اٹھی اور دونوں کے درمیان جم کر لڑائی ہوئی ، اس لڑائی میں اہل مکہ معاہدہ کے مطابق غیر جانب دار نہیں رہے ، بلکہ انھوں

نے کھل کر بنو بکر کے ساتھ مل کر اور عین حرم میں بنو خزاعہ کے لوگوں پر حملے کئے اور بعض کو قتل کر دیا، بنو خزاعہ آپ ﷺ سے رُجوع ہوئے، آپ ﷺ جنگ سے بچنا چاہتے تھے، اس لئے آپ ﷺ نے مکہ اپنا سفیر بھیجا اور تین باتوں کی پیش کش کی: اہل مکہ یا تو بنو خزاعہ کے مقتولین کی دیت ادا کر دیں، یا بنو بکر سے اپنا تعلق توڑ لیں، یا پھر صلح حدیبیہ کی تنسیخ کا اعلان کریں، اہل مکہ نے کہا: ہمیں پہلی دو باتیں منظور نہیں، صرف تیسری صورت منظور ہے، اس طرح بنو خزاعہ کی حمایت میں مسلمانوں کو مکہ پر فوج کشی کرنی پڑی، چنانچہ ۸ھ میں دس ہزار صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ آپ ﷺ مکہ کی طرف بڑھے، آپ ﷺ جنگ سے بچنا چاہتے تھے، اس لئے ہر طرح کوشش کی کہ قتل وقتال کی نوبت نہ آئے، بالآخر پر امن طریقہ پر مکہ فتح ہو گیا، کہیں کہیں اہل مکہ نے مزاحمت کی اور اس میں چند مشرکین مارے گئے، جن کی تعداد اکثر مؤرخین کے بقول ۱۳ ہے، نیز دو مسلمان بھی شہید ہوئے، اگر آپ ﷺ چاہتے تو اپنے تمام دشمنوں سے انتقام لے سکتے تھے، اور آپ ﷺ انتقام لینے میں حق بہ جانب بھی ہوتے، لیکن آپ ﷺ نے یک قلم انھیں معاف کر دیا، اور فرمایا کہ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو معاف کیا تھا، اسی طرح میں بھی تمہیں معاف کرتا ہوں، اب پھر کعبۃ اللہ میں ایک خدا کی عبادت ہونے لگی، جس کے لئے اس گھر کی تعمیر ہوئی تھی، ۲۰ رمضان المبارک آٹھ ہجری مطابق ۱۱ جنوری ۶۳۰ء بروز جمعہ کو مکہ میں داخل ہوئے، مورخہ ۱۰ رمضان ۸ھ کو آپ ﷺ مکہ کے لئے نکلے تھے اور حنین و بنو ثقیف کی مہم سے فارغ ہو کر ذوقعدہ میں آپ ﷺ مدینہ واپس ہو گئے۔

فتح مکہ کے بعد غزوۂ حنین اور غزوۂ طائف کا واقعہ پیش آیا، حُنَین مقام کا نام ہے، اور یہاں قبیلہ بنو ہوازن کے لوگ آباد تھے، اس لئے اس کو 'غزوۂ ہوازن' بھی کہا جاتا ہے، فتح مکہ کے انیس دن بعد چھ شوال سن آٹھ ہجری روز ہفتہ کو مسلمانوں کی فوج نے حنین کی طرف کوچ کیا، اس جنگ میں ابتداء مسلمانوں کو ہزیمت ہوئی، لیکن پھر وہ سنبھل گئے اور بالآخر مسلمان فتح یاب ہوئے، جنگ میں دشمن کے ستر آدمی مارے گئے اور مسلمانوں میں چار شخص شہید ہوئے، بعض مؤرخین نے شہداء کی تعداد اس سے زیادہ بھی لکھی ہے۔

فتح مکہ کے بعد آپ ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کی تربیت اور احکام شریعت کی تعلیم نیز دعوتِ دین میں یکسو ہو گئے، عبادات، معاملات، عائلی زندگی، مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات وغیرہ سے متعلق احکام وقوانین، مدینہ ہی کی دس سالہ زندگی میں نازل ہوئے۔

رجب سن نو ہجری میں غزوہ تبوک کا واقعہ پیش آیا، اس غزوہ کا سبب یہ ہوا کہ شام کی رومی حکومت اور بعض عرب قبائل خاص کر عیسائیوں کی طرف سے مدینہ کے خلاف فوجی تیاری اور جنگی عزائم کی مسلسل اطلاع آرہی تھی، اس وقت کے حالات کے تحت یہ بات ضروری محسوس ہوئی کہ مسلمان خود آگے بڑھ کر اس صورت حال کو دیکھیں اور ضرورت ہو تو آگے بڑھ کر دشمن کی تیاری کو تباہ کر دیں، چنانچہ آپ ﷺ نے اس مہم کی تیاری کا اعلان فرمایا، رجب سن ۹ ہجری کی ایک جمعرات کو ایک بڑی فوج لے کر آپ ﷺ نکلے، جس کی تعداد تیس سے ستر ہزار بتلائی گئی ہے، فوج میں دس ہزار گھوڑ سوار اور بارہ ہزار شتر سوار بھی تھے، بالآخر مدینہ سے چل کر آپ ﷺ تبوک میں مقیم ہوئے جو مدینہ سے کم وبیش سات سو کیلو میٹر پر واقع ہے، یہاں آپ ﷺ کا قیام کم سے کم بیس دن رہا، کئی قبائل کے لوگوں نے خود آپ ﷺ کی اطاعت قبول کی اور بادشاہ روم ہرقل اپنے پایہ تخت حمص میں ہی مقیم رہا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رومیوں اور روم کے قریب آباد عرب نصرانیوں پر بھی مسلمانوں کی طاقت کا رعب بیٹھ گیا اور پھر انھیں مدینہ کی طرف غلط نظر سے دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

سن نو ہجری میں حج فرض ہوا، رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اپنا نمائندہ بنا کر تین سو صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ حج کے لئے روانہ فرمایا، جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کی طرف سے اعلان کیا کہ آئندہ حج میں کسی مشرک کو شامل ہونے اور بے لباس بیت اللہ کا طواف کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔

ہجرت کے نویں سال کو ''عام الوفود'' کہا جاتا ہے، یعنی اسلام کی دعوت اب عرب اور جزیرۃ العرب سے باہر جا چکی تھی اور مختلف قبائل کے وفود رضا کارانہ طور پر آپ ﷺ کی

خدمت میں حاضر ہوکر اسلام قبول کرتے تھے، اور ان کی تربیت کی جاتی تھی، اسی لئے اس کو وفود کا سال کہا جاتا ہے، سیرت کی کتابوں میں آپ ﷺ کی خدمت میں سو سے زیادہ وفود کی حاضری کا ذکر ملتا ہے۔

○ ہجرت کے دسویں سال آپ ﷺ نے حج کیا اور تمام مسلمانوں سے خواہش فرمائی کہ وہ بھی حج میں آپ کے ساتھ رہیں، یہی چوں کہ آپ ﷺ کا آخری حج تھا اور عام صحابہ رضی اللہ عنہم سے آخری ملاقات تھی، اس لئے اس کو ''حجۃ الوداع'' کہتے ہیں، حج کے موقع سے آپ نے مکہ، منیٰ اور عرفات میں کئی خطبات دیئے، یہ گویا آپ ﷺ کی طرف سے اُمت کے لئے وداعی خطاب تھا، خود عرفات کا خطبہ وہ یادگار خطبہ ہے جسے بنیادی انسانی حقوق کا چارٹ قرار دیا جاسکتا ہے، اس حج میں آپ کے ساتھ ایک لاکھ سے زیادہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے، اکثر مؤخین نے ایک لاکھ ۲۴ ہزار کی تعداد لکھی ہے، بعض حضرات نے ایک لاکھ چوالیس ہزار تک بھی لکھی ہے۔

ہجرت کے گیارہویں سال ۲۹ صفر، پیر سے آپ ﷺ کی علالت کا سلسلہ شروع ہوا، اس علالت میں کئی دنوں آپ ﷺ جماعت سے نماز نہیں ادا کرسکے، اور آپ ﷺ کے حکم سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے امامت فرمائی، ۱۲ ربیع الاول، پیر کے دن، دن چڑھتے ۶۳ سال کی عمر میں آپ ﷺ کی وفات ہوئی، آخری فقرہ جو آپ کی زبان مبارک سے نکلا، وہ تھا: ''أنت الرفیق الأعلی'' —— تجہیز و تکفین منگل کے دن ہوئی، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تلقین پر لوگوں نے تنہا تنہا آپ ﷺ پر نماز جنازہ پڑھی، چہار شنبہ کو نصف شب میں تدفین عمل میں آئی۔

ازواج واولاد

پیغمبر کی زندگی عام انسانوں کی زندگی سے مختلف ہوتی ہے، ان کا عمل نمونہ ہوتا ہے اور یہ بات ضروری ہوتی ہے کہ اس کی زندگی کا پورا ریکارڈ اُمت کے لئے محفوظ ہوجائے، اسی لئے انبیاء کو عام لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ بیویاں کو رکھنے کی اجازت دی جاتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے بھی اس خصوصی حکم کے تحت گیارہ نکاح فرمائے، ان میں بعض نکاح ان لوگوں کی قربانی کا حق ادا کرنے کے لئے تھا، جنھوں نے اپنا سب کچھ اسلام کے لئے قربان کردیا تھا، جیسے حضرت عائشہ بنت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت حفصہ بنت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، بعض نکاح آپ ﷺ نے ان خواتین کی دل داری کے لئے فرمایا، جنھوں نے اسلام کے لئے اپنا سب کچھ قربان کردیا تھا، اور وہ بے سہارا ہوگئی تھیں، جیسے حضرت اُم حبیبہ بنت ابی سفیانؓ، بعض نکاح کا مقصد اس قبیلہ کے لوگوں کو اسلام سے مانوس کرنا اور دعوتِ حق کے قریب کرنا تھا، جیسے حضرت جویریہؓ اور حضرت صفیہؓ، اسی طرح حضرت زینت بنت جحشؓ نکاح متبنّٰی کی قدیم رسم کو ختم کرنے کے لئے ہوا، کیوں کہ ان کے شوہر حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے متبنّٰی تصور کئے جاتے تھے، اور زمانہ جاہلیت میں لوگ متبنّٰی کو صلبی بیٹے کا درجہ دیتے تھے۔

بحیثیتِ مجموعی ان ازواج مطہرات کے ذریعہ دین کی نشر واشاعت میں بے حد مدد ملی، تفسیر قرآن، روایتِ حدیث، احکام فقہیہ اور بالخصوص خواتین سے متعلق مسائل بیان کرنے میں حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت اُم سلمہؓ اور حضرت میمونہؓ وغیرہ سے اُمت کو جو نفع پہنچا، وہ کسی اور سے نہیں پہنچ سکتا تھا، ازواجِ مطہرات سے نکاح کے وقت آپ ﷺ کی عمر کو دیکھنے سے انداز ہوتا ہے کہ ۵۴ سال کی عمر تک آپ ﷺ کے نکاح میں ایک ہی بیوی رہیں، حضرت خدیجہؓ اور حضرت سودہؓ، جو عمر میں بھی آپ سے بڑی تھیں، باقی نکاح ۵۴ سے ۵۹ سال کے درمیان ہوئے، دوسرے ان تمام ازواج میں صرف حضرت عائشہؓ کنواری تھیں، بقیہ خواتین بیوہ

یا مطلقہ تھیں، اگر کوئی شخص اپنی نفسانی آسودگی کے لئے زیادہ شادیاں کرے تو عام طور پر ۳۰ سال کے اندر ایسی شادیاں کی جاتی ہیں اور خصوصیت سے کنواری لڑکیوں سے شادی کرنے کو ترجیح دی جاتی ہے، اس سے ان بدقماش مغربی مصنفین کی تردید ہوتی ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعدد ازدواج کو — نعوذ باللہ — غلط معنی پہناتے ہیں۔

ذیل میں ازواج مطہرات کے نام، ان کی ولادت، وفات، سن نکاح اور حضور ﷺ کے ساتھ رفاقت کی مدت تحریر کی جاتی ہے :

نمبر شمار	اسمائے گرامی	ولادت	سن نکاح	اُم المومنین کی عمر بوقت نکاح	سن وفات	حضورؐ کی خدمت میں رہنے کی مدت	حضور ﷺ کی عمر مبارک بوقت نکاح
۱-	حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ	۵۵۵ء	۱۵سال قبل نبوۃ	۴۰سال	نبوۃ ۱۰ء	۲۵سال	۲۵سال
۲-	حضرت سودہؓ	۵۷۰ء	۱۰ نبوی	۵۰سال	۱۹ھ	۱۴سال	۵۰سال
۳-	حضرت عائشہ صدیقہؓ	۶۱۴ء	شوال ۱۰ نبوی	۹سال	۵۷ھ	۹سال	۵۴سال
۴-	حضرت حفصہؓ	۶۰۵ء	شعبان ۴ھ	۲۲سال	۵۱ھ	۱/۲ ۷سال	۵۵سال
۵-	حضرت زینب بنت خزیمہؓ	۵۹۵ء	صفر ۴ھ	۳۰سال	۴ھ	۳ماہ	۵۵سال
۶-	حضرت اُم سلمہؓ	۶۰۲ء	۴ھ	۲۶سال	۵۹ھ	۷سال	۵۶سال
۷-	حضرت زینب بنت جحشؓ	۵۹۲ء	۵ھ	۲۶سال	۲۰ھ	۶سال	۵۷سال
۸-	حضرت جویریہؓ	۶۰۸ء	شعبان ۵ھ	۲۰سال	۵۶ھ	۶سال	۵۷سال
۹-	حضرت اُم حبیبہؓ	۶۰۳ء	۶ھ	۲۶سال	۴۴ھ	۶سال	۵۷سال
۱۰-	حضرت صفیہؓ	۶۱۳ء	۷ھ	۱۷سال	۵۰ھ	تقریباً ۴سال	۵۹سال
۱۱-	حضرت میمونہؓ	۵۹۴ء	۷ھ	۳۶سال	۵۱ھ	۱/۴ ۳سال	۵۹سال

آپ ﷺ کو چار صاحبزادیاں اور تین صاحبزادے ہوئے، صاحبزادوں کے نام یہ ہیں :

(۱) حضرت قاسم (۲) حضرت عبداللہ (۳) حضرت ابراہیم

صاحبزادیوں کے نام یہ ہیں :

(۱) حضرت زینبؓ: ان کا نکاح حضرت ابوالعاص رضی اللہ عنہ سے ہوا۔

(۲) حضرت رقیہؓ: ان کا نکاح حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے ہوا۔

(۳) حضرت اُم کلثومؓ: حضرت رقیہؓ کی وفات کے بعد آپ ﷺ نے ان کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نکاح میں دیا، اسی لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ 'ذوالنورین' سے ملقب ہوئے۔

(۴) حضرت فاطمۃ الزہراؓ: آپ کا نکاح حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے ہوا اور آپ ہی سے حضور ﷺ کی نسل چلی۔

تینوں صاحبزادے بچپن ہی میں فوت ہوگئے، حضرت ابراہیم کے سوا آپ ﷺ کی تمام اولاد حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے بطن سے ہیں، حضرت ابراہیم آپ کی باندی حضرت ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے پیدا ہوئے۔

○ ○ ○ ○

باب سوم

سیرت نبوی ﷺ — سبق آموز پہلو

نبی کا اسوۂ حسنہ تجھے یہ درس دیتا ہے!

پیغمبر اسلام ﷺ کی حیات طیبہ کو قرآن مجید نے ''اسوۂ حسنہ'' یعنی انسانی زندگی کے لئے بہترین نمونہ قرار دیا ہے، گویا آپ ﷺ کی زندگی ایک آئینہ ہے، جس میں انسان اپنی تصویر دیکھ سکتا ہے، ایک مشعلِ راہ ہے، جس کی روشنی سے زندگی کی مشکل اور تیرہ وتاریک رہگذر میں روشنی حاصل کی جاسکتی ہے، انسان اپنی شخصی زندگی میں بھی اور معاشرتی واجتماعی زندگی میں بھی آپ ﷺ کو نمونہ بنا کر دشواریوں کو آسان بنا سکتا ہے، سیرت کے بہت سے واقعات ہیں، جن کو ہم شب وروز سنتے اور پڑھتے ہیں؛ لیکن افسوس کہ ہم قصہ وکہانی کی طرح ان واقعات سے گذر جاتے ہیں، اپنی عملی زندگی میں ان سے سبق حاصل نہیں کرتے اور موجودہ احوال پر ان کو منطبق کرنے کی سعی نہیں کی جاتی ہے؛ حالاں کہ یہی واقعات وقصص جن کو ہم بچپن سے سنتے آئے ہیں، عبرت وموعظت کے جواہر پارے اور لعل و گہر ہیں اور ان میں ہماری عملی زندگی کے لئے کتنے ہی سبق پوشیدہ ہیں اور حیاتِ مبارکہ کے چند واقعات پر موقوف نہیں، پوری سیرت ہی ''کرشمہ دامن دل میں کشد کہ جا ایں جا است'' کا مصداق ہے، اسی پس منظر میں سیرتِ نبوی کے چند واقعات پیش ہیں۔

بنو زبید کے ایک صاحب مکہ آئے ہوئے تھے، عاص بن وائل نامی شخص سے ایک سامان خریدا اور سامان کی قیمت ادا کرنے سے مکر گئے، زبیدی نے ہزار ہا کوشش کی اور مکہ کی با اثر شخصیتوں سے ربط کیا، لیکن کسی نے اس کی بات پر کان نہ دھرا، بالآخر اس شخص نے عربوں کے قدیم طریقہ کے مطابق ٹھیک طلوعِ آفتاب کے وقت بوقبیس کی پہاڑی پر چڑھ کر اپنی فریاد بلند کی، اہل مکہ عام طور پر اس وقت کعبہ کے گرد وپیش بیٹھے رہتے تھے، اس فریاد نے لوگوں کو چونکا دیا، زبیر بن عبد المطلب اُٹھے اور مکہ کے شریف لوگوں کو عبد اللہ بن جدعان کے مکان میں جمع کیا اور طے کیا کہ ہم کسی شخص پر ظلم نہ ہونے دیں گے اور مظلوموں کو ان کا حق دلائیں گے،

چنانچہ عاص بن وائل سے سامان واپس لیا گیا اور زبیدی کو اس کا سامان حوالہ کیا گیا، اس وقت عمر مبارک بیس سال تھی، آپ ابھی اس انجمن میں ایک سرگرم کارکن کی حیثیت سے شریک ہوئے، اتفاق سے اس معاہدہ میں اشرافِ مکہ میں تین ایسے لوگ شریک تھے، جن کا نام ''فضل'' تھا، اسی مناسبت سے یہ تنظیم ''حلف الفضول'' کہلائی، نبوت کے بعد آپ ﷺ اس کا ذکر فرماتے اور کہتے کہ آج بھی مجھے اس کی طرف دعوت دی جائے، تو میں اس کو قبول کروں گا۔

(البداية والنهاية:۲/۹۱-۲۹۳)

آپ ﷺ کے اس عمل سے معلوم ہوا کہ سماج سے ظلم و جور کو دور کرنا، مظلوموں کی داد رسی کرنا اور کمزوروں کو انصاف دلانا رسول اللہ ﷺ کا اسوہ اور مؤمن کا فریضہ ہے، مسلمانوں کے لئے یہ بات کافی نہیں ہے کہ وہ صرف اپنی حفاظت کرلیں اور سماج میں دوسرے طبقات پر جو بھی ظلم و زیادتی ہو، اس پر خاموش تماشائی بنے رہیں، ہم جس ملک میں رہتے ہیں، وہاں بعض قومیں ہیں جو امتیاز اور طبقاتی نابرابری کا شکار ہیں، لیکن کیا ہم نے کبھی ان کے مسائل حل کرنے اور ظلم و جور سے ان کو نجات عطا کرنے کی کوشش کی؟ کاش، ہم نے بھی اس ملک میں یہ اور اس طرح کے مظلوموں کی مدد کے لئے کوئی ''حلف الفضول'' قائم کی ہوتی!

جب عمر مبارک پچیس کے قریب ہوئی تو مکہ کی ایک شریف اور سرمایہ دار خاتون حضرت خدیجہؓ نے خواہش کی کہ آپ ﷺ ان کا مال لے کر شام جائیں اور تجارت کریں، نفع و نقصان میں دونوں کی شرکت ہو، حضرت خدیجہؓ نے اپنے غلام میسرہ کو بھی ساتھ کردیا، آپ ﷺ نے شام کا سفر فرمایا، یہ تجارت اتنی نفع بخش ہوئی کہ سرمایہ دوگنا ہوگیا، دوسری طرف میسرہ نے آپ ﷺ کی سچائی، امانت و دیانت اور پاکیزہ کردار کا بھی ذکر کیا، اس سے متاثر ہوکر حضرت خدیجہؓ نے آپ ﷺ کو نکاح کا پیغام دیا، چچاؤں کے مشورہ سے آپ ﷺ نے اس رشتہ کو قبول فرمایا اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے حضرت خدیجہؓ سے آپ ﷺ کا نکاح فرمادیا۔

(البداية و النهاية:۲/۹۳-۲۹۴)

اس تجارت اور کاروبار میں امانت و دیانت کا سبق ملتا ہے، خیانت انسان کو وقتی فائدہ

پہنچاتی ہے لیکن زیادہ نقصان، اور آخرت کی پکڑ اس کے سوا ہے، دیانت سے بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کو کم نفع حاصل ہو رہا ہے، لیکن حقیقت میں اس سے آخرت میں بھی اور دنیا میں بھی پائیدار اور زیادہ نفع حاصل ہوتا ہے، حضرت خدیجہؓ عرب کی ایسی سرمایہ دار خاتون تھیں کہ رؤساءِ مکہ ان سے شادی کے خواہشمند تھے، لیکن یہ آپ ﷺ کی دیانت تھی کہ انھوں نے اپنے آپ کو آپ ﷺ کے قدم مبارک میں ڈال دیا اور بالآخر اپنا سب کچھ آپ ﷺ پر نثار کر دیا، نیز سب سے بڑھ کر یہ کہ مکہ کی ابتلاء وآزمائش کی زندگی میں آپ ﷺ کو حضرت خدیجہؓ جیسی سمجھدار اور سراپا تسلیم وایثار شریکِ زندگی کی رفاقت حاصل رہی۔

کعبہ کی عمارت نشیبی علاقہ میں تھی، جب بارش ہوتی تو چاروں طرف سے پانی اس عمارت کی جڑوں میں جمع ہو جاتا، اس کی وجہ سے کعبہ کی دیواریں کمزور پڑ گئی تھیں، اہل مکہ نے اس کی تعمیر نو کا فیصلہ کیا، آپ ﷺ کی عمر مبارک اس وقت بعض روایتوں کے مطابق پینتیس سال اور بعض روایتوں کے مطابق اس سے کم تھی، نبی بہر حال اس وقت نہیں ہوئے تھے، مکہ کے مختلف قبائل نے کعبہ کے مختلف حصوں کی تعمیر اپنے اپنے ذمہ لے لی، لیکن مسئلہ اس وقت اُلجھ گیا، جب حجر اسود کی تنصیب کا مسئلہ پیدا ہوا، یہی حصہ تھا جسے عرب سب سے زیادہ مقدس ومبارک سمجھتے تھے اور ہر قبیلہ کے لوگ چاہتے تھے کہ ان کو یہ شرف وسعادت حاصل ہو، اس اختلاف نے اتنی شدت اختیار کی کہ نوبت قتل وقتال تک آ گئی، قریش کے سب سے معمر بزرگ ابوامیہ بن مغیرہ نے اپنے ناخن تدبیر سے اس مسئلہ کو حل کیا اور طے کیا کہ کل جو شخص سب سے پہلے کعبۃ اللہ میں داخل ہو، وہی اس کے بارے میں فیصلہ کرے، کل صبح سب سے پہلے کعبۃ اللہ میں جن کا ورود ہوا، وہ آپ ﷺ کی ذات گرامی تھی، لوگ آپ ﷺ کی امانت ودیانت کی وجہ سے آپ ﷺ کو ’’صادق‘‘ و’’امین‘‘ ہی کہا کرتے تھے، اہل مکہ اس سے بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے: ’’ھذا الامین رضینا‘‘ جب آپ ﷺ کو اطلاع ملی کہ حجر اسود رکھنے کی بابت آپ ﷺ کو فیصلہ کرنا ہے، تو آپ ﷺ نے نہایت حسن تدبر سے کام لیتے ہوئے ایک چادر منگائی، چادر کے وسط میں یہ پتھر رکھا، مختلف قبائل کے ایک ایک نمائندہ کو طلب فرمایا اور فرمایا کہ چاروں

طرف سے یہ سب نمائندے مل کر اس چادر کو تھام لیں، تا کہ حجر اسود کو اُٹھانے میں سبھوں کی شرکت ہوجائے، یہ چادر جب اس مقام کے قریب آ گئی جہاں حجر اسود کو نصب کرنا تھا، تو اپنے دستِ مبارک سے پتھر کو اپنی جگہ نصب فرما دیا۔ (البدایة و النهایة:۲/۳۰۳)

اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ اگر سماج میں کبھی باہم اختلاف پیدا ہوجائے تو کس طرح خوش تدبیری اور ذہانت کے ساتھ اس مسئلہ کو حل کرنا چاہئے اور ایسا رویہ اختیار کرنا چاہئے، جس میں مختلف طبقات کی دل داری و دل جوئی ہو اور خود ہمیں امانت وسچائی کے اس معیار پر ہونا چاہئے کہ لوگ ہماری دیانت اور راست گوئی میں کوئی شبہ نہ کریں، ہندوستان اور عالم اسلام کے موجودہ حالات میں بہت ضروری ہے کہ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے یہی راہِ اعتدال اختیار کریں۔

ابوطالب آپ ﷺ کے چچا ہیں، محسن اور مددگار ہیں اور باوجود کفر پر ہونے کے سب سے بڑے حامی وناصر ہیں، لیکن معاشی اعتبار سے کچھ بہتر حال نہیں، بچے بھی کئی زیر پرورش ہیں، رسول اللہ ﷺ کو اس صورتِ حال کا بڑا احساس تھا، چچاؤں میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی معاشی حالت غالباً سب سے بہتر تھی، دور دراز تک ان کے کاروبار کا دائرہ وسیع تھا، آپ ﷺ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی کہ ہم لوگ چچا ابوطالب کے بچوں کی کفالت و پرورش اپنے ذمہ لے لیں، حضرت عباس رضی اللہ عنہ تیار ہو گئے، آپ ﷺ پہلے سے تیار تھے، پھر ابوطالب سے درخواست کی، ابوطالب نے کہا: عقیل تو میرے پاس رہیں گے، باقی علی اور جعفر کو تم لوگ اپنے ساتھ رکھ سکتے ہو، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تو آپ ﷺ نے اپنے پاس رکھا اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے حوالہ کیا؛ تا کہ چچا کا بوجھ کچھ کم ہو، پھر تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد کی طرح پرورش کی اور بالآخر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ان کی زوجیت میں دے دیا۔

(سیرت ابن ہشام:۱/۲۴۶)

معلوم ہوا کہ انسان کو اپنے قرابت مندوں اور رشتہ داروں کی خبر گیری کرتے رہنا چاہئے، ان کے احوال سے واقف ہونا چاہئے اور ان کی طرف دستِ تعاون بڑھانا چاہئے،

تعاون کی ایک صورت تو یہ ہے کہ محض وقتی مدد کردی جائے، کچھ پیسے دے دیئے جائیں، ایک دو وقت کھانا کھلا دیا جائے، اس سے وقتی اور عارضی سہولت ضرور ہوتی ہے، لیکن اس کے معیارِ زندگی میں اضافہ نہیں ہوتا، دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اگر ایک عزیز بچوں کی تعلیم و تربیت کی صلاحیت نہیں رکھتا، تو اس کے بچہ کی ذمہ داری قبول کرلے، ان کی پرورش بھی کرے اور تعلیم و تربیت کا فریضہ بھی انجام دے، آپ کے اس عمل سے ایک شخص کی نہیں؛ بلکہ پورے خاندان کی مدد ہوگی، وہی لڑکا کل ہوکر اپنے خاندان کو سنبھالے گا اور ایک پورا خاندان پسماندگی کے معیار سے اونچا ہوسکے گا، افسوس کہ آج کل ہمارے یہاں یہ جذبہ مفقود ہے، اگر ہمارے دو بچے ہوں، تو ہم خاندان کے ایک اور بچہ کی ذمہ داری لے لیں اور ہم مان کر چلیں کہ ہمارے تین بچے ہیں، تو یہ کیا ہی بہتر ہو! سماج کو اونچا اُٹھانے کے لئے یہ نسخۂ کیمیا سے کم نہیں، کاش! ہندوستان کے مسلمان اس حقیقت کو سمجھیں اور آپ ﷺ کے اس عمل کو اپنے لئے اسوہ بنائیں!

جب عمر مبارک ۴۰ سال ہوئی، ایک شب آپ ﷺ غارِ حرا میں مقیم تھے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور اللہ کی طرف سے پہلا کلام (القلم :۱-۵) آپ ﷺ پر اُتارا، گویا نبوت کا تاج گہر بار آپ ﷺ کے سر مبارک پر رکھ دیا گیا، لیکن نبوت کی ذمہ داری کوئی معمولی ذمہ داری نہیں، ایک طرف اللہ سے تعلق دوسری طرف اللہ کے بندوں سے، اللہ سے ہدایت کی سوغات حاصل کرنی ہے اور اللہ کے بندوں میں تقسیم کرنی ہے، ذمہ داری کے احساس نے لرزا دیا، حرا کی چوٹیوں سے اُترے اور اُمت کی ماں حضرت خدیجہؓ کے پاس پہنچے، گھبرائے ہوئے، ڈرے، سہمے اور کپکپائے، صورتِ حال بیان کی، حضرت خدیجہؓ نے تسلی دی اور غم خواری کا فرض اس طور پر ادا کیا جو انھیں کا حق تھا، عرض کناں ہوئیں:

كلا والله ما يخزيك الله ابداً، انك لتصل الرحم، وتكسب المعدوم، وتقرى الضيف، وتعين على نوائب الحق. (بخاری: باب بدء الوحی، حدیث نمبر:۳)

خدا کی قسم! ہرگز اللہ آپ کو رسوا نہیں کرے گا، آپ رشتہ داروں کا حق

ادا کرتے ہیں، لوگوں کے بوجھ اُٹھاتے ہیں، ناداروں کو کما کر لاتے ہیں، مہمانوں کی مہمان نوازی کرتے ہیں اور حق کے راستہ میں آنے والی مصیبتوں میں کام آتے ہیں۔

بیوی سے بڑھ کر انسان کے مزاج و اخلاق، اس کے شب و روز، اس کی خوبیوں اور خامیوں اور اس کی نیکیوں و کوتاہیوں سے کوئی واقف نہیں ہوسکتا اور شوہر کے کردار پر اس سے بڑھ کر کسی کی گواہی معتبر و مستند اور چشم دید نہیں ہوسکتی، یہ بیوی کی گواہی شوہر کے حق میں ہے، اس واقعہ میں بھی ایک اسوۂ و نمونہ ہے کہ ایک مسلمان کو اپنے سماج میں کس کردار کا حامل ہونا چاہئے اور سماج کے مختلف طبقات کے ساتھ اسے کیا سلوک و برتاؤ رکھنا چاہئے؟ رشتہ داروں کے ساتھ، مہمانوں اور آنے جانے والوں کے ساتھ، غریبوں اور پریشان حالوں کے ساتھ، مصیبت زدہ لوگوں کے ساتھ، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، اپنے ہوں یا پرائے، یہی کردار ہے جو داعی کی بات میں وزن اور اس کی دعوت میں اثر پیدا کرتا ہے، جس دعوت کے پیچھے عمل نہ ہو، اخلاق نہ ہو، انسان کی محبت نہ ہو اور کردار کی بلندی نہ ہو، وہ ایک بے روح دعوت ہے، وہ شیر نہیں بلکہ شیر کا مجسمہ ہے اور پھول نہیں بلکہ پھول کا کھلونا ہے۔

جب آپ ﷺ نبوت سے سرفراز کئے گئے، تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا کہ پہلے اپنے گھر اور خاندان سے تبلیغ دین کا آغاز کریں، وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ، (شعراء:۲۱۴) چنانچہ آپ ﷺ نے قبیلہ بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب کو کھانے پر مدعو کیا، لوگ جمع ہوئے، آپ ﷺ نے کھانا کھلایا، پھر ان کے سامنے دعوتِ اسلام پیش کی، ابولہب نے سختی سے انکار کیا اور برا بھلا بھی کہا، خاندان کے دوسرے بزرگ و عزیز بھی خاموش ہی رہے، یہ بھی گویا اخلاق و مروت کے دائرہ میں رہتے ہوئے آپ ﷺ کی دعوت سے انکار تھا، اس مجمع میں ایک کم سن لیکن بلند حوصلہ اور حقیقت پسند نوجوان تھا، جو کھڑا ہوا، اس نے آپ ﷺ کی دعوت پر برملا لبیک کہا اور آپ ﷺ کے مشن کے ساتھ بھرپور مدد کا عہد کیا، یہ نوجوان سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔

(تفسیر ابن کثیر:۳/۳۵۹-۳۵۱)

معلوم ہوا کہ دعوت و اصلاح کے کام میں کوشش کرنی چاہئے کہ ابتدا اپنے گھر اور خاندان سے ہو، ایسا نہ ہو کہ آپ ملک و بیرونِ ملک لوگوں کو دعوت دیں، شہروں شہروں، قریہ قریہ وعظ و تقریر کریں، آپ کے علم و تفقہ کا شہرہ دور دور تک ہو، لیکن آپ ''برقی بلب'' کے بجائے ''مٹی کا چراغ'' ہوں، بلب اپنے قریب کو بھی روشن کرتا ہے اور دور کو بھی اور چراغ کی روشنی دور تک پہنچتی ہے، لیکن اس کے گرد و پیش اندھیرا رہتا ہے، جب آپ ﷺ اپنے گھر کی اصلاح کی طرف توجہ نہ دیں گے اور دوسروں کی اصلاح کرنے کی کوشش کریں گے، تو یقیناً سوچنے والے سوچیں گے، زبانیں کھلیں گی اور انگلیاں اُٹھیں گی کہ شاید یہ شخص اپنی دعوت میں مخلص نہیں، ورنہ ضرور تھا کہ اپنے بال بچوں کو اور گھر کے ماحول کو بھی راہ راست پر لانے کی کوشش کرتا، جب انسان کی دعوت اصلاح ''سارے جہاں کا جائزہ اپنے جہاں سے بے خبر'' کا مصداق ہو، تو اس کی بات بے اثر ہو جاتی ہے۔

اس واقعہ سے یہ بھی سبق ملتا ہے کہ صالح تبلیغی و اصلاحی مقاصد کے لئے کھانے وغیرہ کی تقریبات کا منعقد کرنا، پہلے لوگوں کی ضیافت کر کے ان کو مانوس کرنا، پھر دین حق کی بات ان کے سامنے رکھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور ایک مؤثر طریقہ ہے، اس سے لوگوں میں اُنس پیدا ہوتا ہے، ہمدردی کا احساس اُبھرتا ہے اور جب کسی آدمی سے محبت واُنس ہو جائے تو یقیناً انسان اس کی بات سنجیدگی کے ساتھ اور قبول کرنے کے جذبہ سے سنتا ہے، اس مقصد کے لئے مستقل طور پر کھانے کی دعوت بھی کی جا سکتی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ افطار پارٹی، عید ملاپ، ولیمہ اور عقیقہ وغیرہ کے عنوان سے غیر مسلم بھائیوں کو بلایا جائے اور موقع کی رعایت کرتے ہوئے ان کے سامنے اپنی بات رکھی جائے، اسی طرح میڈیکل کیمپ قائم کئے جائیں اور اس کو دعوتِ اسلام کے لئے ایک ذریعہ و وسیلہ کے طور پر استعمال کیا جائے، افسوس کہ آج مسلمان سیاسی اور مادی اغراض و مقاصد کے تحت ایسی تقریبات رکھتے ہیں اور کچھ غیر مسلم بھائیوں کو بھی اس میں شریک کر لیتے ہیں، لیکن دعوتی و تبلیغی مقاصد کے تحت ہمیں ایسی تقریبات منعقد کرنے کی توفیق نہیں ہوتی!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب نبوت کے عام اعلان واظہار کا حکم فرمایا گیا اور اسلام کی اعلانیہ اور کھلی ہوئی دعوت دینے کی ہدایت فرمائی گئی تو مکہ کے قدم دستور کے مطابق آپ ﷺ صفا کی پہاڑی پر چڑھے، لوگوں کو کسی غیر معمولی بات کی اطلاع دینی ہوتی تو وہ اسی پہاڑی پر کھڑے ہو کر لوگوں کو اپنا مدعی سناتے، کیوں کہ اسی پہاڑی کے قریب کعبۃ اللہ بھی تھا اور یہیں مکہ کی چھوٹی سی بستی بھی آباد تھی، لوگ جمع ہوئے، آپ ﷺ نے ان سے دریافت فرمایا کہ میں نے تمہارے درمیان عمر کے چالیس سال گذارے ہیں، یہیں میں بچپن سے جوان ہوا، میرے روز وشب اور صبح وشام تمہاری نگاہوں کے سامنے ہیں، بتاؤ کہ تم نے مجھے کیسا پایا؟ لوگوں کی زبان پر ایک ہی کلمہ تھا کہ آپ ''صادق'' (سچے) اور ''امین'' (امانت دار) ہیں، آپ ﷺ نے ان کے اعتماد و بھروسہ کا مزید امتحان لیا اور دریافت فرمایا: اگر میں کہوں کہ اس پہاڑی کے پیچھے دشمن کی فوج کھڑی ہے اور وہ تم پر حملہ کرنے والی ہے، تو کیا تم اس کا یقین کروگے؟ حاضرین نے کہا: کیوں نہیں، حالاں کہ بظاہر اس وقت مکہ پر ان کے دشمنوں کی یلغار کا کوئی امکان نہیں تھا، پھر بھی انھوں نے اس کا مثبت جواب دیا، اس تصدیق وتوثیق کے بعد آپ ﷺ نے ان کے سامنے دعوتِ اسلام پیش کی۔ (تفسیر رازی :۷۵۱/۱۶)

آپ ﷺ کے اس طریقۂ دعوت سے ہمیں دو باتیں معلوم ہوتی ہیں: ایک یہ کہ ہر زمانہ وعہد میں جو جائز جدید ذرائع ابلاغ ہوں، دعوتِ دین کے لئے ان کا استعمال کرنا چاہئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اہم کام کے لئے کوئی ایک ہی طریقہ متعین نہیں فرمایا ہر عہد، ہر زمانہ اور ہر علاقہ کے مزاج ومذاق اور ذرائع ابلاغ کی ایجاد کے لحاظ سے مختلف وسائل سے دعوت الی اللہ کا کام لیا جائے، البتہ یہ ضروری ہے کہ ان وسائل کا استعمال شرعاً جائز ہو، صفا کی پہاڑی پر پہلے مشرکین بھی کسی اہم بات کے اعلان کے لئے چڑھا کرتے تھے، بلکہ اس پر بعض بت بھی نصب تھے، اس کے باوجود آپ ﷺ نے اس قدیم طریقہ سے فائدہ اُٹھایا، حج کے موقع سے میلے لگائے جاتے تھے اور لوگ اپنی اور اپنے خاندان کی بڑائی بیان کرنے کے لئے اجلاس منعقد کرتے تھے، عکاظ کا میلہ لگا کرتا تھا، جس میں رقص وسرور کی محفلیں بھی جمتی تھیں،

آپ ﷺ نے ان مواقع کو بھی دین حق کی تبلیغ کے لئے استعمال فرمایا، آپ ﷺ خود بنفس نفیس وہاں تشریف لے گئے اور لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دی۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ داعی کو کردار و اخلاق کے اعتبار سے اپنے آپ کو اتنا اونچا رکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے کہ کوئی شخص اس کی زندگی پر انگلی نہ اُٹھا سکے، انبیاء اور دنیا کے سیاسی وسماجی قائدین کی زندگیوں کے درمیان سب سے نمایاں فرق یہی ہے، کہ دنیا کے قائدین اور خود ساختہ رہبر اپنی ''بات'' تو پیش کرتے ہیں، لیکن اپنی ''ذات'' کو پیش کرنے کی ہمت نہیں کر پاتے، وہ اپنے پروگرام لوگوں کے سامنے رکھتے ہیں، وہ ''مینی فیسٹو'' پیش کرتے ہیں اور یقین دلاتے ہیں کہ مجھے ووٹ دو، میں تمہارے محلّہ میں شہد کی نہریں بہادوں گا، لیکن ان میں یہ ہمت نہیں ہوتی کہ وہ لوگوں کے سامنے اپنی ذات کو پیش کر سکیں، کہ میں نے تمہارے ہی درمیان اپنا بچپن اور جوانی گذاری ہے، اگر ہم نے کہیں بد دیانتی کی ہو، دروغ گوئی کی ہو، ظلم وزیادتی کی ہو، تو کوئی انگلی اُٹھائے، کیوں کہ ان کی زندگی ''تن ہمہ داغ داغ شد'' کا مصداق ہوتی ہے، دین حق کے داعی کو بہر حال اس بات کی کوشش کرنی چاہیئے کہ اس کی زندگی داغدار نہ ہو اور وہ اس موقف میں ہو کہ اپنی بات سے پہلے لوگوں پر اپنی ''ذات'' کو پیش کر سکے۔

حیاتِ طیبہ کا ایک اہم سبق یہ ہے کہ ہر کام واقدام کے لئے مناسب وقت کا انتخاب کیا جائے، بہتر سے بہتر کام ہو، لیکن قبل از وقت ہو تو مفید کے بجائے مضر ہو جاتا ہے، مکہ کی زندگی میں مسلمان کیا کچھ ابتلاؤں سے نہیں گذرے؟ حضرت بلال رضی اللہ عنہ ہیں جن کے گلے میں رسی ڈال کر گلی گلی کوچہ کوچہ گرم ریت پر گھسیٹا جا رہا ہے، جسم زخموں سے چور ہے اور زبان پر ''اللہ احد، اللہ احد'' کے کلمات ہیں، یہ حضرت خباب رضی اللہ عنہ ہیں، جن کو سلگتے ہوئے کوئلوں پر اور دھوپ کی تپش سے گرم اور شعلہ صفت پتھروں پر ننگی پیٹھ کے ساتھ لٹا دیا جاتا ہے اور سینہ پر پتھر ہے کہ حرکت نہ کر سکیں، جب تک جسم سے رِسنے والا لہو کوئلے کو بجھا نہ دے اُٹھنے کی اجازت نہیں ہے، حضرت عمار رضی اللہ عنہ اور ان کے والد پر ناقابل برداشت مظالم ہو رہے ہیں، ان کی والدہ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو نہایت بے دردی و بے آبروئی کے ساتھ برسر عام شہید کیا جاتا ہے،

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسے تاجر کو اتنا زدوکوب کیا جاتا ہے کہ بے ہوش ہو جاتے ہیں اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پشتِ مبارک پر اونٹ کی اوجھ رکھی جاتی ہے اور گلے میں پھندا ڈالا جاتا ہے، ان مصیبتوں اور آزمائشوں نے مسلمانوں کو تڑپا دیا اور وہ بے قرار ہیں کہ کم سے کم اجازتِ جہاد مل جائے کہ وہ ان مظالم کا جواب تو دے سکیں، لیکن ابھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے صبر کی تلقین ہوتی ہے، حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے فرماتے ہیں: ''صبراً آل یاسر'' (سیرت ابن ہشام: ۳۲۰/۱)؛ کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ یہ مظلومیت مسلمانوں کی اخلاقی فتح ہے۔

ان حالات سے یہ بات ظاہر ہو رہی تھی کہ اہل مکہ کے پاس نبوتِ محمدی سے انکار کے لئے کوئی دلیل نہیں، اس لئے یہ ظلم و جور کا سہارا لے رہے ہیں اور ابھی اہل مکہ پر حجت کا اتمام باقی تھا، نیز یہ بات بھی ظاہر تھی کہ مسلمانوں کی کوئی الگ آبادی نہ تھی، ان کی تعداد بھی کم تھی اور وہ ایک ملے جلے سماج میں رہ رہے تھے، اس فضا میں مسلمانوں کے لئے جہاد عملاً خودکشی کے مترادف ہوتا، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قوتِ برداشت سے کام لیا، کعبہ پر مشرکین کا قبضہ گوارا کیا، کعبہ کے اندر اور باہر بتوں کے وجود کو دیکھتے رہے اور خاموش رہے کہ اس وقت بے برداشت ہو جانا اور بے صبری کا ثبوت دینا اسلام کے وجود ہی کو خطرہ میں ڈال سکتا تھا، یہ ایک اہم سبق ہے جس کو زندگی کے ہر مرحلہ میں پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے، بے موقع اشتعال اور بے صبری دشمنوں کو فائدہ پہنچاتی ہے اور خود کو نقصان، اس وقت پوری دنیا میں مسلمان جذبات کی رو میں بہہ جانے اور وقت سے پہلے قدم اُٹھانے کی بیماری میں مبتلا ہیں، کاش! وہ اس پہلو سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ کریں!

ٹھیک اس وقت جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے، ایک عجیب واقعہ پیش آیا، مکہ میں اسلام کے سب سے بڑے دشمن ابوجہل نے ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت برا بھلا کہا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہایت ہی نازیبا اور ناشائستہ رویہ اختیار کیا، اللہ کے راستہ میں جو دکھ سہنا پڑتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی اس کو اپنی زبان پر نہیں لاتے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کچھ نہیں فرمایا، لیکن حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی باندی یہ سب سن رہی تھیں، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شکار کے خوگر تھے،

سر شام واپس آئے تو باندی نے یہ قصہ سنایا اور عار بھی دلائی کہ جو کچھ ابو جہل نے تمہارے بھتیجہ کے ساتھ کیا، اگر تم اس کے بھتیجہ کے ساتھ کرتے، تو وہ یوں ہی نہ چھوڑتا، خاندانی محبت رنگ لائی اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ جوش میں اُبل پڑے، ابو جہل کی تلاش میں نکلے اور صحن کعبہ میں اسے موجود پایا اور اپنی کمان سے ایسا وار کیا کہ ابو جہل کے سر پر گہری چوٹ آئی، لوگوں نے کچھ کہنا چاہا، تو خود ابو جہل نے منع کر دیا اور کہا کہ میں نے ان کے بھتیجے کو بہت برا بھلا کہا ہے۔

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ فاتحانہ مسرت کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور فرمایا کہ: میں نے آج ابو جہل سے تمہارا بدلہ لے لیا، اگر کوئی اور شخص ہوتا تو کتنا خوش ہوتا! لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر ذرا بھی خوشی کا اظہار نہیں فرمایا، بلکہ فرمایا: مجھے اس سے کوئی خوشی نہیں، مجھے تو اس وقت خوشی ہوگی جب خود آپ کلمہ ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' پڑھ لیں، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ پر اس کلمۂ ہوش نے کام کیا، انھوں نے فوراً ہی کلمۂ شہادت پڑھ لیا اور اسلام لے آئے، یہ داعیانہ اسپرٹ ہے، داعی کو اس بات سے خوش نہ ہونا چاہئے کہ فلاں مخالف اور معاند کی تذلیل ہوئی ہے، اس کو مار پیٹ کیا گیا ہے، اس کے قلب کو ہمیشہ آئینہ کی طرف صاف اور اپنے مثبت مشن کے لئے بے قرار و بے تاب ہونا چاہئے اس کو صرف اس بات کی فکر ہو کہ کیوں کر اس کی دعوت مقبول ہوگی، یہی اس کی خوشی کا سامان ہو اور یہی اس کے دُکھ کا باعث، اگر دعوت کے ساتھ شخصی اغراض اور خصومتیں شریک ہو جائیں تو وہ بے اثر اور بے فیض ہو جاتی ہے۔

نبوت کے ابتدائی زمانہ میں جن لوگوں نے شدت سے اسلام کی مخالفت کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچانے کے درپے رہے، ان میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور عمر بن ہشام یعنی ابو جہل کے نام سرفہرست ہیں، یہ بڑے زور آور بھی تھے اور کمزور مسلمانوں پر بڑے ستم روا رکھتے تھے، متعدد ایسے واقعات ہوئے جس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل کی کایا پلٹ دی اور جو شخص پیغمبر اسلام ا کے خون کا پیاسا تھا، وہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خون بہانے اور جان و تن نثار کرنے والا بن گیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کے سلسلہ میں ایک اہم اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ

ان کی مخالفت کو دیکھتے ہوئے آپ ﷺ نے ان کے لئے دُعاء کرنے اور انتقام کی تدبیریں سوچنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کے حضور دُعاء اور التجا کی کہ: الٰہا! عمر بن ہشام یا عمر بن خطاب میں سے کسی سے اسلام کو قوت پہنچا! **اللّٰھم ! أید الاسلام بعمر و بن ھشام أو بعمر بن الخطاب،** (سیرت ابن ہشام: ۳۴۵/۱) —— حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کا واقعہ اسی نالہ نیم شبی کا ظہور تھا، داعی ومبلغ کو اس قوم کے ایمان لانے کے بارے میں اسی طرح بے چین ہونا چاہئے جس کو وہ دعوت دے رہا ہے، وہ دن میں اللہ کے بندوں کی خوشامد کرے، ان کی زبان اور مزاج کی ناہمواریوں کو سہے اور راتوں کو خدا کے سامنے گڑگڑائے، تڑپے اور آنسوؤں سے وضو کرے، یہی بے قراری وکسک اور آہِ سحر گاہی رنگ لاتی ہے اور دلوں کے بند دروازوں کو کھولنے کا باعث ہوتی ہے کہ ''دُعاء'' داعی کا سب سے بڑا ہتھیار ہے!

حیاتِ طیبہ میں شاید سب سے زیادہ ابتلاء وآزمائش کا دن وہ تھا، جب آپ ﷺ اہل مکہ سے مایوس ہو کر طائف پہنچے تھے، یہ صحرائے حجاز میں سرسبزی وشادابی اور تمدن وثقافت کا گویا ایک جزیرہ تھا، آپ ﷺ اچھی اُمیدیں لے کر یہاں تشریف لائے تھے اور توقع رکھتے تھے کہ شاید اسی دیار کے لوگ ایمان لے آئیں، لیکن ابھی ان کے لئے ایمان مقدر نہیں تھا، لوگوں نے دعوتِ حق سے انکار ہی نہیں کیا، بلکہ نہایت شدت کے ساتھ آپ ﷺ کی مخالفت کی اور یہ مخالفت زبان ہی تک محدود نہ رہی بلکہ بستی کے اوباش لڑکوں اور بدمعاش نوجوانوں کو بھی انھوں نے اُکسایا، وہ آپ ﷺ پر پتھر پھینکتے اور خاک اُڑاتے، جسم لہولہان ہو گیا، نعلین مبارکین میں خون کی تہیں جم گئیں، چلنے کی تاب نہ رہی، تھک کر بیٹھ جاتے تو بیٹھنے بھی نہ دیتے، آخر حضرت زید رضی اللہ عنہ نے اپنے کاندھوں پر اُٹھایا اور ایک باغ کی پناہ لی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر جو دُعاء فرمائی، وہ اتنی اثر انگیز ہے کہ گویا خونِ جگر اور دردِ دل نے الفاظ کی صورت اختیار کر لی ہو، آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے التجا کی :

اللّٰھم الیک اشکو ضعف قوتی وقلة حیلتی ، وھو انی علی

الناس ، یاارحم الراحمین ! انت رب المستضعفین وانت

ربی ، الی من تکلنی ؟ الی بعید یتجهمنی أم الی عدو ملکته امری ؟ إن لم یکن بک علیّ غضب فلا أبالی ، ولکن عافیتک هی اوسع لی ، أعوذ بنور وجھک الذی أشرقت له الظلمات وصلح علیه أمر الدنیا والآخرة ، من أن تنزل بی غضبک أویحل علیّ سخطک ، لک العتبی حتی ترضی ، ولا حول ولاقوة الا بک ! . (تہذیب سیرت ابن ہشام:۱۰۲-۱۰۳)

الٰہی! اپنے ضعف و بے سروسامانی اور لوگوں کے مقابلہ میں اپنی بے بسی کی فریاد آپ ہی سے کرتا ہوں، آپ رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم کرنے والے ہیں، درماندہ بیکسوں کے پروردگار آپ ہی ہیں، آپ ہی میرے مالک ہیں، آخر آپ مجھے کس کے حوالہ کررہے ہیں، کیا اس حریف بیگانہ کے جو مجھ سے ترش روئی روا رکھتا ہے یا ایسے دشمن کے جو میرے معاملہ پر قابو رکھتا ہے؟ لیکن اگر مجھ پر آپ کا غضب نہیں ہے تو پھر مجھے کچھ پرواہ نہیں، بس آپ کی عافیت میرے لئے زیادہ وسعت رکھتی ہے، میں اس ذات کے نورِ جمال کی پناہ مانگتا ہوں، جس سے ساری تاریکیاں روشن ہوجاتی ہیں اور جس کے ذریعہ دین و دنیا کے جملہ معاملات سنور جاتے ہیں، مجھے تو آپ کی رضامندی اور خوشنودی مطلوب ہے، آپ کے سوا کہیں سے کوئی قوت وطاقت نہیں مل سکتی۔

یہ ایک پیغمبر ﷺ کی دُعاء ہے جس کے لفظ لفظ سے خود سپردگی اور اللہ کے سامنے سرافندگی ظاہر ہے، یہ ایسا دل دوز اور حوصلہ شکن واقعہ ہے کہ مضبوط سے مضبوط آدمی کی کمر ہمت ٹوٹ جائے اور انسان اپنے مشن کے بارے میں حوصلہ ہار دے، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ کے پایۂ استقلال میں کوئی تزلزل نہیں آیا اور آپ ﷺ نے اپنے مشن کو جاری وساری رکھا،

لیکن کیا آپ ﷺ کا یہ مشن ناکام ہوگیا؟ نہیں! اللہ تعالیٰ نے طائف کی زمین پر آپ کی اس محنت کو اگلی نسلوں میں ظاہر فرمایا اور انھیں معاندین ومنکرین کی نسلوں سے وہ لوگ اُٹھے جنھوں نے جھوٹے مدعیانِ نبوت سے اسلام کی حفاظت وصیانت کا فریضہ سرانجام دیا، پس داعی کو خواہ کتنے بھی حوصلہ شکن حالات ہوں، ہمت نہ ہارنی چاہئے، نہ کسی قوم سے مایوس ہونا چاہئے، کہ اکثر جن قوموں نے شدومد سے اسلام کی مخالفت کی ہے، وہی بالآخر اسلام کے آغوش میں آئی ہیں، یہ نظام قدرت ہے کہ رات کی تہہ درتہہ تاریکی سے صبح کی پو پھوٹتی ہے اور اور جب تمازت اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو وہی بارانِ رحمت کا پیش خیمہ بنتی ہے۔

سیرتِ نبوی ا کا ایک اہم اور تاریخی موڑ ہجرت کا واقعہ ہے، ہجرت سے پہلے کا زمانہ مسلمانو کی مجبور ومقہوری کا دور تھا، وہ کھلے عام نماز تک نہیں پڑھ سکتے تھے، نہ قرآن کی تلاوت کر سکتے تھے، ہجرت نے مسلمانوں کو ایک نئی قوت عطا کی، بعد کو جو فتح مندیاں مسلمانوں کو حاصل ہوئیں، وہ اسی قربانی کا ثمرہ ہیں، جب مکہ کے ایک ایک متنفس تک آپ ﷺ اسلام کی دعوت پہنچا چکے اور کوئی کچا اور پکا گھر ایسا نہ رہ گیا، جس کو آپ ﷺ نے دین حق کی طرف نہ بلایا ہو، تو اب آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دین کی حفاظت وصیانت کے لئے ترکِ وطن کی اجازت مرحمت فرمائی گئی، ادھر اہل مکہ نے آپ ﷺ کے قتل کے منصوبے بنائے، رات کا وقت ہے اور قاتلوں نے چاروں طرف سے گھر کا محاصرہ کر رکھا ہے، اس وقت بھی اہل مکہ کی اور جانی دشمنوں کی بہت سی امانتیں آپ ﷺ کے پاس ہیں، آپ ﷺ نے یہ امانتیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد کی اور قرآن کی ایک آیت پڑھتے ہوئے گھر سے باہر نکل آئے۔

(البداية والنهاية:۱۷۵/۳-۱۷۷)

اپنے رفیق خاص حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر پہنچے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہی معمول کا راستہ چھوڑ کر کسی قدر دور کا راستہ اپنایا، پہلے غارِ ثور پہنچے، جبل ثور کے دامن میں پہنچ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو اپنے کاندھے پر اُٹھالیا اور نشاناتِ قدم مٹاتے ہوئے غارِ ثور تک پہنچے، عرب بڑے قیافہ شناس ہوتے تھے اور نشانِ قدم سے لوگوں کی آمد ورفت کا

اندازہ لگایا کرتے تھے، تین دنوں یہیں مقیم رہے، پھر مدینہ کی سمت روانہ ہوئے۔

(البداية والنهاية:۱۸۰/۳)

غور فرمائیے کہ دشمنی قتل وخون تک جا پہنچی اور اعداء تلوار سونتے ہوئے گھر کا محاصرہ کئے ہوئے ہیں، لیکن امانت و دیانت کا اتنا اعتبار ہے کہ اب بھی اسی کے پاس امانتیں رکھوائی جاتی ہیں، پھر دیانت کا پاس ولحاظ بھی ملاحظہ کیجئے، یہ کچھ مسلمانوں کی امانت نہ تھی، بلکہ کافروں کی تھی، حربیوں اور جانی دشمنوں کی تھی، پھر جہاں جانا تھا، وہاں کے احوال پوری طرح معلوم نہ تھے، معاشی تنگی سے دوچار اور فاقہ مستی کا شکار تھے، اگر ان امانتوں کو ساتھ لئے ہوئے ہی چلے جاتے اور واپس نہ لوٹاتے، تو کون سی نامناسب بات ہوتی؟ لیکن اس وقت بھی امانت کا اتنا لحاظ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جان کو خطرہ میں ڈال کر امانتیں ان کے حوالہ کیں اور بارِ امانت و دیانت سے ہلکے ہو کر تشریف لے گئے، یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبردست اخلاقی فتح تھی کہ مخالفین بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ کریمہ پر اُنگلی اُٹھانے کی ہمت نہیں کرتے تھے اور سمجھ دار لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہوتے تھے کہ جو دنیا کے معاملہ میں اتنا امانت دار ہے، کیا دین واحکام کے معاملہ میں خیانت کا مرتکب ہوگا؟

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے یہ تعلیم دی کہ حسن تدبیر اور حکمتِ عملی، تقویٰ اور دین داری کے منافی نہیں، دنیا میں جو اسباب حفاظت و بچاؤ کے ہوتے ہیں، ان کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے استعمال فرمایا، مانوس راستہ کو چھوڑ کر غیر مانوس راستہ اختیار کیا، نشاناتِ قدم مٹانے کی کوشش کی، جب کوہِ ثور سے مدینہ کی طرف گئے تو ایک راستہ بتانے والے کو بھی ساتھ رکھا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تو ساتھ تھے ہی، جب کوئی پوچھنے والا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے پوچھتا یہ کون ہیں؟ تو توریہ سے کام لیتے اور فرماتے کہ راستہ بتانے والے ہیں۔

سفر طے کرتے ہوئے ۱۲ ربیع الاول بروزِ پیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے، یا تو اہل مکہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ٹھکرایا تھا، یا مدینہ کی خاک پاک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے سراپا انتظار تھی، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، لوگوں کو پہچاننا دشوار ہو رہا تھا کہ کون رسول اللہ ہیں

اور کون ان کے ساتھ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں؟ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رومال کا سایہ کیا، تب لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانا، مدینہ میں ہر شخص ملتجی تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے گھر کو اپنے وجود سے رونق بخشیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ اونٹنی خدا کی طرف سے مامور ہے، جہاں رکے گی وہیں قیام ہوگا، آخر اونٹنی حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مکان کے سامنے بیٹھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام کی سعادت اسی مکان کے حصہ میں آئی۔

(زادالمعاد:۱/۱۰۱-۱۰۲،البدایۃ والنہایۃ:۳/۱۸۶)

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفقاء کے ساتھ کس قدر سادہ انداز پر رہتے تھے، نہ حشم وخدم اور نہ ہٹو بچو، لوگوں کو امتیاز بھی دشوار ہو جاتا کہ کون رسول ہیں اور کون ان کے رفقاء؟ آج ہماری معاشرت میں یہ بات مفقود ہوگئی ہے، اگر اللہ تعالیٰ کسی کو دولت وعزت دے، تو اپنے گرد خادموں کے ایسی حصار بندی کرتا ہے کہ جو اس کی حیثیت سے بھی زیادہ ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دوستوں کے ساتھ بے تکلف رہتے تھے، ساتھ اُٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا ہوتا تھا، ہنسی مذاق بھی کر لیتے تھے، لوگوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی بات کہنے میں کوئی تکلف نہ ہوتا تھا، اپنے رفقاء سے زیادہ معمولی حالات میں زندگی گذارتے تھے اور سلطان ہوکر بھی درویشوں کا طور وطریق نہ چھوڑتے تھے، اپنے قیام کے لئے خود کسی جگہ کا انتخاب نہ کرکے ساتھیوں کی دل داری اور دلجوئی مقصود تھی، حالاں کہ مدینہ آپ کا ننیہال بھی تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا کا سسرال بھی، آپ ان گھروں میں اُتر سکتے تھے، لیکن تمام ساتھیوں کے ساتھ مساویانہ سلوک اور ان کی دلجوئی کا خیال کرتے ہوئے اپنی طرف سے کوئی جگہ متعین نہیں کی۔

مکہ کے بے سروسامان لوگوں کا ایک بڑا قافلہ تھا، جو مدینہ میں خیمہ زن تھا، ان مہاجرین کو ہر گھر پر تقسیم کر دیا گیا، دنیا کی تاریخ میں انصار جیسی ایثار پیشہ قوم کی شاید کوئی مثال ملے، جس نے کمزور معیشت کے باوجود بھی اپنا سب کچھ اسلام کے قدموں میں ڈال دیا، چند دنوں میں اطمینان کی سانس لینے کے بعد سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی کے لئے زمین خریدی اور خود بنفس نفیس اس کی قیمت ادا فرمائی، مسجد کی تعمیر کیا تھی؟ کچھ پتھر جنھیں مٹی کے

گاڑے سے چن دیا گیا، کچی زمین تھی، جب بارش کی وجہ سے کیچڑ ہونے لگا، تو لوگوں نے اس پر سنگریزے بچھا دیئے، محض آٹھ فٹ اونچی چھت تھی، وہ بھی کھجور کے پتوں اور چھالوں کی، اس سے دھوپ بھی چھن کر آتی اور بارش کا پانی بھی اچھا خاصا مسجد کے اندر آ جاتا، یہی خس پوش، ظاہری حسن و آرائش سے عاری اور شوکت و شکوہ سے خالی مسجد تھی، جو مسجد حرام کے بعد دنیا کی سب سے افضل ترین مسجد ہے۔

مقام فکر و عبرت ہے کہ حضور ﷺ ابھی خود بے گھر ودر ہیں، حالاں کہ صاحبِ عیال ہیں، لیکن اپنے گھر کی فکر نہیں ہے، پہلے اللہ کے گھر کی فکر ہے، پہلے مسجد تعمیر فرمائی اور وہ بھی اس شان سے تعمیر کی کہ بذاتِ خود پتھر اُٹھانے میں شامل رہے، (سیرت ابن ہشام: ۱/ ۴۴۲) جاں نثاروں نے درخواست بھی کی کہ خدام حاضر ہیں، آپ زحمت نہیں فرمائیے، مگر آپ نے اس کو قبول نہیں کیا، معلوم ہوا کہ مسلمانوں کا فرض ہے کہ اپنے گھر سے پہلے اللہ کے گھر کی فکر کریں، محض پیسوں کا دے دینا کافی نہیں، یہ تو گداگروں اور بھکاریوں کو بھی دیا جاتا ہے، بلکہ دو چار اینٹ خود بھی اُٹھائیں اور غبار آلودہ ہوں، یہ بھی قیامت میں گواہ ہوں گے، مسجد کی تعمیر میں اہمیت اس کی نہیں کہ کیسے قیمتی پتھر استعمال کئے نقش و نگار کتنا عمدہ کیا؟ تعمیر پر پیسے کتنے خرچ کئے؟ بلکہ اہمیت اخلاص اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے جذبہ کی ہے، خلوص کی قوت اور اللہ کی رضا جوئی کا جذبہ رائی کو پہاڑ بنا دیتا ہے اور ریا و نمائش کا جذبہ پہاڑ کو رائی کی طرح بے وزن۔

ابھی ہجرت کا دوسرا سال ہے، مسلمانوں نے اطمینان کی سانس نہ لی کہ اہل مکہ کی طرف سے اہل ایمان کی اس چھوٹی سی بستی کو اُجاڑنے کی سازش شروع ہوگئی اور بدر کے میدان میں یہ سازش پوری طرح ظہور پذیر ہوئی۔ ایک طرف تین سو تیرہ مسلمان فاقہ مستی سے دوچار اسلحہ کی کمی کا شکار، دوسری طرف اہل مکہ کی تعداد قریب ایک ہزار جس میں عرب کے بڑے بڑے سورما برسر پیکار، آپ ﷺ نے اپنے ساتھیوں کی صف بندی کی، کچھ نصیحت فرمائی اور میدانِ جنگ کے ایک کنارے ایک چھپڑ کے نیچے خدا کے حضور سجدہ ریز ہوگئے، کہ الٰہا! آج اگر یہ چھوٹی سی جماعت ہلاک کر دی جائے تو شاید پھر کبھی زمین پر آپ کی عبادت نہ ہو پائے،

معرکۂ کارزار گرم ہوا، مسلمانوں کو فتح ہوئی، مکہ کے بڑے بڑے ستر سورما سردار قتل ہوئے اور ستر قید کئے گئے، یہ قیدی کون تھے؟ شب و روز مسلمانوں پر ستم ڈھانے والے، جفاکش اور جفا شعار! آج وقت تھا کہ آتش انتقام بھڑکتی اور یہ سب اس میں خاکستر ہو جاتے، لیکن نبی رحمت کا دامن عفو ان کے جرم سے بھی زیادہ وسیع تھا، جو اصحاب ثروت تھے، ان کی فدیہ لے کر رہائی ہوئی، جو اصحابِ علم تھے، دس مسلمانوں کو نوشت و خواند سکھانا ان کا فدیہ قرار دپایا، کیا ذلت و رسوائی کے ساتھ یہ قیدی رخصت کئے گئے؟ نہیں! عزت و محبت کے ساتھ، نئے جوڑے پہنا کر، خود بھوکے رہے ان کو کھلایا، خود کپڑے میسر نہیں ان کو پہنایا اور ایک مہمان کی طرح آپ ﷺ نے ان کو رُخصت فرمایا۔ (سیرت ابن ہشام: ۶۲۶/۳-۶۲۷)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل میں کتنا بڑا سبق ہے؟ مسلمانوں کو کبھی اپنی طاقت پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے، اس کا یقین اللہ کی مدد و نصرت پر ہو، اس کے ہاتھ خدا کی بارگاہ میں پھیلے ہوئے ہوں، وہ دنیا کی بڑی و چھوٹی اور مغربی و مشرقی طاقتوں کی منت و سماجت کرنے کے بجائے خود الحکم الحاکمین سے مانگے، کیوں کہ ساری طاقتوں کا خزانہ اسی کے پاس ہے، وہ میدانِ جنگ میں بہادر ہو، لیکن میدانِ جنگ سے باہر اپنے جانی دشمنوں کے ساتھ بھی خلیق، نرم خو اور نرم گفتار، تاکہ وہ دلوں کو فتح کر سکے اور اس کی اخلاقی عظمت ذہنوں میں بیٹھ جائے، اس واقعہ کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ان قیدیوں سے مسلمان بچوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام فرمایا، ظاہر ہے کہ یہ دین کی تعلیم نہ تھی، پس علم جو بھی ہو، اگر نافع ہو تو وہ مومن کے گمشدہ مال کی طرح ہے، علم خواہ اپنے دشمنوں کے پاس ہو، لیکن ان سے بھی حاصل کرنا ہے، علم و فن کے حاصل کرنے میں دوست و دشمن کی کوئی تفریق نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر تمام قیدیوں سے مالی فدیہ ہی لینے پر اصرار کرتے تو شاید غربت و افلاس اور فقر و فاقہ کے اس دور میں یہ بات بظاہر سود مند ہوئی، لیکن آپ ﷺ نے اس عمل کے ذریعہ اُمت کو سبق دیا کہ اگر علم حاصل کرنے کے لئے پیٹ کاٹنا اور فاقہ مستی برداشت کرنی پڑے تو اسے بھی گوارا کیا جائے، لیکن اپنی نسلوں کے لئے علم سے محرومی اور جہالت کو کسی طور پر قبول نہ کیا جائے، اگر

مسلمان اس حقیقت کو سمجھ لیں، تو شاید بہت جلد وہ موجودہ تعلیمی پسماندگی کے دلدل سے باہر نکل آئیں۔

غزوۂ بدر کے دوسرے ہی سال مسلمانوں کا اہل مکہ سے دوسرا معرکہ اُحد میں پیش آیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض ہدایات کی نادانستہ خلاف ورزی اور کچھ صحابہ کی اجتہادی لغزش کی وجہ سے جیتی ہوئی جنگ مسلمانوں کے لئے ایک گونہ ہزیمت سے تبدیل ہوگئی، دشمنوں کے حوصلے اتنے بڑھ گئے کہ خود آپ ﷺ تک پہنچ گئے اور آپ پر بھی وار کئے گئے، دندانِ مبارک شہید ہو گئے، رُخسارِ مبارک زخمی اور جسم خون سے لہولہان ہے، (تہذیب سیرت ابن ہشام:۱۱۱) لیکن اس حال میں بھی زبان پر دُعاء ہی کے کلمات ہیں، کہ بارالٰہا! یہ مقام نبوت سے ناآشنا اور ناواقف ہیں، ممکن ہے کہ ان کی نسلوں میں اہل ایمان پیدا ہوں۔

کتنا بڑا درس ہے ہم تہی دامانِ علم کے لئے؛ کہ کافروں کی طرف سے خواہ کتنی بھی زیادتی ہو اور کتنا بھی دکھ پہنچے اُمید توڑی نہ جائے اور انسان مایوسی کو اپنا شیوہ نہ بنائے، اُمید رکھیں کہ آج نہ کل وہ ایمان لائیں گے اور عین اس وقت جب جسم ان کے تیروں سے لہولہان ہو، آنکھیں ان کی محبت میں اشک بار، خدا سے ان کے لئے ایمان کے طلب گار ہوں۔

ہجرت کے پانچویں سال غزوۂ خندق کا واقعہ پیش آیا، معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی اس چھوٹی سی نو آباد اور بے سروسامان بستی کو اُجاڑنے پورا عرب اکٹھا ہو رہا ہے اور نفرت وعداوت کے بادل جو ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے تھے، وہ آج گھنگور گھٹا کی صورت میں مدینہ پر اُترنے کے لئے کمربستہ ہیں، آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے خندق کھودنے کا مشورہ دیا، جس کو آپ ﷺ نے پسند اور قبول فرمایا اور بیس دنوں میں چھ ہزار گز طویل اور پانچ گز گہری اور دس گز چوڑی خندق کھودی گئی، آپ ﷺ نے صرف رفقا کو خندق کھودنے پر مامور نہ فرمایا، بلکہ خود بھی اس مشکل کام میں شرکت فرمائی اور جو چٹانیں کسی سے ٹوٹ نہ پائیں، آپ ﷺ نے توڑیں، دشمن آندھی کی طرح آئے، لیکن اس خندق نے ان کے قدم روک دیئے، سرد ترین موسم میں بیس دنوں مدینہ کا محاصرہ جاری رہا، دشمنوں کا ٹڈی دل لشکر،

تیروں کی یلغار اور خنک ہواؤں کے جھونکے، سامانِ اغذیہ کی قلت، یہ بڑا جاں گسل وقت تھا، یہودیوں نے ساتھ چھوڑ دیا، آپ ﷺ نے بروقت اس بات کو ظاہر نہ ہونے دیا، حضرت نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ اس مشکل گھڑی میں مشرف بہ اسلام ہوئے، آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ تم ابھی اپنے ایمان لانے کو چھپاؤ اور کوئی ایسی تدبیر کرو کہ دشمنوں میں پھوٹ پڑ جائے، انھوں نے کمالِ ہوشمندی کے ساتھ اہل مکہ اور یہودیوں کے درمیان بے اعتمادی کی فضا پیدا کردی اور آخر یہ فوج کشی خاسر و ناکام ہوئی، آپ ﷺ کی زبان بددُعاء کے لئے کبھی کھلتی نہ تھی، لیکن اس جنگ کے دوران جب آپ کی کئی نمازیں قضا ہوگئیں، تو برداشت نہ ہوسکا اور دشمنوں کے لئے زبانِ مبارک سے کچھ بددُعائیہ فقرے نکل گئے۔ (البدایة والنهایة: ۹۲/۴-۱۱۶)

معلوم ہوا کہ کسی بھی مشکل مہم میں زعماء و قائدین کو اپنے آپ کو امت کے عام لوگوں کی سطح پر رکھنا چاہئے اور ایک عام فرد کی طرح اس مہم میں شریک رہنا چاہئے، جیسا کہ حضور ﷺ بنفسِ نفیس خندق کھودنے میں شریک رہے؛ کہ اس سے لوگوں کا حوصلہ بڑھتا ہے، یہ بھی معلوم ہوا کہ غلبہ اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے سیاسی تدابیر کا اختیار کرنا کوئی بری بات نہیں، جہاں ہمیں اُمت کے اتحاد کی کوشش کرنی چاہئے، وہیں اس بات کی بھی سعی کرنی چاہئے کہ دشمنانِ اسلام متحد نہ ہونے پائیں اور وہ پراگندہ و منتشر ہوں، ایک پراگندہ قوم کا مقابلہ بمقابلہ متحد قوم کے آسان ہے، ہندوستان میں مسلمان اس طریقہ کار سے بہت کچھ نفع اُٹھا سکتے تھے، ہندو مذہب میں جو طبقاتی تقسیم ہے، وہ ایک ایسا غیر انسانی تصور ہے، جو خون اور خون میں فرق کرتا ہے، یہاں کی اکثریت کو تقسیم کرنے کے لئے یہ ایک طاقتور اور مؤثر ہتھیار ہے، لیکن افسوس کہ مسلمان اس ہتھیار کو استعمال کرنے میں ناکام رہے۔

واقعۂ خندق کا یہ پہلو بھی قابلِ عبرت ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر شخصی زندگی میں کیسی کیسی مصیبتیں اور آزمائشیں آئیں؟ کون سی تکلیف تھی جو آپ ﷺ کو پہنچائی نہ گئی ہو؟ لیکن کبھی زبان پر حرفِ شکایت نہ آیا اور دستِ رحمت بددعا کے لئے نہ اُٹھ پائے، طائف کی ابتلاء میں بھی دُعا ہی کی اور اُحد کے کارزار میں بھی لب دعا ہی کے لئے کھلے، لیکن غالباً دو موقعوں پر آپ

ﷺ نے اپنی ذات کی نسبت سے بد دعا کی: ایک جب آپ ﷺ صحن کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے اور سجدہ کی حالت میں تھے کہ کچھ شر پسندوں نے اونٹ کی اوجھ پشتِ مبارک پر رکھ دی، دوسرے غزوۂ خندق کے موقع سے جب چند نمازیں قضا ہوگئیں، گویا دونوں موقعوں پر دعا ان لوگوں سے متعلق ہے، جنھوں نے نماز اور خدا کی بندگی میں خلل پیدا کیا اور رخنہ اندازی کی، اس سے نماز کی اہمیت اور آپ ﷺ کی نگاہ میں اس کی عظمت معلوم ہوتی ہے۔

آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا ایک زریں باب ''صلح حدیبیہ'' ہے، جس کو قرآن مجید نے فتح مبین سے تعبیر کیا ہے، یہ صلح بظاہر مسلمانوں کی شکست محسوس ہوتی تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے معاملہ فہم اور دانا شخص کو بھی اس صلح میں اپنی شکست کا احساس ہوا، بدر کے معرکہ میں تو صرف تین سو تیرہ صحابہ تھے، لیکن آج چودہ سو جاں نثار ساتھ ہیں اور چشم و ابرو کے اشارہ پر تعمیل حکم کے لئے تیار ہیں، احرام میں ملبوس قافلہ مکہ کے دروازہ تک آپہنچا، کسی محرم کو کعبہ کی زیارت سے محروم کرنا، خواہ دشمن کیوں نہ ہو عرب کی روایت نہ تھی، لیکن اہل مکہ کسی بھی قیمت پر اس بات کے لئے تیار نہ ہوئے کہ مسلمان اس سال عمرہ کرلیں، آپ بغیر عمرہ کے واپس ہونے پر آمادہ ہوئے اور حدیبیہ کے صلح نامہ پر دستخط فرمایا، جس کی ہر شق سے بظاہر بزدلی اور شکست کی بو آتی تھی، صلح کی گفتگو میں بھی اہل مکہ نے بے مروتی کا رویہ اختیار کیا، لیکن آخر حالات نے بتادیا کہ مسلمانوں کی یہ بہت بڑی فتح تھی، بدر اور خندق سے بھی بڑی فتح۔

عداوت و دشمنی کا ماحول کسی مسئلہ پر ٹھنڈے دل سے سوچنے کا موقع نہیں دیتا، آپ ﷺ چاہتے تھے کہ اہل مکہ سے صلح اور دوستی کی فضا پیدا ہو، تاکہ باہم آمد و رفت ہو، وہ خالی الذہن ہوکر اسلام کے بارے میں سوچ سکیں اور جذبۂ نفرت سے عاری ہوکر مسلمانوں کے سلوک و اخلاق کو دیکھ سکیں، نیز اہل مکہ کی طرف سے ذہن فارغ ہو تو عرب کے دوسرے قبائل کو اور قرب و جوار کی مملکتوں کو اسلام کی دعوت دی جائے، چنانچہ صلح حدیبیہ ہوتے ہی آپ ﷺ نے روم و ایران، حبش اور مختلف علاقوں میں اسلام کے دعوتی خطوط لکھے، تبلیغی مقصد کے لئے جابجا صحابہ کے وفود روانہ کئے گئے اور اس کے مفید اثرات مرتب ہوئے، غور فرمایئے کہ صلح

حدیبیہ کے موقع سے آپ ﷺ کے ساتھ چودہ سو صحابہ ہیں، جو مکی زندگی کے تیرہ اور مدنی زندگی کے چھ سال یعنی کل انیس سالوں کی محنتوں کا قریب قریب خلاصہ ہیں، صلح حدیبیہ کے دو سالوں کے بعد جب آپ ﷺ فتح مکہ کے موقع سے تشریف لاتے ہیں تو دس ہزار رفقاء آپ ﷺ کی رکاب میں ہیں اور فتح مکہ کے دو سال بعد ''حجۃ الوداع'' کے موقع پر آپ کے ساتھ حج میں شرکت کرنے والے صحابہ اور صحابیات کم وبیش ایک لاکھ ہیں، زندگی کے آخری چار سالوں میں اسلام کی یہ تیز رفتار بلکہ برق رفتار پیش رفت صلح حدیبیہ ہی کا نتیجہ ہے، جب تک غیر مسلموں کے ساتھ میل جول، گفت وشنید اور تبادلۂ خیال کی معتدل فضا نہ پیدا ہو جائے، اسلام کی دعوت واشاعت کا کام صحیح طور پر انجام نہیں پا سکتا، افسوس کہ مسلمانوں نے کبھی اس پہلو سے غور نہیں کیا اور انھوں نے اپنے پیغمبر ﷺ سے کانٹے بچھانے والوں کے لئے پھول بچھانے اور دکھ پہنچانے والوں کے لئے دستِ دعا اُٹھانے کا سبق نہیں سیکھا۔

سیرت میں ایک غزوہ بنو مصطلق کے نام سے معروف ہے، اس غزوہ میں ایک ناخوش گوار واقعہ پیش آ گیا ایک مہاجر کے غلام اور ایک انصاری کے درمیان کچھ تو تو میں میں ہوگئی، بات دو شخص سے بڑھ کر دو طبقوں کی یعنی انصار و مہاجر کی بن گئی، منافقین ایسے موقعوں کی تاک میں رہتے، چنانچہ منافقوں کے سردار عبداللہ بن ابی نے اس معمولی واقعہ کو خراب رنگ دے دیا اور انصار سے کہا کہ مہاجرین کے ساتھ تمہارا معاملہ عربوں کے اس محاورہ کا سا ہے کہ اپنے کتے کو موٹا کرو تا کہ وہ تمہیں کو نوالہ بنائے، ''سمن کلبک یأکلک'' یہ بات ایک مخلص لیکن نوجوان صحابی حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کے ذریعہ آپ ﷺ تک پہنچی، آپ ﷺ نے تحقیق شروع کی، تو انصار کے اکابر — جو عبداللہ بن ابی کے نفاق سے واقف نہ تھے — کہنے لگے: یہ بچہ کی بات ہے، اس کا کیا اعتبار؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اجازت طلب کی کہ اسی وقت اس منافق کی گردن اُڑا دی جائے، لیکن آپ ﷺ نے منع فرمایا اور اسی وقت قافلہ کو کوچ کرنے کا حکم فرمایا، لوگ چلے اور چلتے رہے، معمولِ مبارک تھا کہ جب شام میں سفر شروع ہوتا تو رات کے آخر میں پڑاؤ کرتے اور صبح میں سفر ہوتا تو شام میں پڑاؤ کرتے، لیکن خلافِ معمول آپ

ﷺ کے حکم سے یہ قافلہ پوری رات اور پورا دن چلتا رہا، یہاں تک کہ دوسرے دن دوپہر میں چلچلاتی ہوئی دھوپ کے وقت قافلہ کو خیمہ زن ہونے کی اجازت ملی، سفر کے تسلسل سے لوگ پریشان تھے، سبھوں نے آرام کیا۔

پھر ایک وقت آیا کہ خود عبداللہ بن ابی کے صاحبزادہ جو مخلص مسلمان تھے، خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ مجھے معلوم ہوا کہ آپ میرے والد کو قتل کرنے والے ہیں، واقعی منافق ہیں اور اسی سزا کے لائق ہیں، لیکن میں ان کا فرماں بردار بیٹا ہوں، میں ان کے قاتل کو برداشت نہیں کرسکتا اور اس طرح ایک کافر کی وجہ سے ایک مخلص مسلمان کی جان چلی جائے گی، تو اگر آپ کا یہ ارادہ ہو تو خود مجھے حکم فرمائیں، میں ان کا سر قلم کردوں، آپ ﷺ نے اس سے منع کیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بلا کر صورتِ حال بتائی، اگر میں اس وقت قتل کردیتا تو بھولے بھالے ذہن کے بزرگان انصار کو خیال ہوتا کہ میں نے زیادتی کی ہے، لیکن آج خود ان کے بیٹے ان کا سر قلم کرنے کو تیار ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یقیناً اللہ نے اپنے رسول کی رائے میں برکت رکھی ہے، ''بارک اللہ فی رأی رسولہ''۔

موجودہ حالات میں ہمارے لئے یہ واقعہ بڑا سبق آموز ہے، مشتعل و بے برداشت ہوجانا اور قبل از وقت کسی قدم کا اٹھانا غلط فہمیوں کو جنم دیتا ہے اور نقصان کا باعث بنتا ہے، انتظار، صبر اور اپنے آپ کو قابو میں رکھنا بظاہر شکست ہے، لیکن انجام کار کامیابی و فتح مندی!

ہجرت کے آٹھویں سال مکہ فتح ہوا، جن لوگوں کو حقارت سے نکالا، دھتکارا اور ٹھکرایا گیا تھا، وہی آج مکہ میں فاتحانہ داخل ہورہے ہیں، فتح وظفر مندی کے ایسے موقعوں پر سپہ سالار کے سر اُٹھے ہوئے اور گردنیں کبر سے اکڑی ہوئی ہوتی ہیں اور زبان پر متکبرانہ نعرہ اور مفتوحین کی تذلیل وتحقیر، لیکن آج کا سماں اس سے بالکل مختلف ہے، آپ ﷺ اونٹنی پر بیٹھے ہوئے ہیں، خشوع وتضرع کی کیفیت ہے، سر اتنا جھکا ہوا ہے کہ بار بار جبین مبارک اونٹنی کے کوہان سے لگ جاتا ہے، فضاء میں ایک سپاہی کی آواز گونجتی ہے کہ آج انتقام اور کشت وخون کا دن ہے، ''الیوم یوم الملحمۃ'' فوراً زبانِ رحمت ترجمان حرکت میں آتی ہے اور ارشاد ہوتا ہے کہ آج کا دن عفو

وکرم کا دن ہے، ''الیوم یوم المرحمۃ''۔(البدایۃ والنھایۃ :۴/۲۹۳-۲۹۵)

فتح ونصرت کی قبا زیب تن کیے جب مکہ میں داخل ہوتے ہیں، تو اپنے مکان میں نہیں اُترتے، جس پر اہل مکہ نے قبضہ کرلیا تھا، بلکہ حضرت ام ہانیؓ کے گھر اُترتے ہیں، غسل کرکے چند رکعت نماز ادا کرتے ہیں، پھر کعبۃ اللہ تشریف لے جاتے ہیں، عثمان بن طلحہ کی طلبی ہوتی ہے، ہجرت سے پہلے آپ ﷺ نے ایک دن کعبہ میں دو رکعت نماز ادا کرنی چاہی کہ مکہ سے جانے سے پہلے خدا کے گھر کی زمین پر جبین بندگی رکھنے کا شرف میسر آجائے، لیکن عثمان بن طلحہ نے درِ کعبہ کو کھولنے سے انکار کردیا، اب وہی عثمان ایک مجرم کی طرح ہاتھوں میں کلیدِ کعبہ لئے سامنے کھڑے ہیں، آپ ﷺ نے کعبہ کا دروازہ کھلوایا، اندر اور باہر کے حصے بتوں سے صاف کرائے، پھر کعبہ کے اندر دو رکعت نماز ادا فرمائی، باہر کئی قریب وعزیز کلیدِ کعبہ کے طلب گار تھے، حضرت علی بھی اس کے لئے عرض کناں ہوئے، تاکہ بنوشیبہ کے بجائے بنوہاشم کو کلید بردار کعبہ ہونے کا شرف حاصل ہو، لیکن آپ ﷺ نے پھر کنجی عثمان بن طلحہ ہی کے سپرد کردی اور ارشاد فرمایا: آج حسن سلوک اور وفا شعاری کا دن ہے، ''الیوم یوم بر و وفاء''۔

(السیرۃ النبویۃ لابی الحسن علی الندوی:۱/۱۹۹)

مکہ کے لوگ ڈرے سہمے اور گھبرائے ہوئے تھے، اکثر موجود تھے، کچھ بھاگ چکے تھے، آپ ﷺ نے کعبہ کی چوکھٹ پر کھڑے ہوکر ان سے دریافت کیا کہ آج تم ہم سے کیا اُمید رکھتے ہو؟ لوگوں نے عرض کیا: آپ ﷺ ایک شریف بھائی اور شریف بھائی کی اولاد ہیں، اس مجمع میں وہ بھی تھے جو چلتے پھرتے آپ پر جملے کستے تھے، وہ لوگ بھی تھے جنھوں نے قتل کے پروگرام بنائے تھے، وہ لوگ بھی تھے جو راہوں میں کانٹے بچھاتے تھے، اور وہ لوگ بھی تھے جو مدینہ کی چھوٹی سی بستی کو ویران اور برباد کرنے کے لئے شب و روز سوچتے اور سازشوں کے تانے بانے بنتے رہتے تھے، لیکن آپ ﷺ نے بیک زبان ان سب کو معافی کا پروانہ دے دیا، ان کو ان کے جرائم یاد تک نہیں دلائے اور ایک نگاہ خشمگیں کا وار تک کرنا مناسب نہ سمجھا، ابوسفیان نے جنگِ اُحد میں دشمنوں کی سپہ سالاری کی تھی، لیکن ان کو یہ اعزاز بخشا کہ اعلان فرما

دیا کہ جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوا وہ مامون ہوا، عکرمہ خود اسلام کے بدترین دشمن تھے اور اسلام کے سب سے بڑے دشمن ابوجہل کے بیٹے تھے، ڈر کر ''یمن'' کی سمت بھاگے، لیکن سمندری طوفان نے پھر مکہ واپس پہنچادیا، جب بیوی کی فرمائش پر ڈرتے گھبراتے خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے تو انتقام تو کجا، آپ ﷺ نے کھڑے ہوکر استقبال کیا اور مرحبا کہہ کر اپنے گلے سے لگایا اور کرم بالائے کرم یہ فرمایا کہ مسلمانوں سے کہا کہ وہ خواہ مخواہ ابوجہل کو برا بھلا کہنے اور کوسنے سے اجتناب کریں، یہ مناسب نہیں کہ ایک کافر باپ کی وجہ سے اس کے مسلمان بیٹے کو ایذا پہنچائی جائے۔

(حیاۃ الصحابہ:۱/۱۴۰،سیرت ابن ہشام: ۴/۴۱۰-۴۱۲،البدایۃ والنہایۃ:۴/۳۰۰-۳۰۱)

فتح مکہ کے اس تاریخی واقعہ سے مسلمانوں کو عفو و درگذر کا سبق ملتا ہے، کوئی قوم خواہ کتنی بھی مخالف و معاند ہو، لیکن جب قابو میں آجائے اور سر جھکادے، تو پچھلے زخموں کو کریدنا اور درپے انتقام ہونا بزدلی بھی ہے اور شرافتِ انسانی کے مغائر بھی، آپ ﷺ نے اپنے چھوڑے ہوئے مکان میں اُترنے سے گریز کیا؛ کیوں کہ اگر آپ ﷺ ایسا کرتے، تو دوسرے مہاجرین بھی اپنے اپنے مکانوں پر قبضہ کرتے، اس سے ایک نئی آویزش شروع ہوجاتی اور اہل مکہ کے قلوب جو اسلام کے لئے نرم ہوئے تھے، ان میں ضد اور عناد پیدا ہوجاتا، اس سے معلوم ہوا کہ جس قوم کو آپ اسلام کی طرف دعوت دے رہے ہیں، حتی المقدور ایسے اقدام سے گریز کریں، جو ان کے لئے ضد و عناد پیدا ہونے کا باعث ہو، آپ ﷺ نے عثمان بن طلحہ سے کنجی لے کر پھر ان ہی کو واپس کیا، اس میں یہ سبق ہے کہ اگر کسی تنظیم و ادارہ کے کسی شخص سے کوئی نامناسب بات ہوجائے، تو پھر حتی المقدور اسی کو ذمہ داری لوٹانے کی کوشش کی جائے کہ اس سے فتنہ اور انتشار سے حفاظت ہوتی ہے اور انسان باصلاحیت اور مفید لوگوں سے محروم نہیں ہوتا۔

سیرتِ طیبہ کا ایک اہم واقعہ وہ ہے جو ''واقعہ افک'' سے مشہور ہے، افک کے معنی جھوٹی تہمت کے ہیں، کچھ منافقین نے ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگائی اور آپؓ کی پاک دامنی کو مشکوک کرنے کی کوشش کی، کچھ بھولے بھالے مسلمان بھی اس میں شریک ہوگئے،

جن میں حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ اور حضرت مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ ہیں، بالآخر قرآن مجید میں حضرت عائشہؓ کی عفت و پاک دامنی کی بابت آیت نازل ہوئی (النور: ۱۱-۲۰) اور تہمت لگانے والوں پر شرعی حد جاری ہوئی، ان سزا یافتہ لوگوں میں بارگاہِ رسالت کے شاعر حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ بھی ہیں، یہ کوئی معمولی غلطی نہ تھی، پیغمبر کی بیوی اور خود اس پیغمبر کی عزت و آبرو کا مسئلہ اس سے متعلق تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہفتوں اس واقعہ کی تحقیق کے لئے پریشان رہے اور مدینہ میں ایک ہنگامہ خیز کیفیت رہی، لیکن ان سب کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کو ایسا بھلایا کہ حضرت حسان رضی اللہ عنہ کو اپنے منبر اقدس پر بیٹھا کر ان سے اشعار سنے اور ان کو دُعائیں دی، غور فرمایئے کہ کتنی وسیع القلبی اور فراخ دلی کی بات ہے کہ ایسی زیادتیوں کو بھی آپ حرفِ غلط کی طرح بھلا دیتے تھے۔

○ ○ ○ ○

معراج کا سبق

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا ایک اہم ترین واقعہ وہ ہے، جسے ''واقعہ معراج'' کہا جاتا ہے، ٹھیک اس وقت جب مکہ میں آپ ﷺ کے اصحاب پر ظلم وستم کے پہاڑ ڈھائے جارہے تھے اور اسلام کے نوخیز پودے کو ہر طرف سے دبانے کی نامبارک کوششیں اپنے شباب پر تھیں، محسن چچا حضرت ابوطالب اور مونس وغم خوار رفیق حیات حضرت خدیجہؓ کی رحلت ہو چکی تھی اور طائف کے واقعہ نے آپ ﷺ کو سخت صدمہ پہنچایا تھا، معراج کا واقعہ پیش آیا، یہ گویا ٹوٹے ہوئے دل کا مداوا اور پیہم لگنے والے زخم پر مرہم تھا، یہ اس بات کا اشارۂ غیبی تھا کہ اسلام کو جس قدر پست کرنے اور دبانے کی کوشش کی جائے گی، یہ اسی قدر سر بلند ہوگا اور اونچا اُٹھے گا۔

سیرت کی کوئی کتاب نہیں، جو اس عظیم واقعہ کے ذکر سے خالی ہو، کتنے جلسے خاص اس موضوع پر ہوتے ہیں، کتنی تقریریں اور خطابات ہیں جو اس واقعہ پر کئے اور سنے جاتے ہیں، کتنے مضامین ہیں کہ اس عنوان پر لکھے اور پڑھے گئے، لیکن سیرت کے ہر واقعہ میں ایسی لذت اور حلاوت ہے کہ ہزار بار سنئے اور بار بار پڑھئے لیکن پھر بھی کوئی بے لطفی پیدا نہیں ہوتی، معراج کا واقعہ چوں کہ ایک انوکھا اور معجزاتی واقعہ ہے اور ایک ایسا سفر نامہ ہے، جس کا مسافر زمین سے آسمان اور آسمان سے پیش گاہ ربانی تک کی کہانی اپنی زبان حق ترجمان سے سناتا ہے، اس لئے اس میں جو لطف اور لذت ہے، وہ ظاہر ہے۔

حیاتِ طیبہ کا کوئی واقعہ نہیں جو عبرت وموعظت کے پہلو سے خالی ہو، یہ ایسی کتابِ زندگی ہے جس کا ورق ورق روشن ہے اور جس کے حرف حرف سے نور ہدایت پھوٹتا اور رہرو منزل کو چراغ دکھاتا ہے —— معراج کے اس واقعہ میں بھی ہماری آپ کی روزمرہ کی زندگی

کے لئے کتنے ہی سبق پنہاں ہیں اور رشد و اصلاح کے کتنے ہی نقوش ثبت ہیں، آیئے کہ عبرت و موعظت کے کچھ پھول اپنے دامن عمل کے لئے ہم بھی چنیں!

● آپ براق نامی سواری پر چڑھ کر بیت المقدس پہنچے اور پہلے اسے باندھ کر پھر ہیکل سلیمانی کی جگہ میں داخل ہوئے ـــــ سواری اللہ کی طرف سے بھیجی ہوئی تھی، بظاہر اس کے بھاگنے اور راہ فرار اختیار کرنے کا اندیشہ نہیں تھا، پھر بھی آپ نے ضروری سمجھا کہ سواری کو باندھ دیا جائے، گویا دنیا میں اسباب و تدابیر کو اختیار کرنا توکل کے خلاف نہیں، توکل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں جس کام کو جن اسباب سے متعلق رکھا ہے، ان اسباب کو اختیار کیا جائے، بیمار ہے تو علاج کرائے، بے روزگار ہے تو کسب معاش کی تدبیر کرے، پھر نتیجہ کے معاملہ میں اللہ پر بھروسہ کرے، جو چاہتا ہے حاصل ہو جائے تو اللہ کا شکر گذار ہو، خواہش پوری نہ ہو تو اللہ سے شکوہ بھی نہ ہو، ایک صاحب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: میں سواری باندھ دوں، پھر اللہ پر بھروسہ کروں، یا سواری نہ باندھوں اور اللہ پر بھروسہ کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: سواری کو باندھو پھر اللہ پر بھروسہ کرو۔

● ہیکل سلیمانی میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ نے تمام پیغمبروں کو وہاں موجود پایا، آپ ﷺ کے آتے ہی صفیں بندھ گئیں، انتظار تھا کہ کون امامت کے لئے آگے بڑھتا ہے؟ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ ﷺ کو آگے بڑھایا اور آپ ﷺ نے سب کو نماز پڑھائی ـــــ غور کیجئے! اس میں کتنا بڑا سبق ہے، پیغمبروں کا گروہ انسانیت کا سب سے مقدس اور اعلیٰ ترین گروہ ہے اور مختلف پیغمبروں کے اپنے امتیازات ہیں، حضرت آدم علیہ السلام پہلے انسان اور پہلے پیغمبر ہیں، حضرت نوح علیہ السلام پہلے پیغمبر ہیں، جنھیں مشرکین سے سے واسطہ ہوا اور جن سے دوسری دفعہ نسل انسانی کا سلسلہ چلا، حضرت ابراہیم علیہ السلام ابوالانبیاء ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء میں افضل اور خاتم النبیین ہیں، ان میں سے کوئی بھی نبی امامت کا دعویدار ہو سکتا تھا، لیکن اپنے اپنے علوِّ مقام کے باوجود کسی نے امامت کے لئے پیش قدمی نہیں کی، معلوم ہوا کہ عہدہ و جاہ کی طلب

نہیں ہونی چاہئے ، انسان خود کسی منصب کا طلب گار نہ ہو، آج کل صدارت و نظامت اور قیادت و امارت کے جھگڑے کہاں کہاں نہیں ہوتے ؟ مسجدیں ہوں یا مدرسے، خانقاہیں ہوں یا تنظیمیں اور تحریکیں، ادارے ہوں یا جماعتیں، ہر جگہ عہدہ کی خواہش اور جاہ کی طلب نے انتشار کی صورت پیدا کر رکھی ہے۔ پس، یہ سبق ہے کہ کوئی مسلمان خود عہدہ اور منصب کا طالب نہ ہو؛ تا آنکہ لوگ اسے آگے نہ بڑھائیں۔

● آپ ﷺ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ پہلے آسمان پر پہنچے تو دروازہ بند تھا، فرشتوں نے دریافت کیا: کون؟ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اپنا نام بتایا، پھر پوچھا گیا کہ تمہارے ساتھ کون ہے؟ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے کہا: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! استفسار کیا گیا کہ کیا انھیں بلایا گیا تھا؟ کہا گیا: ہاں! پھر دروازہ کھلا، اب آپ ﷺ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ اندر داخل ہوئے، یہی بات ہر آسمان پر پیش آئی ——— معلوم ہوا کہ جب آدمی کسی کے یہاں جائے تو پہلے داخل ہونے کی اجازت چاہے، بلا اجازت کسی کے گھر میں داخل ہونا جائز نہیں، جب آنے والے کی بابت پوچھا جائے تو یہ نہ کہے کہ میں ہوں، کہ ''میں'' تو ہر شخص ہے، بلکہ صاف طریقہ پر اپنا نام بتائے، اگر اس کے ساتھ کوئی اور شخص ہو تو اس کا بھی ذکر کرے، گھر میں داخل ہونے کی اجازت کو ''استیذان'' کہتے ہیں، یہ اخلاقی نقطۂ نظر سے نہایت ضروری چیز ہے، ہر انسان اپنی نجی زندگی کا تحفظ چاہتا ہے اور یہ اس کا حق ہے، بلا اجازت دوسروں کے گھر میں داخل ہونا اس کی نجی زندگی میں دخل دینا ہے، اس سے آدمی کو خلل واقع ہوتا ہے، انسان خواہ کتنا بھی پارسا ہو، لیکن بعض اوقات وہ بے تکلفی اور آزادی چاہتا ہے، اسی لئے قرآن و حدیث میں اجازت لینے کی بڑی تاکید آئی ہے اور اس کے آداب واحکام پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

● پہلے آسمان پر آپ ﷺ کی ملاقات انسانیت کے جد امجد حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی، آپ ﷺ نے ان کو سلام کیا، حضرت آدم علیہ السلام نے پرتپاک طریقہ پر آپ کا خیر مقدم فرمایا اور کہا: فرزند صالح اور نبیٔ صالح کو خوش آمدید، ''مرحبا بالنبی الصالح والابن

الصالح ''اسی طرح مختلف آسمانوں پر مختلف پیغمبروں سے آپ ﷺ کی ملاقات ہوتی رہی، آپ ﷺ سلام کرتے اور انبیاء کرام سلام کا جواب بھی دیتے اور مناسب حال خیر مقدمی کلمات بھی ارشاد فرماتے —— گویا انسان جب بھی کسی کے پاس جائے تو پہلے سلام کرے، آنے والے کو سلام کرنے میں پہل کرنی چاہئے، خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا اور زیادہ معزز ہو یا کم، اس میں اپنی ''انا'' کو جگہ نہ دے، پھر جسے سلام کیا جائے، اس پر بھی سلام کا جواب دینا واجب ہے۔ کوئی شخص آئے تو گرم جوشی سے اس کا خیر مقدم کیا جائے، بے رغبتی اور بے نیازی کا انداز نہ ہو؛ بلکہ خوشی و مسرت کا اظہار ہو، یہ میزبانی کے آداب میں سے ہے اور آنے والے مہمان کا حق ہے!

● آپ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اس حال میں دیکھا کہ آپ کے دائیں بائیں بہت سے لوگ ہیں، جب آپ دائیں طرف دیکھتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں اور چہرہ پر تبسم کھیلنے لگتا ہے، اور بائیں طرف دیکھتے ہیں تو غمگین اور ملول خاطر ہوتے اور روتے ہیں، آپ ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے اس کا سبب دریافت فرمایا، تو بتایا گیا کہ دائیں طرف آپ کی جنتی اولاد ہیں اور بائیں طرف دوزخی —— یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ انسان کو اپنی اولاد کی صالحیت، نیکی اور اطاعت خداوندی پر خوش ہونا چاہئے اور ان کی بے دینی اور خدا فراموشی پر دکھی اور بے چین، یہ نہ ہو کہ بچے دنیا کے اعتبار سے بہتر موقف میں ہوں، دکان ہو، مکان ہو، روپئے پیسے ہوں کارخانہ اور کاروبار ہو، چاہے وہ کتنے بھی گناہ میں مبتلا ہو، حرام و حلال کی پروا نہ کرتا ہو اور ہزار خدا فراموشی میں مبتلا ہو، لیکن دولت کی کثرت کو دیکھ کر ماں باپ پھولے نہ سمائیں اور بچے حلال پر قناعت کرتے ہوں، حرام سے مجتنب ہوں، اللہ کے فرماں بردار اور اطاعت گذار ہوں، لیکن حرام سے اجتناب کی وجہ سے معاشی موقف بہت بہتر نہ ہو، تو ماں باپ ناراض ہوں اور اسے بیوقوف سمجھیں، یہ پیغمبروں کا طریقہ نہیں، پیغمبرانہ طریقہ یہ ہے کہ والدین آخرت کے اعتبار سے فلاح و صلاح کو دیکھ کر خوش ہوں اور آخرت کے اعتبار سے نقصان و خسران کو دیکھ کر ناخوش۔

● آپ ﷺ ساتوں آسمانوں سے گذرے، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام ، حضرت ہارون علیہ السلام اور حضرت ادریس علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ پھر ''سدرۃ المنتہیٰ'' نامی مقام پر پہنچے، جس سے آگے فرشتوں کا بھی گذر نہیں، حضرت جبرئیل علیہ السلام یہیں رک گئے، لیکن آپ ﷺ اس سے بھی آگے بلائے گئے، جہاں اللہ تعالیٰ نے ہم کلامی کا شرف بخشا، سورۂ بقرہ کی کی آخری دو آیتیں نازل ہوئیں اور پچاس نمازوں کا تحفہ اُمت کے لئے حوالہ کیا گیا، اس شرف واعزاز اور تحفۂ ربانی کے ساتھ جب واپس ہوئے تو پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پچاس نمازوں کی فرضیت کا حال معلوم ہوا تو بنی اسرائیل کے تلخ تجربہ کی روشنی میں مشورہ دیا کہ بارگاہ الٰہی میں تخفیف کی درخواست کی جائے، آپ ﷺ بار بار تخفیف اور کمی کی درخواست فرماتے اور نمازیں کم کی جاتیں، یہاں تک کہ پانچ نمازیں باقی رہ گئیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: گو یہ پانچ نمازیں ہیں، لیکن اجر پچاس نمازوں ہی کا ہوگا، حضرت موسیٰ علیہ السلام چاہتے تھے کہ آپ مزید تخفیف کی درخواست کریں؛ لیکن آپ ﷺ اشارۂ خداوندی سمجھ چکے تھے، کہ ان پانچوں نمازوں کی فرضیت کو باقی رکھنا ہی مقصود تھا، اس لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ اب پھر مجھے اللہ تعالیٰ سے مزید تخفیف کی درخواست کرنے میں حیا آتی ہے، اس طرح پانچ نمازوں کی فرضیت باقی رہی۔

● اس سے ایک طرف مشورہ کی اہمیت معلوم ہوئی، کہ مشورہ قبول کرنے میں کوئی عار نہ ہونی چاہئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مشورہ کو قبول فرمایا اور بار بار ان کے مشورہ پر عمل کیا، عام طور پر اختلاف کی بنیاد اپنی رائے پر اصرار اور دوسرے کی رائے سے بے اعتنائی ہوا کرتی ہے اور یہ بہت ہی مہلک اور نقصان دہ مرض ہے، دوسرے نماز کی اہمیت اور اس کی عظمتِ شان بھی ظاہر ہوئی، کہ یہ فریضہ حوالہ کرنے کے لئے رب کائنات نے آپ ﷺ کو آسمان پر بلایا، گویا یہ عمل صالح اور بندگی کی معراج اور اس کا اوج کمال ہے۔

● اتنا طویل سفر چند لمحوں میں اللہ نے کرایا، آسمانوں کی سیر ہوئی، انبیاء سے ملاقات

ہوئی، جنت و دوزخ کے مناظر کا مشاہدہ ہوا، پیش گاہ ربانی میں حاضری ہوئی، ہم کلامی سے مشرف ہوئے، اور تحفۂ نماز لے کر واپس آئے یہ سب کچھ ہوا صرف چند ساعت میں، جو لوگ غیبی نظام پر یقین نہیں رکھتے تھے اور خدا کی قدرت کو اپنی قدرت میں تولتے تھے، انھیں ان باتوں پر یقین ہی نہ آتا تھا، وہ استہزاء کرتے، مذاق اڑاتے، تمسخر کرتے، جھٹلاتے، لوگوں نے سوچا کہ یہی موقعہ ہے کہ رفیق خاص حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو آپ کی تصدیق و تائید سے منحرف کردیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی شخص کہے کہ وہ راتوں رات بیت المقدس بلکہ آسمان سے ہوکر آیا ہے تو یہ بھی کوئی قابل یقین بات ہوگی؟ فرمایا: ہرگز نہیں، کہنے والوں نے کہا: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آج یہ دعویٰ کررہے ہیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں تو سچ کہتے ہیں، میں نے کبھی فرشتہ کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کی تصدیق کرتا ہوں، تو آخر اس بات کی تصدیق کیوں نہ کروں؟ —— یہی شان تصدیق ہے، جس نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو صدیق بنایا، پہاڑ سے بھی زیادہ مضبوط اور سمندر سے زیادہ اتھاہ ایمان و یقین —— اس میں بڑا سبق ہے پرستاران عقل کے لئے، کہ جب کوئی بات قرآن و حدیث سے ثابت ہو تو خواہ عقل اسے قبول کرے یا نہ کرے، مومن کو اسے قبول کرنا چاہئے، آنکھیں غلط دیکھ سکتی ہیں، کان غلط سن سکتے ہیں، ذائقہ غلطی کرسکتا ہے اور انسان کی عقل تو قدم قدم پر ٹھوکر کھانے کی خوگر ہے، یہ سب غلط ہوسکتے ہیں، لیکن اللہ اور اس کے رسول کی بات غلط نہیں ہوسکتی، اس عقل کوتاہ کی میزان میں خدا کی قدرتِ بے پناہ کو تولنا رائی سے پہاڑ اور قطرہ کو سمندر سے وزن کرنے کے مترادف ہے!!

○ ○ ○ ○

موجودہ حالات میں واقعۂ معراج کا مطالعہ

رجب کا مہینہ اسلامی تاریخ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ''واقعۂ معراج'' کے لئے جانا جاتا ہے، یہ واقعہ کس سن میں پیش آیا؟ اس سلسلے میں سیرت نگاروں کے درمیان خاصا اختلاف رائے ہے، لیکن مشہور یہی ہے کہ ہجرت کا بارہواں سال اور رجب کی ستائیس تاریخ کو یہ واقعہ ظہور پذیر ہوا، معراج سے مراد وہ آلہ اور ذریعہ ہے جس کے ذریعہ بلندی پر چڑھا جائے، اسی لئے اُردو میں اس کا ترجمہ 'سیڑھی' سے بھی کیا جاتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اس کا اطلاق ہر اس ذریعہ پر ہوتا ہے جو آدمی کو بلندی پر لے جائے، خواہ وہ اینٹوں اور پتھروں سے تراشے ہوئے زینے ہوں، آج کی ترقی یافتہ دنیا میں لفٹ یا کوئی اور الکٹرانک سواری ہو، چاند کی حدود سے گزرتے ہوئے راکٹ ہوں یا کوئی اور ذریعۂ سفر، یہ سب لغوی معنی کے اعتبار سے ''معراج'' کے لفظ میں داخل ہے، حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کے اس سفر آسمانی کے لئے براق اور ایک خاص مرحلہ پر رف رف کا انتخاب کیا گیا تھا اور اس طرح آپ ﷺ کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ آپ ﷺ نے زمین سے آسمانوں بلکہ عرش بریں کے قریب تک سفر فرمایا، اسی لئے سیرت نگار حضرات مکہ سے بیت المقدس تک کے سفر کو ''اسراء'' اور بیت المقدس سے عالم بالا تک کے سفر کو ''معراج'' سے تعبیر کرتے ہیں۔

واقعۂ معراج میں بہت سے سبق آموز اور عبرت آمیز پہلو ہیں اور کتنے ہی نقوش نصح وموعظت اس واقعہ کی تہہ میں چھپے ہوئے ہیں، ان میں ایک اہم پہلو یہ ہے کہ واقعۂ معراج کن حالات میں پیش آیا؟ اور معراج کے واقعہ کے بعد کیا کچھ حالات سامنے آئے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۵۷۰ء میں پیدا ہوئے اور جب عمر مبارک چالیس سال ہوئی، تو نبوت سے سرفراز فرمائے گئے، نبی بنائے جانے کے بعد کچھ کم وبیش تیرہ سال آپ ﷺ نے مکہ معظّمہ میں گزارے، ان تیرہ سالوں میں کوئی دن اور کوئی رات ایسی نہیں تھی، جس میں آپ ﷺ نے دلوں کے بند دروازوں کو کھولنے اور فکر وخیال کی چوکھٹوں پر دستک دینے کی کوشش نہ کی ہو، اپنوں

کے پاس پہنچے، بیگانوں کی خوشامدیں کی، کانٹے بچھانے والوں پر محبت کے پھول نثار کیے، کوچہ کوچہ میں آبلہ پائی کی، صحرا اور بیابانوں میں راہ نوردی کی، ہر تلخ کامی کو برداشت کیا، دشمنوں کی کڑوی کسیلی باتوں کو انگیز فرمایا۔

ان مشقتوں کے باوجود ظاہری حالات کے اعتبار سے دو وجود تھے، جو آپ کے لئے حامی ومحافظ اور سہارا بنے ہوئے تھے: ایک آپ ﷺ کے محسن چچا حضرت ابوطالب، جن کو بنو ہاشم اور بنو مطلب کی قیادت حاصل تھی اور اس لئے ان قبائل کی پناہ زمانۂ جاہلیت کے قبائلی قانون کی وجہ سے آپ ﷺ کو حاصل تھی، دوسرے آپ ﷺ کی رفیقۂ حیات اور ہم دم وغم خوار حضرت خدیجہؓ جو آپ کے زخم پر مرہم رکھا کرتیں اور اپنی دل داری اور محبت کے ذریعہ آپ ﷺ کے غم ہلکے کرتیں، لیکن نبوت کے دسویں سال حضرت ابوطالب کا اور ان کے چند ہی دنوں بعد حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہوگیا اور اس طرح ظاہری طور پر آپ کی تائید وتقویت کے دو اہم ستون بھی گر گئے، اسی لئے آپ ﷺ نے اس سال کو ''عام الحزن'' (غم کا سال) قرار دیا، اب مخالفتوں نے شدت اختیار کرلی، بنو ہاشم کی قیادت ابولہب کے ہاتھ میں آئی، جو آپ ﷺ کا بدترین دشمن تھا، اب تک لوگوں کو آپ ﷺ پر جسمانی ایذا رسانی کی ہمت نہیں ہوئی تھی، لیکن اب ان کی جسارتیں بڑھ گئیں۔

ان حالات میں آپ ﷺ نے طائف کا سفر کیا اور اہل طائف کو ایمان کی دعوت دی، لیکن وہ اہل مکہ سے بھی زیادہ سنگ دل اور شقی القلب ثابت ہوئے، انھوں نے آپ ﷺ کے ساتھ ایسی بدسلوکی روا رکھی جس نے اہل مکہ کی زیادتیوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا، غرض کہ مصیبتوں اور آزمائشوں کی گھٹائیں تہہ در تہہ گہری ہوچکی تھیں، مایوسیوں اور نا اُمیدیوں نے ہر طرف سے گھیر رکھا تھا اور بظاہر راستے بند ہو چکے تھے، ان حالات میں معراج کا واقعہ پیش آیا، یہ واقعہ جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ کے عروج جسمانی کا تھا، وہیں دعوتِ اسلام کے عروج وسربلندی اور ارتقاء کا نقطۂ آغاز بھی بن گیا، اسی واقعہ کے کچھ دنوں کے بعد ہجرت کا حکم ہوا اور ہجرت ہی نے کامیابی وظفرمندی کے راستے کھولے اور صرف آٹھ سال کے بعد مکہ کی وہی سرزمین جہاں

سے آپ ﷺ بے یار و مدد گار نکلنے پر مجبور کئے گئے تھے، آج آپ ﷺ کے قدموں میں بچھی ہوئی تھی اور کاتبِ تقدیر نے ہمیشہ کے لئے اس کی قسمت اسلام سے وابستہ کردی تھی، غرض کہ واقعۂ طائف آپ ﷺ کے ابتلاء وآزمائش کا نقطۂ عروج تھا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے واقعۂ معراج کے ذریعہ دل داری کا سامان کیا اور اسلام کی ظفر مندی اور ترقی کا ایک نیا باب کھل گیا۔

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے واقعۂ طائف اور واقعۂ معراج کے پس منظر میں خوب لکھا ہے :

> یہ حیاتِ طیبہ کا ایک بہت بڑا موڑ ہے، اب تک اللہ کا آخری نبی ﷺ دشمنوں کے حوالے تھا، کہ جس طرح چاہیں، پرکھ لیں، سیرت وکردار کی کسوٹی پر، صداقت وامانت کے معیار پر، چاہے طنز واستہزاء کے تیر چلائیں، گالی وزبان درازی کے تازیانے برسائیں، معاشی ناکہ بندی کا ہتھیار آزمائیں، بندھنوں کی معاشرتی زنجیریں کاٹ دیں، سربازار رسوا کریں، سنگ باری سے جسم اطہر لہولہان کردیں، مظلومیت کی اس کیفیت میں جو دُعا زبانِ وحی ترجمان سے نکلی، وہ عرش الٰہی سے جاٹکرائی، قبولیت کا اولین مظہر پہاڑوں کا فرشتہ تھا، جو تعمیل حکم کے لئے حاضر ہوا تھا، اب نبی ﷺ تمام آزمائشوں سے گزر کر کامیاب ہوتا ہے، دنیوی نقطۂ نظر سے سنگ باری اذیت کی انتہا ہے اور روحانی اعتبار سے سرخروئی ہے، بندہ آزمایا گیا، دبایا گیا، پست کیا گیا اور امتحان میں کامیاب ہوگیا تو اٹھایا گیا، بلند کیا گا، معراج سے ہمکنار ہوا، شعبِ بنی ہاشم کی نظر بندی اور طائف کے بازاروں میں رسوائی کا انعام افلاک کی نظر نوازی اور عرشِ بریں پر عزت افزائی ہے۔

اس وقت عالمی سطح پر بھی اور ملکی سطح پر بھی مسلمان جس صورتِ حال سے دوچار ہیں، وہ یہی ہے کہ قدم قدم پر انھیں ذلیل ورسوا کیا جاتا ہے، بظاہر ہزیمتیں اور شکستیں ہر طرف سے ان کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئی ہے، یہاں تک کہ عالم اسلام کے قلب افغانستان اور عراق میں اعداءِ اسلام اپنا قدم جمانے کے لئے کوشاں ہیں اور دنیائے اسلام کی معیشت کی شہ رگ پر مغربی طاقتیں اپنا پنجہ گاڑے ہوئی ہیں، ان سب کا منشا مسلمانوں کو مرعوب اور خوف زدہ کرنا اور انھیں سرخمیدہ ہونے پر مجبور کرنا ہے، جیسا کہ اہل مکہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ کیا تھا، لیکن اسلام وہ پودا ہے کہ اسے جس قدر کاٹنے کی کوشش کی جاتی ہے اس کی جڑیں مضبوط ہوتی جاتی ہیں اور اس کی شاخیں اپنا دائرہ وسیع کرتی جاتی ہیں، اَصۡلُهَا ثَابِتٌ وَفَرۡعُهَا فِي السَّمَاءِ، قرآن مجید نے اس سلسلے میں عہد نبوت کی اس کیفیت کا خوب نقشہ کھینچا ہے:

اَلَّذِيۡنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدۡ جَمَعُوۡا لَكُمۡ فَاخۡشَوۡهُمۡ فَزَادَهُمۡ اِيۡمَانًا وَقَالُوۡا حَسۡبُنَا اللّٰهُ وَنِعۡمَ الۡوَكِيۡلُ.

(آل عمران: ۱۷۳)

وہ اصحابِ ایمان کہ جن سے لوگوں نے کہا کہ لوگ تمہارے مقابلہ میں جمع ہوگئے ہیں، تم ان سے ڈرو، اس سے ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور وہ کہنے لگے: ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔

اس وقت بھی صورتِ حال یہی ہے کہ کفر کی تمام طاقتیں ایک دوسرے سے بغل گیر ہیں اور ہاتھ سے ہاتھ تھامے ہوئی ہیں، خاک کو خاکستر کردینے والے بارود کا ڈھیر مسلمانوں کو خوفزدہ کرنے کے لئے جمع ہے اور ان ہی میں سے کسی ملک کے ذریعہ مسلمانوں کو کہلایا جاتا ہے کہ وہ فلاں فلاں تبدیلیوں کو قبول کریں، حکمراں بدلیں، سرحدوں میں تبدیلی لائیں، نظام تعلیم میں تغیر کو قبول کریں فلاں دشمن کو دوست اور فلاں دوست کو دشمن بنائیں، ان حالات میں مسلمانوں کا رویہ کیا ہونا چاہئے؟ یہی کہ وہ حوصلہ وہمت کی متاعِ گراں مایہ کو اپنے ہاتھ سے جانے نہ دیں، یہ ان کے لئے پست ہمتی اور کم حوصلگی کا ذریعہ نہ ہو، بلکہ اس سے خدا پر ان کا

یقین بڑھ جائے، وہ دنیا کی محکومی قبول کرنے کے بجائے ایک خدا کی محکومی کو اپنے لئے کافی سمجھیں، وہ مادی طاقتوں کی کارسازی پر یقین کرنے کے بجائے خدا کی قدرت اور کارسازی پر یقین کریں اور کہہ اٹھیں کہ ہمارے لئے ہمارا خدا کافی ہے اور وہی ہمارا کارساز ہے، حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلَ .

اس عداوت کی آخری حد کیا ہوسکتی ہے؟ متاعِ جان و مال کا لٹ جانا، لیکن جس قوم نے خود اپنی رضاء ورغبت سے اپنے جان ومال کو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ فروخت کردیا ہو اور جس کو اس راہ میں پانے سے زیادہ کھونے اور جینے سے زیادہ مرنا عزیز ہو، کیا اسے بھی کوئی طاقت زیر کرسکتی ہے؟ اور کیا اس کو بھی خوف وہراس میں مبتلا کیا جاسکتا ہے؟؟؟

معراج کا واقعہ مسلمانوں کے لئے دلداری اور طمانینت کا سامان ہے، کہ وہ مصیبت اور مایوس کن حالات کی وجہ سے حوصلہ نہ ہاریں، بلکہ اس طرح کے واقعات ان کے پائے استقامت کو مضبوط تر کرتا چلا جائے اور خدا پر ان کا یقین بڑھتا جائے، کہ جیسے رات کی تاریکیوں سے صبح کی پوپھٹتی ہے اور گرمی جب اپنی انتہاء کو پہنچ جاتی ہے، تو آسمان سے بارانِ رحمت زمین پر نچھاور ہوتی ہے، اسی طرح باطل کے غلبہ وظہور کے بعد حق ایک نئی آب وتاب کے ساتھ دنیا کی ظلمتوں پر چھا جاتا ہے اور ہزار کوششوں کے باوجود اس چراغ کو بجھایا نہیں جاسکتا، يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ ۔ (الصّف:۸) یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی گروہ کے لئے سب سے بڑی طاقت اس کا اندرونی حوصلہ اور ہمت مردانہ ہے، جو قوم اس متاعِ حیات سے محروم ہوجائے، وہ ایک باعزت اور خوددار قوم کی حیثیت سے اپنا وجود کھودیتی ہے، ''واقعۂ معراج'' کا پیغام یہی ہے کہ جہدِ مسلسل، یقین کامل اور ثبات واستقامت بالآخر حاملین حق کو عروج وسربلندی سے سرخرو کرتی ہیں!!

○ ○ ○ ○

مکی زندگی کا پیغام

قرآن مجید میں آپ کی حیات طیبہ کو ''بہترین نمونۂ عمل (احزاب:۲۱)اور تمام عالم کے لئے سامانِ رحمت قرار دیا گیا ہے،(انبیاء:۱۰۷)اس میں جہاں آپ کی فضیلت اور درجہ ومقام کا ذکر ہے، وہیں آپ کی شانِ جامعیت کی طرف بھی اشارہ ہے، آپ ﷺ کی ذات جہاں مختلف معاشی طبقات کے لئے اسوہ ہے، غریب ہو یا مالدار، کسان ہو یا کاشتکار، مزدور ہو یا آجر اور گاہک ہو یا تاجر، اور مختلف پیشوں اور عہدوں کے لئے نمونہ ہے، سلطان ہو یا وزیر اور قاضی وحاکم ہو یا سپہ سالار با تدبیر، وہی مختلف احوال میں بھی مشعل راہ ہے، شکست وہزیمت ہو، فتح ونصرت ہو، غالب ہو، مغلوب ہو، سریرآرائے اقتدار ہو یا مظلومی ومحکومی سے دوچار، کسی مسلمان کو اپنی راہِ عمل جاننے کے لئے کسی اور طرف دیکھنے کی حاجت نہیں، ایک یہودی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر طنز کیا کہ تمہارے پیغمبر تو تم کو قضاء حاجت تک کا طریقہ بتاتے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے معذرت کرنے کے بجائے برجستہ فرمایا'' کیوں نہیں؟ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے قضاء حاجت کی حالت میں قبلہ کی طرف رُخ یا پشت کرنے سے منع فرمایا ہے(ترمذی : عن ابی ایوب الانصاری، باب فی النھی عن استقبال القبلہ) یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ تھا کہ یہ اُمت کے لئے سرمایہ افتخار اور وجہ صد اعزاز ہے کہ اقوام عالم میں مسلمان ہی ایک ایسی قوم ہے جن کے پاس مکمل اسوۂ حیات ہے اور ان کو کسی اور قوم کے سامنے فکری اور تہذیبی کاسہ لیسی کی حاجت نہیں، بہ قول خسرو :

پیغمبر پاک رہبرم ، بس !

رب قدیر کے لئے یہ بات دشوار نہ تھی کہ نبوت کے ساتھ ہی سہولتوں اور آسانیوں کا راستہ کھل جاتا، جو لوگ فتح مکہ کے بعد دامن اسلام میں آئے، وہ پہلے ہی مرحلہ میں دعوت حق کو قبول کر لیتے، یا مکہ وطائف کی ابتلاؤں سے گزرے بغیر ہی اہل مدینہ اپنے دامن دل اسلام

کے لئے بچھا دیتے، لیکن اللہ کو یہ بات منظور تھی کہ آپ بھی آزمائشوں کی بھٹی میں تپائے جائیں اور عسرتوں کی راہ سے گزر کر منزل تک پہنچیں؛ تاکہ اُمت مشکل حالات میں بھی آپ کی حیات کو اپنے لئے اسوہ بنا سکے اور آپ کے نقش قدم پر چل کر کامیاب وظفر مند ہو، آپ ﷺ کی مکی زندگی شاید اسی کی تکمیل ہے۔

پس آپ ﷺ کی مکی زندگی یقیناً ان لوگوں کے لئے اسوہ ہے جو کسی ایسے ملک میں آباد ہوں جہاں وہ اقلیت میں ہوں اور باگِ اقتدار ان کے ہاتھ میں نہ ہو، لیکن یہ کہنا بھی درست نہیں کہ موجودہ دور کے جمہوری ممالک (جن میں ہمارا ملک ہندوستان بھی ہے) مکمل طور پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کی صورتِ حال کا آئینہ دار ہے اور یہاں مسلمانوں کو بالکل وہی رویہ اختیار کرنا چاہئے جو مکہ میں آپ ﷺ کے ساتھیوں نے اختیار کیا تھا۔

ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کرنا چاہئے کہ جمہوریت میں بعض مفاسد ہیں اور سب سے بڑا فساد یہ ہے کہ اس نظام میں ''مقدار'' کو ''معیار'' پر اور ''تعداد'' کو ''استعداد'' پر ترجیح حاصل ہے، وہیں اس نظام میں بہت سی خوبیاں بھی ہیں، ان خوبیوں میں سب سے اہم بقاء باہم کا اُصول، عقیدہ واظہار رائے کی آزادی اور مخالف نقطہ نظر کو برداشت کرنے کی صلاحیت ہے اور حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دور میں جمہوری طرز فکر کو عالمی سطح پر جو غلبہ حاصل ہوا ہے، اس میں اسلامی تعلیمات کا بھی خاصا دخل ہے۔

اس جمہوری نظام کے تحت مسلمان اقلیت میں ہو کر بھی حکومت میں شریک وسہیم ہیں، گو عملاً بعض مواقع پر کچھ ناانصافی محسوس کی جائے، لیکن دستوری اعتبار سے مذہب ان کے لئے آگے بڑھنے میں رکاوٹ نہیں ہے، مسلمان اپنے مذہبی افعال اور شعائر کو انجام دینے میں آزاد ہیں اور ان کو اپنی فکر اور رائے کے اظہار کی، بلکہ اس سے بڑھ کر اپنے مذہب کی تبلیغ کی بھی اجازت ہے، یہ وہ سہولتیں ہیں جو مکی زندگی میں مسلمانوں کو حاصل نہیں تھیں —— تاہم اس کے باجود ہندوستان کے موجودہ حالات میں مسلمان بہت کچھ آپ کی مکی زندگی سے روشنی حاصل کر سکتے ہیں اور اس کی روشنی میں اپنے لئے لائحہ عمل مرتب کر سکتے ہیں۔

○ مکی زندگی میں مسلمانوں کا سب سے بڑا وصف ان کا اعلیٰ کردار اور بے داغ زندگی ہے، آپ ﷺ نے جب پہلی دفعہ صفا کی چوٹی پر اپنی نبوت کا اعلان فرمایا اور لوگوں کو دعوتِ توحید دی تو پہلے ان پر اپنی ذات کو پیش فرمایا اور ان حاضرین سے جو آپ کا بچپن دیکھ چکے تھے، آپ کی جوانی جن کی نگاہوں میں گذری تھی، جو آپ کی صبح وشام اور شب و روز سے بخوبی آگاہ تھے، معاملات میں آپ کو پرکھ چکے تھے اور اخلاق و دیانت میں آپ کا امتحان کرچکے تھے، دریافت فرمایا: کہ تم نے مجھے سچا پایا یا جھوٹا؟ اور امانت دار پایا یا خائن؟ —— ان کا جواب ایک ہی تھا کہ ہم نے آپ کے اندر صدق و راستی اور امانت و وفا کے سوا کچھ نہیں پایا ہے! —— یہ بھی تاریخ اخلاق کا ایک نادر واقعہ ہوگا کہ جب آپ نے ہجرت فرمائی تو اس وقت بھی اہل مکہ میں بہت سوں کی امانتیں آپ کے پاس تھیں، آپ نے عہد و پیمان کا ایسا پاس ولحاظ کیا کہ جانی دشمنوں کی امانتیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد کر گئے، بلکہ بظاہر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جان کو بھی اس مقصد کے لئے خطرہ میں ڈالنا گوارا کیا، لیکن اس کا پورا لحاظ رکھا کہ آپ کے دامن عمل پر کوئی چھینٹ نہ آنے پائے، یہی وجہ ہے کہ مکہ میں آپ کے مخالفین نے آپ کو ساحر و جادوگر اور پاگل و مجنون کہہ کر تو بدنام کیا، لیکن باوجود عداوت و دشمنی کے کسی کو یہ جرأت نہیں ہوئی کہ آپ کو جھوٹا یا بد دیانت کہہ سکے۔

یہ صرف آپ ﷺ ہی کی حالت نہ تھی بلکہ جن لوگوں پر بھی آپ نے اپنی صحبت ورفاقت کی کرنیں ڈالی تھیں، وہ بھی اپنے کردار کی پختگی میں ممتاز و نمایاں حیثیت کے حامل تھے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب مخالفین کی ایذاء رسانیوں اور مخالفتوں سے مجبور ہو کر مکہ چھوڑنا چاہا تو ابن دغنہ سے ملاقات ہوئی، ابن دغنہ نے کہا کہ آپ جیسے آدمی سے محرومی گوارا نہیں کی جاسکتی، اس لئے کہ آپ لوگوں کے ساتھ صلہ رحمی کرتے ہیں، لوگوں کے بوجھ اُٹھاتے ہیں، پریشان حالوں کی مدد کرتے ہیں اور مہمان نوازی کرتے ہیں، یہ بالکل وہی الفاظ ہیں جو حضرت خدیجہؓ نے پہلی وحی نازل ہونے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گھبراہٹ کو دیکھتے ہوئے تسلی دینے کے لئے کہے تھے۔

گویا جس طرح آپ ﷺ خود امانت و دیانت، حسن اخلاق، خوش معاملگی، صدق وراستی، وفا شعاری، مظلوموں کی مدد اور مصیبت زدوں کی دستگیری کا نمونہ تھے، آپ نے اپنے صحابہ کو بھی اسی سانچہ میں ڈھال دیا تھا، اس کے نتیجے میں مسلمان گو بظاہر مغلوب تھے؛ بلکہ مغلوب سے بڑھ کر ستم رسیدہ اور مظلوم تھے، لیکن اخلاقی اعتبار سے ان کو ایک طرح کی بالادستی حاصل تھی، لوگ سماجی زندگی میں ان کے اس وصف خاص کو محسوس کرتے تھے اور وہ ان کو اپنے خیال کے مطابق بددین تو کہتے تھے لیکن ان کو ہمت نہ ہوتی تھی، کہ مسلمانوں کے اخلاق ومعاملات کے بارے میں کہیں انگلی رکھ سکیں یا زبان کھول سکیں، یہاں تک کہ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ —— جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے، —— سے جب ہرقل نے دربار شاہی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں استفسار کیا تو باوجود کوشش کے آپ کے بارے میں کوئی ایسی بات نہ کہہ پائے جو آپ کی کسی اخلاقی کوتاہی کو بتاتی ہو، اسی طرح جب مسلمان مہاجرین کے خلاف اہل مکہ کا نمائندہ وفد شاہ حبش نجاشی کے دربار میں پہنچا تو اس کو بھی اس کے سوا کوئی بات کہنے کو نہ ملی کہ مسلمان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق جو عقیدہ رکھتے ہیں، وہ عیسائیوں کے مشہور عقیدہ کے خلاف ہے۔

اس اخلاقی برتری کا نتیجہ تھا کہ خود اہل مکہ میں جو نیک دل، انصاف پسند اور صاف ذہن کے لوگ تھے وہ مسلمانوں کے تئیں گوشہ ہمدردی رکھتے تھے اور یہ ہمدردی بعض مشکل اوقات میں مسلمانوں کے لئے طوفان میں ساحل ثابت ہوتی تھی، شعب ابی طالب کے بائیکاٹ کو ختم کرنے میں ابوالبختری بن ہشام اور دوسرے اہل مکہ نے جو کردار ادا کیا، وہ دراصل مسلمانوں کے اسی اخلاقی تفوق کا نتیجہ تھا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے سب سے اہم اور ضروری نکتہ یہی ہے کہ وہ اپنی اخلاقی سطح کو عام لوگوں سے اونچی رکھیں ان کی یہ حیثیت اس درجہ نمایاں ہو کہ ان میں اور دوسرے لوگوں میں اس فرق کو نمایاں طور پر محسوس کیا جا سکے —— لیکن بدقسمتی سے مسلمانوں نے یہ طے کر رکھا ہے کہ وہ اخلاق وعمل کی کوتاہیوں میں کسی بھی طرح اپنے غیر مسلم

بھائیوں سے پیچھے نہیں رہیں گے، بلکہ بعض دفعہ تو جہالت اور خدانا ترسی کی وجہ سے مسلمانوں کا حال غیر مسلموں سے بھی ابتر ہو جاتا ہے، جب تک سماجی زندگی میں یہ صورتِ حال بتدیل نہیں ہوگی، ہم اپنی ہمسایہ قوموں کی محبت حاصل نہیں کر پائیں گے۔

○ آپ کی مکی زندگی سے ہمیں یہ سبق بھی ملتا ہے کہ مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں، مادی اور مذہبی وجود و بقاء کے لئے ممکنہ وسائل کو اختیار کریں اور اس سے فائدہ اُٹھائیں، مکہ میں کوئی باضابطہ حکومت نہیں تھی اور نہ کوئی قانون وضابطہ تھا، لیکن اس کے باوجود وہاں بھی قبائلی تحفظ اور شخصی پناہ (جوار) کا طریقہ رائج تھا، یعنی ایک قبیلہ کے لوگ اپنے قبیلہ کے افراد و اشخاص کا پورا تحفظ کیا کرتے تھے اور ان پر ہونے والی کسی زیادتی کو اجتماعی مسئلہ تصور کر کے اس کا مقابلہ کرتے تھے، اس خاندانی طرفداری میں جائز اور ناجائز اور صحیح وغلط کا بھی امتیاز نہ ہوتا تھا اور اس باب میں ایک دوسرے کے شریک وسہیم ہوا کرتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت حضرت ابوطالب سردار قبیلہ تھے، چنانچہ جب تک وہ زندہ رہے، آپ نے خاندانی تحفظ کی اس قدیم روایت سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا، یہی وجہ ہے کہ ابوطالب کی زندگی میں اعداء اسلام کو کبھی آپ پر دست درازی کی جرأت نہیں ہوئی، یہاں تک کہ شعب ابی طالب کے بائیکاٹ کے وقت بنی ہاشم و بنی مطلب کے وہ لوگ بھی آپ کے ساتھ شریک رہے، جو ابھی اسلام نہیں لائے تھے، اگر اس بائیکاٹ میں مسلمانوں کے ساتھ پورا قبیلہ شریک نہ ہوتا تو شاید اہل مکہ اس سے شدید تر رویہ اختیار کرتے اور مسلمان زیادہ مشکلات سے دوچار ہوتے، لیکن بنو ہاشم و بنو مطلب کی طرف سے مسلمانوں کی پشت پناہی کی وجہ سے مخالفین کو مقاطعہ سے بڑھ کر کسی اور اقدام کی ہمت نہیں ہوئی، اسی طرح شخصی پناہ اور جوار کے قانون سے بھی مسلمانوں نے استفادہ کیا اور مسلمانوں نے اپنے اہل تعلق غیر مسلموں کی پناہ حاصل کر لی، خود حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کچھ عرصہ تک ابن دغنہ کی پناہ میں رہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان اور اس جیسے ممالک میں مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ملک کے آئین اور دستور کے دائرہ میں رہتے ہوئے مواقع سے استفادہ کریں اور اس میں نہ

تأمل کریں اور نہ کوتاہی، تحفظ صرف جان ہی کا نہیں ہے؛ بلکہ مالی و معاشی حیثیت کا تحفظ، تہذیب وتمدن اور کلچر کی حفاظت، اپنے مذہبی اقدار اور حقوق کا بچاؤ، اپنی زبان وادب کا تحفظ اور ملکی قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے ان کے لئے کوشش مسلمانوں کا فریضہ ہے۔

○ آپ کی مکی زندگی ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ بے موقع اور اپنی طاقت سے بڑھ کر اشتعال سے گریز بہت ضروری ہے، ورنہ ایسا جوش جو ہوش سے عاری ہو، ہمیشہ قوموں کے لئے نقصان ہی کا باعث ہوتا ہے، جب تک آپ مکہ میں رہے، خاص طور پر ان مسلمانوں کے ساتھ — جو غلام تھے — بے جا زیادتیوں کا سلسلہ جاری تھا اور ان کو ایسی اذیتیں دی جاتی تھیں، جو نا قابل بیان اور نا قابل تصور تھیں، کیوں کہ عرب خیال کرتے تھے کہ ان کے لئے ان کے غلام کی حیثیت عام املاک کی سی ہے اور ان کے ساتھ ہر زیادتی روا ہے۔ اس میں کوئی دوسرا دخل نہیں دے سکتا تھا، آپ ﷺ اور آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم اس صورتِ حال کو دیکھ کر بے چین ہو جاتے اور تڑپ اُٹھتے، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ نے کوئی قدم نہیں اُٹھایا اور باوجود اس کے کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے تنگ آ کر جہاد کی اجازت چاہی، آپ صبر و تحمل ہی کی تلقین فرماتے رہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کے بعد ایک بار کعبہ کے پاس نماز ادا کرنے کے سوا مسلمانوں نے کبھی بیت اللہ شریف کے پاس نماز ادا کرنے اور خدا کے اس گھر کو بتوں کی آلائش سے پاک کرنے کی اس وقت کوئی کوشش نہ کی، کیوں کہ اس وقت اشتعال و بے صبری کی ایک چنگاری بھی مسلمانوں کے اس چھوٹے سے گھروندے کو خاکستر کر سکتی تھی۔

لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ مسلمان ہر جگہ سپر اندازی کا ثبوت دیں اور اپنی تہذیب، زبان، شہری حقوق اور سب سے بڑھ کر مذہبی تشخصات سے صرف اس لئے ہاتھ دھوتے جائیں کہ دوسرے مذاہب کے لوگ ہم سے ناراض نہ ہو جائیں، یہ صبر نہیں ''مداہنت'' ہے اور اپنے بقاء کی تدبیر نہیں، قومی خودکشی ہے، اور شرعاً بھی مسلمانوں کے لئے کسی طور اس کو قبول کرنا روا نہیں، دراصل کچھ شر پسند عناصر ایسے ہوتے ہیں کہ وہ بہر حال مخالفت اور عناد ہی کا راستہ اختیار کرتے ہیں اور مذہبی طور پر اپنے آپ کو فنا کر دینے کے سوا کوی چیز نہیں، جو ان کو

مطمئن کر سکے، ایسوں کو آسودہ خاطر کرنا اوران کو رام کرنے کے لئے ''لواور دو'' کا راستہ اختیار کرنا ہمارے لئے قطعاً جائز نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس بارے میں نہ یہ افراط درست ہے کہ مسلمان اپنی ہمسایہ قوموں کے ساتھ ''بے معنی جہاد'' چھیڑ دیں اور قانون کو بالائے طاق رکھ کر اپنے جذبات کا اظہار کریں ، اور نہ یہ صحیح ہے کہ صبر کے نام پر بزدلی اور ضمیر فروشی کا ثبوت دیں اور اپنے ملی وجود ہی سے دستبردار ہو جائیں ، اسلام بے شک ایک نہایت روادار مذاہب ہے، لیکن یہ بھی یادرکھنا چاہئے کہ رواداری دوسروں کے وجود کو برداشت کرنے کا نام ہے نہ کہ اپنے وجود کو کھودینے کا ، اہل مکہ نے جب آپ سے ''لواور دو'' پر معاملہ طے کرنا چاہا تو آپ نے صاف انکار کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لکم دینکم ولی دین ، (کافرون:۶) ایک ایسا ملک جس کی تعمیر اور انتظام وانصرام میں ہم بہر حال کسی نہ کسی درجہ شریک ہیں، اپنے آپ کو کسی شرعی حق سے دستبردار کر لینا ایک سنگین قومی جرم اور رب کائنات کے ساتھ بدعہدی کے مترادف ہے۔

○ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی کوئی دعوت حق اُٹھتی ہے، قوم کے سر برآوردہ، ذی اثر اور مقتدر لوگ (ملأ قوم) اس کی مخالفت کرتے ہیں اور دبے کچلے لوگ (اراذل قوم) ہی ابتداء اس میں دعوت پر لبیک کہتے ہیں ۔ مکہ میں بھی یہی صورت حال پیش آئی ، رؤساء نے مخالفت کی اور قدم قدم پر رکاوٹیں پیدا کیں، غلاموں نے دین حق کا استقبال کیا ، ابوجہل و ابولہب ، عقبہ و عتبہ ، ابوسفیان وغیرہ نے مخالفت اور عداوت کے طوفان بپا کر دیئے، بلال وصہیب اور خباب و یاسر رضی اللہ عنہم جیسے لوگ اسی طوفان کو سہتے ہوئے آپ پر ایمان لائے ، پھر آہستہ آہستہ اسلام غلاموں ، مظلوموں ، کمزوروں ، ستم رسیدوں اور دبے کچلے ہوئے لوگوں کا سہارا بن گیا اور ایسے ہی لوگوں کی پناہ گاہ کی حیثیت سے متعارف ہوا، مدینہ کے انصار بھی مظلوم ہی تھے، یہود ان پر ہر طرح کا ظلم روا رکھتے تھے اور ان کو معاشی غلام بنا چکے تھے، مکہ کے لوگ ان کو اتنا حقیر جانتے تھے کہ بدر کی لڑائی میں دعوت مبارزت میں انصار سامنے آ گئے تو ان سے مقابلہ کرنے میں بھی ان کو اپنی حقارت کا احساس ہوا اور انھوں نے قریش مکہ سے اپنا

مقابل طلب کیا۔

لیکن ان ہی پسماندہ طبقات کی مدد سے اسلام کی جڑیں مضبوط ہوئیں اور جب وہ ناقابل تسخیر طاقت بن گیا، تو رؤساء قوم نے بھی اپنی سپر ڈال دی، وہ عناد و تعصب کے بجائے حقیقت پسندی کے ساتھ اسلام کو سمجھنے پر مجبور ہوئے اور اسی نے ان کو ایمان کی توفیق سے سرفراز کیا، یہاں تک کہ وہی ہادمین اسلام، خادمین اسلام بن کر سامنے آئے ...... ہندوستان میں بھی مسلمانوں کو محسوس کرنا چاہئے کہ اس ملک میں ایک طبقہ مسلمانوں سے بھی زیادہ مظلوم ہے، وہ صدیوں سے سماجی ناانصافیوں کا شکار ہے، اس کو انسان کا درجہ بھی حاصل نہیں ہے، مسلمانوں کے لئے یہ ایک شرعی فریضہ اور اسوۂ نبوی ﷺ کی پیروی بھی ہے اور سیاسی وملکی مصلحت بھی کہ وہ اس طبقہ کو ساتھ لے کر جدوجہد کریں اور اس کی طرف محبت کا ہاتھ بڑھائیں؛ تاکہ وہ لوگ جو اونچے طبقہ کے لوگ کہلاتے ہیں، نہ ان کا استحصال کرسکیں اور نہ مسلمانوں کا۔

○ مکی زندگی کا سب سے بڑا پیغام 'دعوت الی اللہ' کا کام ہے، ایسے غیر مسلم جن سے بہ حیثیت قوم مسلمانوں کا بقاء باہم کا معاہدہ نہ ہو اور ان تک دعوت دین پہنچائی جاچکی ہو، ان ہی سے جہاد کی گنجائش ہے، جس قوم کے ساتھ ہم ایک معاہدہ کے ساتھ رہتے ہوں اور مزید ستم یہ کہ ہم نے ان تک اللہ کی امانت کبریٰ کو پہنچانے کا اہتمام بھی نہ کیا ہو، ان سے جہاد کی گنجائش نہیں، نیز مکی زندگی ہمیں بتاتی ہے کہ اگر کسی خطہ میں مسلمان مظلوم ہوں اور وہ ایسی اجتماعی تنظیمی قوت کے مالک نہ ہوں کہ جہاد کرسکیں، جب بھی ان کے لئے دو ہی راستے ہیں، دعوت دین اور جب دعوت کا حق ادا کرنے کے باوجود لوگ اس کو قبول نہ کریں بلکہ اپنے آپ کو بھی ایمان پر باقی رکھنا مشکل ہوجائے تو ہجرت۔

ہندوستان میں ہم ایک معاہدہ کی بنیاد پر دوسری اقوام کے ساتھ اس طرح رہنے کا عہد کرچکے ہیں، جس میں ہر ایک کو اپنے مذہب پر چلنے کی آزادی ہے، مسلمانوں میں وہ اجتماعیت مفقود ہے جو پوری اُمت کو ایک لڑی سے پروتی ہے اور جس کی بنیاد نظام امارت پر ہے، علاقائی مصیبتوں نے مسلم ملکوں کے دروازے خود مسلمانوں پر اس قوت سے بند کر رکھے ہیں کہ ایسے

ملکوں کو ترک وطن نسبتاً آسان ہے جو غیر مسلم کہلاتے ہیں، لیکن مسلم ملکوں میں شہریت حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں، ہندوستانی مسلمانوں نے اہل وطن میں دعوت الی اللہ کا کام ''نہیں'' کے برابر کیا ہے اور ہمیں اعتراف کرنا چاہئے کہ ہم اس باب میں مسلسل ایک ایسی خیانت کے مرتکب ہیں، جو شاید خیانت کی سب سے بدترین قسم ہے، نہ اس ملک میں دین کی دعوت اور اس پر عمل کے وسیع امکانات کے ہوتے ہوئے ترک وطن کو ہجرت کا نام دینا صحیح ہے اور اگر بالفرض کوئی کسی مسلم ملک کو 'ہجرت' کرنا چاہے تو نہ ایسا کرنا اس کے لئے ممکن ہے، ان حالات میں مسلمانوں کے لئے صرف ایک ہی راہ ''دعوت دین'' کی رہ جاتی ہے؛ کہ اسلام کے جس پیغام کو صدیوں سے مسلمانوں نے نہاں خانہ دل میں چھپا رکھا ہے اور جس پر ان ہی کی طرح پوری انسانیت کا حق ہے، اس کو اس کے حق داروں تک پہنچایا جائے اور دعوت کے اس اہم اور نبوی کام کے لئے تمام ممکنہ وسائل کو روبہ عمل لایا جائے، آپ ﷺ نے کار دعوت کے لئے نہ کسی خاص طریقہ پر قناعت فرمایا اور نہ کسی اجتماع سے استفادہ میں حجاب سے کام لیا، صفا کی پہاڑی پر، دیوار کعبہ کے سائے میں، مکہ کے گلی کوچوں میں، حج اور مقامات حج میں، عُکاظ کے میلوں میں، طائف کے بازاروں میں، گھر گھر اور در در، زبان و بیان سے اور جہاں ضرورت ہوئی وہاں تحریر و قلم سے، غرض آپ نے ہمیشہ مقصد دعوت پر نگاہ رکھی، ہندوستان میں بھی ہمیں اسی کو ملحوظ رکھنا ہوگا اور تمام ممکن و جائز ذرائع و وسائل سے کام لیتے ہوئے اسلام کے پیغام کو پہنچانا ہوگا، یہی مکی زندگی کا سب سے بڑا پیغام ہے!

دعوت دین مسلمانوں کے لئے اللہ کی نصرت کی کلید اور اعداء دین کے لئے خدا کی پکڑ اور مواخذہ کا باعث ہوتی ہے، یہ مکہ کی آبلہ پائی اور طائف کی زخم خوردگی اور دل شکستگی ہی تھی، جس نے مدینہ کی ارض طیبہ میں ایمان کا شجر طوبیٰ لگانے کا غیبی سر و سامان فراہم کیا اور اللہ نے بے شان و گمان مدینہ کے نرم خو، وفا شعار اور سراپا ایثار جاں نثاروں کو آپ کے دامن نبوت سے ایسا وابستہ کر دیا کہ مکہ کے ٹھکرائے ہوؤں کا مدینہ نے شاہانہ و گرم جوشانہ خیر مقدم کیا، یا تو مکہ میں تلواریں اس لئے بے نیام ہوئی تھیں کہ ان میکشان توحید کے خون سے اپنی پیاس بجھائیں یا

مدینہ میں انھیں بے وطنان نیک بخت کے لئے تلواریں بے لباس ہوئیں کہ ان پر قربان ہو کر شاد کام ہوں، یہ خدا کی نصرت کا ظہور تھا اور بدر کے میدان میں مسلمانوں کی بے سروسامان، فاقہ مست اور مقدار کے اعتبار سے نہایت قلیل فوج کا مکہ کے غرق اسلحہ وآہن کثیر تعداد سورماؤں پر غلبہ حاصل کرنا اور اساطین اہل مکہ کا اس جنگ میں کام آجانا اللہ کی طرف سے حقِ دعوت ادا کئے جانے کے باوجود قبول اسلام سے انکار کرنے والوں کا مواخذہ تھا —— یہ دونوں باتیں اس کے بغیر ممکن نہیں کہ مسلمان ہندوستان میں یکسو ہو کر اس ہتھیار کو سہارا بنائیں جو اسلامی تاریخ کا سب سے زیادہ موزوں اور کامیاب ہتھیار رہے۔ وباللہ التوفیق وھو المستعان ۔

○ ○ ○ ○

مدینہ کی طرف......

اسلامی کیلنڈر کا نیا سال ۱۴۲۲ھ شروع ہو چکا ہے اور ابھی اس کا پہلا مہینہ چل رہا ہے، اسلامی کیلنڈر کے لئے پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ ہجرت کو بنیاد بنایا گیا ہے ، اسی لئے اس کو ہجری تقویم کہتے ہیں ، اسلامی تقویم کی بنیاد رکھنے کا سہرا سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے سر ہے اور اکابر صحابہ کے مشورہ سے سیرۃ نبوی کے اس اہم واقعہ کا اس کیلنڈر کے لئے انتخاب عمل میں آیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے بڑھ کر انسانیت کے لئے کیا مژدۂ جاں فزا ہوسکتا ہے؟ غزوۂ بدر بعثت محمدی کے بعد باطل کے مقابلہ حق کی فتح مندی اور سربلندی کا پہلا واقعہ ہے، فتح مکہ تاریخ نبوی میں مسلمانوں کی سب سے بڑی فتح تھی ، بلکہ فتح مبین ہے، جس نے پورے جزیرۃ العرب کی سرکش گردنوں کو اسلام کی چوکھٹ پر خم کر دیا تھا، حجۃ الوداع آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاء کا سب سے بڑا اجتماع اور اُمت سے آپ کی وداعی ملاقات کا دن تھا، آپ کی وفات سے بڑھ کر کون سا سرمایۂ غم ہوسکتا ہے، جو اس اُمت کو ہمیشہ گھلاتا رہے، لیکن ان تمام واقعات کو چھوڑ کر صحابہ نے واقعۂ ہجرت کا اس اہم مقصد کے لئے انتخاب کیا، اس سے انداز کیا جاسکتا ہے کہ ہجرت کے واقعہ میں اُمت کے لئے کس قدر موعظت اور تذکیر کا سامان ہے،—— آیئے! آج ہم اس سبق کو تازہ کریں اور اپنی عملی زندگی میں اس سے روشنی حاصل کریں :

○ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے ہر گھر اور در تک اسلام کا پیغام پہنچا چکے، مکہ کے گرد وپیش کے علاقوں میں بھی اس دعوت حق کی دستک دی اور حج کے اجتماعات اور عکاظ کے میلوں کے ذریعہ عرب کے ایک ایک قبیلہ کی خوشامد فرمائی کہ وہ اس دعوت پر لبیک کہیں تو ہر طرف سے رد و انکار ہی کی صدا آئی ، طنز و تشنیع ہی کے تیر پھینکے گئے اور مکہ و طائف کے لوگوں نے تو مسلمانوں کو ذہنی اور جسمانی اذیت پہنچانے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی ، نا اُمیدی اور انکار کی

اس گھنگھور گھٹا میں روشنی کا صرف ایک چراغ تھا، جو مدینہ کی سرزمین میں جلا تھا، جس نے کھلے طور پر اس دعوت کا استقبال کیا اور مکہ کے مظلوم وستم رسیدہ مسلمانوں کو اپنے گھر میں پناہ دینے کی پیشکش کی ؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے محبت و وفا کی اس سرزمین کی دعوت کو قبول فرمایا اور نبوت کے تیرہویں سال مسلمانوں کو مدینہ ہجرت کرنے کی اجازت دی، چند ہی ماہ میں آہستہ آہستہ اکثر مسلمان مدینہ کوچ کر گئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور کچھ مجبور مسلمان ہی تھے، جو اب مکہ میں باقی رہ گئے تھے —— اس سے معلوم ہوا کہ ہجرت سے پہلے دعوت کا مقام ہے، جب کسی قوم پر دعوتِ دین کا حق ادا کر دیا جائے، اور ان پر حجت پوری ہو جائے، تو اپنے دین کی حفاظت اور دوسری قوموں تک دین کی دعوت کی غرض سے وطن عزیز کو چھوڑنا ہجرت ہے، بہتر معاش کی تلاش میں اور امن وامان کی طلب میں ترک وطن ہی کا نام ہجرت نہیں، جیسا کہ آج کل ''مہاجر'' کا لفظ ہر تارک وطن کے لئے بول دیا جاتا ہے۔

نبوت کے چودہویں سال خود آپ ﷺ کو ہجرت کی اجازت ملی، آپ ﷺ نے ہجرت کا ارادہ فرمالیا، اس ارادہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی دو صاحب زادیاں حضرت اسماءؓ اور ام المومنین حضرت عائشہؓ کے سوا کوئی باخبر نہیں تھا، (بخاری : باب هجرة النبی ﷺ واصحابه الی المدینه، حدیث نمبر:۳۹۵) —— اس سے رازداری کا سبق ملتا ہے، نازک فیصلوں کے اظہار میں احتیاط اور پردہ داری ضروری ہے، افسوس کہ آج اُمت میں اس کا فقدان ہے، ہم ابھی کوئی اقدام نہیں کرتے، لیکن اپنی اشتعال انگیز سرخیوں سے ذرائع ابلاغ کو پہلے ہی گرما گرم مواد فراہم کر دیتے ہیں، یہ جرأت نہیں بلکہ بے وقوفی ہے اور آج ہم نے قومی زندگی میں یہی راستہ اختیار کیا ہوا ہے۔

○ اہل مکہ کو اندازہ ہو گیا کہ اب آپ ﷺ بھی ہجرت کرنے والے ہیں اور اگر آپ ﷺ بچ کے مدینہ چلے گئے، تو پھر مسلمانوں کو کچلنا ممکن نہ ہوگا، چنانچہ انھوں نے مشورے کئے اور شب میں آپ ﷺ کے قتل کا منصوبہ بنا کر بارگاہ نبوت کا محاصرہ کر لیا، رسول اللہ ﷺ کو خدا کی طرف سے اس واقعہ کی اطلاع دی گئی، آپ ﷺ کے پاس اب بھی اہل مکہ اور اپنے جانی

دشمنوں کی بہت سی امانتیں تھیں، آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ امانتیں سپرد کیں اور ان سے خواہش فرمائی کہ آج کی شب وہ آپ کی استراحت گاہ میں وہی چادر اوڑھ کر آرام کریں، جنھیں آپ ﷺ اوڑھا کرتے تھے، چنانچہ آپ ﷺ ایک مشت خاک پھینکتے اور سورہ یٰسین کی ابتدائی آیات پڑھتے ہوئے نکل آئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بستر مبارک پر محوِ خواب ہوئے، —— اس میں امانت و دیانت کا کتنا بڑا سبق ہے! غلامانِ محمد ﷺ کو اخلاق و کردار اور دیانت واعتبار کی نسبت سے اس مقام پر ہونا چاہئے کہ اس کا جانی دشمن بھی اس کو اپنی امانتوں کے لئے سب سے محفوظ اور مامون سمجھے کہ یہی لوگوں کے قلوب کو فتح کرنے کی کلید ہے، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قربانی ملاحظہ فرمایئے، کہ بقول علامہ شبلی نعمانیؒ "آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر خواب قتل گاہ کی زمین ہے، لیکن فاتح خیبر کے لئے قتل گاہ فرش گل تھا" یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ جاننے کے باوجود کہ یہ آرام گاہ ان کے قتل گاہ میں تبدیل ہوسکتی ہے اور یہ بسترِ خواب مرگ کا بستر بھی بن سکتا ہے، بہ سرو چشم یہ خطرہ مول لے کر آپ ﷺ کے حکم کی تعمیل فرمائی۔

○ آپ ﷺ ۱۳ ربیع الاول کو پیر کے دن رات ہی کے وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے یہاں تشریف لے گئے اور وہاں سے تین میل چل کر غارِ ثور کی پناہ لی، پھر تین دن یہاں چھپے رہے، اس کے بعد مدینہ تشریف لے گئے، اس مختصر مدت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور آپ کے خانوادہ نے قربانی کے ایسے نقوش جاوداں چھوڑے ہیں کہ شاید ہی آسمان کی آنکھوں نے اس کی کوئی مثال دیکھی ہو، گھر میں جو کچھ تھا، پانچ چھ ہزار درہم، سب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ساتھ لے لیا اور گھر والوں کے لئے اللہ اور اس کے رسول کا نام چھوڑ آئے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے والد حضرت ابوقحافہ بہت سن رسیدہ اور نابینا تھے، انھوں نے اپنی پوتیوں سے بے چین ہوکر کہا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تو ہم لوگوں کی گذران کے لئے کچھ چھوڑا بھی نہ ہوگا؟ حضرت اسماء اور حضرت عائشہ بہت کم عمر تھیں، لیکن آخر ان کی رگوں میں خونِ صدیق رواں تھا، کچھ مٹی، پتھر وغیرہ کے ٹکڑے گھر کے یک کونے میں جمع کردیئے، جہاں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ درہم ودینار رکھتے تھے، ان کو چند چٹائیوں سے ڈھانک دیا اور اپنے بوڑھے نابینا دادا کو لے جاکر تشفی دلائی

کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہم لوگوں کے لئے بہت کچھ چھوڑ کر گئے ہیں، حضرت ابوقحافہ نے واقعی اسے سچ جانا، کہنے لگے: پھر تو کوئی حرج نہیں، حضرت اسماء کہتی ہیں کہ میں نے یہ محض اپنے بوڑھے دادا کی طمانینت کے لئے کیا تھا، ولکن اردت ان اسکن الشیخ بذالک، (البدایہ والنہایہ :۱۷۹/۳) معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو اپنی بچوں کی تربیت اس انداز سے کرنی چاہئے کہ وہ دین کے لئے پیش آنے والے سرد وگرم میں والدین کا ساتھ دے سکیں۔

○ جب غارِ ثور میں پہنچے، تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خود آگے بڑھ کر غار کو ٹٹول کر دیکھا کہ کہیں غار میں کوئی درندہ یا سانپ وغیرہ تو نہیں ہے؟ تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے محفوظ رہیں، بلکہ بعض روایات میں ہے کہ ایک سوراخ سے سانپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ڈس بھی لیا، ثور کو جاتے ہوئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی کیفیت یہ تھی کہ کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے آجاتے اور کبھی پیچھے، کبھی دائیں آجاتے اور کبھی بائیں، حضور نے یہ کیفیت دیکھی تو سبب دریافت فرمایا: عرض کناں ہوئے کہ مجھے جس سمت سے آپ پر خطرہ محسوس ہوتا ہے، میں ادھر آجاتا ہوں تاکہ اگر کوئی مصیبت آئے تو میں اس مصیبت کو سہوں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم محفوظ رہیں، جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نعل مبارک اُتار لیتے، وہاں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے کاندھوں پر اُٹھا لیتے، (حوالۂ سابق) —— قربان جایئے! حضرت ابوبکر کے صدق وصفا اور جاں نثاریٔ محبت پر، یہ محبت رسول حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی میراث ہے، جو حفاظت ایمان کے لئے متاعِ گراں مایہ ہے اور جو فاسق و فاجر اور دین سے ناواقف و نابلد کلمہ گو کو بھی ایمان پر ثابت قدم رکھتی ہے۔

○ تین دنوں بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر مدینہ کی سمت عام راستہ کو چھوڑ کر ایک غیر معروف راستہ سے نکلے، موقع بہ موقع گذرنے والوں سے ملاقات ہوتی، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تجارتی تعلقات کی بناء پر بڑے متعارف تھے، لوگ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے پوچھتے کہ آپ کے ساتھ یہ کون صاحب ہیں؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ایک ذو معنیین جملہ کہتے: دلیل یدلنی ایک راہ بتلانے والا ہے جو ہمیں راہ بتلا رہا ہے، پوچھنے والے سمجھتے کہ ریگستان میں چوں کہ

راہبر کی ضرورت پڑتی تھی، وہی 'راہبر' مراد ہے، لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا منشا ہوتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے روحانی رہبر ہیں، —— اسی کو حدیث میں ایمانی فراست سے تعبیر کیا گیا ہے، کہ مومن کو معاملہ فہم، خطرات کے بارے میں محتاط اور امکانی اندیشوں کے بارے میں چوکنا ہونا چاہئے اور ایسی بات کہنی چاہئے کہ جو حقیقت کے مطابق بھی ہو اور کسی آزمائش کا سبب بھی نہ بنے۔

واقعۂ ہجرت میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اشارہ کیا کہ وہ ہجرت میں ان کے رفیق ہوں گے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تیرنے لگے، حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ غایت مسرت میں بھی آنکھیں اشک بداماں ہو جاتی ہیں، چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے دو اونٹنیاں خاص اسی مقصد کے لئے خریدیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض گذار ہوئے کہ ایک اونٹنی قبول فرمالی جائے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ اصرار اس کی قیمت ادا فرمائی، غالباً حیات نبوی میں دو مواقع ایسے ہیں کہ جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ اصرار قیمت ادا کی ہے، ایک یہ موقع اور دوسرے مسجد نبوی کی زمین خریدنے کا موقع —— معلوم ہوا کہ جب کوئی چیز دینی اغراض کے لئے لی جائے، تو اس میں انسان کو دوسروں کی عطایا پر قناعت کرنے کی بجائے بہ حد گنجائش خود اپنا مال پیش کرنا چاہئے، کہ یہ اس کے لئے سرمایہ سعادت اور زادِ آخرت ہے۔

○ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے مدینہ تشریف لائے تو مدینہ کی سرزمین آپ کے لئے چشم براہ تھی، مدینہ کے چپہ چپہ میں عید کا سا سماں تھا، لڑکے اور لڑکیاں خیر مقدمی نغمے گا رہے تھے، جوان اور بوڑھے، ہتھیار سجائے اور آنکھیں بچھائے راہ میں کھڑے تھے اور ہر شخص کی آرزو تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے گھر کو اپنے قیام کی سعادت بخشیں، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مکان کے سامنے رکی اور آپ وہیں فروکش ہو گئے، ایسا نہ تھا کہ اہل مکہ کے لئے اپنا وطن چھوڑنا کوئی خوشگوار بات تھی، صحابہ کو مکہ کی ایک ایک چیز یاد آتی تھی اور دل دکھاتی تھی، موسم کی ناموافقت کی وجہ سے صحابہ بیمار بھی پڑ رہے تھے، بعض صحابہ

شدت بخار میں بھی مکہ کی پہاڑیوں یہاں تک کہ مکہ میں اُگنے والی گھاس تک کو یاد کرتے تھے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے نکلے، تو مکہ کی پہاڑیوں پر نگاہ حسرت ڈالی اور فرمایا کہ ہم یہاں سے خود جانا نہیں چاہتے تھے۔

یہ اعزہ ٔو اقارب اور ارض وطن کو چھوڑنا اس لئے تھا کہ دوسروں کو اسلام کی دعوت دینے کے مواقع حاصل ہوں اور خود اپنے ایمان کی حفاظت ہو، مسلمانوں کی ایک ایسی بستی ہو، جہاں ان کا اپنا ماحول ہو، اپنی سماجی زندگی ہو اور وہ اپنی ثقافت کے ساتھ زندگی بسر کرسکیں، یہ ایک حقیقت ہے کہ شرعاً ہندوستان سے کسی اور ملک کو ہجرت کی مسلمانوں کے لئے ضرورت نہیں، بلکہ ان کا فریضہ ہے کہ وہ اسی ملک میں رہ کر دعوت دین کا فریضہ انجام دیں، اگر ہم اس فریضہ سے پہلوتہی کریں اور راہ فرار اختیار کریں، تو شاید عنداللہ ہم اس سلسلہ میں جواب دہ ہوں گے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اندرون ملک ہجرت کا نظام بنانا چاہیے، ملک کے مختلف علاقوں میں مسلمانوں کی کثیر آبادی کے جزیرے ہیں، اگر قرب وجوار کے مسلمان بتدریج ان مقامات پر منتقل ہو جائیں تو اس یکجا آبادی کی وجہ سے ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی بھی حفاظت ہوگی، ان کی سیاسی اور معاشی قوت میں بھی اضافہ ہوگا اور وہ اپنی تہذیب وثقافت کو بھی محفوظ رکھ سکیں گے، یہ بات مشاہدہ میں آئی ہے کہ جہاں مسلمانوں کی قلیل آبادی غیر مسلموں کے درمیان بستی ہے، وہاں بتدریج وہ غیر مسلم تہذیب میں جذب ہوتے چلے جاتے ہیں اور ارتداد کے فتنے بھی پھوٹ پڑتے ہیں، اور اگر مسلمان اپنے دین پر استقامت کا ثبوت دیں تو فسادات ہونے لگتے ہیں اور وہ سیاسی اعتبار سے بے وزن اور معاشی اعتبار سے مفلوج ہوکر رہ جاتے ہیں، اس لئے اہل ثروت مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے غریب اور مفلوک الحال مسلمان بھائیوں کو یکجا ہونے میں مدد دیں اور انھیں آباد کریں، اس سے نہ صرف یہ کہ ان غریب مسلمانوں کے ایمان کی حفاظت ہوگی، بلکہ خود ان اہل ثروت مسلمانوں کی بھی جان ومال اور کاروبار کی حفاظت ہوسکے گی۔

○ ○ ○ ○

بدر کا سبق

رمضان المبارک کا دوسرا عشرہ گذر چکا ہے، جہاں یہ دہا اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت اور عفو و درگذر کا ہے، وہیں اس سے اسلامی تاریخ کا ایک عظیم الشان واقعہ بھی متعلق ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد تیرہ سال مکہ میں مقیم رہے، ان تیرہ سالوں میں پہلے تین سال تو خاموش دعوت میں گذرے اور دس سال آپ نے اعلانیہ لوگوں تک دعوت حق پہنچائی، یہ پورا عرصہ اس طرح گذرا کہ کوئی صبح اور کوئی شام ایسی نہ تھی، جس میں آپ خلق خدا کی ہدایت کے لئے فکرمند نہ رہتے ہوں اور آہ سحر گاہی سے خالی ہو اور جس میں آپ نے بندگان غفلت شعار کی رشد و ہدایت اور نجات کے لئے دُعائیں اور التجائیں نہ کی ہوں، لیکن اہل مکہ نے اپنے دلوں کے دروازے آپ مقفل کر رکھے تھے اور کسی بھی طور پر حق کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں تھے، اس عرصہ میں آپ نے انفرادی ملاقاتیں بھی کیں، اجتماعی خطاب بھی فرمایا، حج کے اجتماع اور عکاظ کے میلے میں بھی تشریف لے گئے اور طائف پہنچ کر بھی زخم کھائے، چوٹیں سہیں اور اللہ کا پیام پہنچایا، لیکن کچھ برگزیدہ نفوس کو چھوڑ کر ہر طرف سے جو دو انکار کی ہی صدائیں بلند ہوتی رہیں۔

خدا نے مدینہ کے حق میں یہ بات مقدر رکھی تھی کہ مکہ میں اسلام کا جو سورج طلوع ہوا ہے، وہ مدینہ میں مہر نیم روز بن کر چمکے اور اپنی عالم تاب کرنوں سے دنیا کے کونے کونے کو ضیاء بار کرے، چنانچہ اہل مدینہ نے اسلام کے لئے اپنی آنکھیں بچھائیں اور اپنے دل پیغمبر اسلام ﷺ کے قدموں پر نثار کر دیئے، اس طرح آپ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی اور اسلام کی سربلندی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا، اہل مکہ کو یہ بات گوارا نہ تھی کہ جس پودے کو انھوں نے اپنی دانست کے مطابق اُکھاڑ پھینکا ہے، مدینہ کی خاک میں اس کی نشو و نما ہو اور وہ ایک سایہ دار درخت بن کر پھلے اور پھولے، اس لئے اب اہل مکہ نے مدینہ پر یلغار شروع کی، چنانچہ ہجرت کے دوسرے

ہی سال رمضان المبارک میں بدر کے میدان میں پہلا معرکہ ہوا، یہ عجیب منظر تھا، مسلمان صرف تین سو تیرہ تھے، ان میں بہت سے لوگوں کو ہتھیار بھی میسر نہیں تھا، سواریاں جو اس زمانہ میں جنگ کے لئے بہت اہم سمجھی جاتی تھی، اکثر لوگ اس سے بھی محروم تھے، غذاء کی بھی شدید قلت کا سامنا تھا، مجاہدین فاقہ مستی سے گذر رہے تھے، مدینہ کی آب وہوا زیادہ بہتر نہ تھی، اس لئے صحت مندی کے اعتبار سے بھی اہل مکہ ان سے فائق تھے، بلکہ وہ انصار مدینہ کو اس اعتبار سے حقیر جانتے تھے، دوسری طرف اہل مکہ کی فوج ایک ہزار افراد پر مشتمل تھی، جن میں سو سواروں کا ایک خصوصی دستہ تھا، عتبہ بن ربیعہ، قریش کے سپہ سالار اعظم تھے، ہر دن دس اونٹ کھانے کے لئے ذبح کئے جاتے تھے، گویا مادی اعتبار سے ان دونوں فوجوں میں کوئی تناسب نہ تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ سے باہر نکلے تو اپنے دو خبر رساں آگے روانہ کر دئے، جن کے ذریعہ قریش کی نقل وحرکت کی خبر آپ کو ہوتی رہتی تھی، بدر پہنچ کر حضرت خباب رضی اللہ عنہ کے مشورہ پر آپ نے آگے بڑھ کر چشمہ پر قبضہ کرلیا اور جو دوسرے کنویں تھے، اسے بیکار کر دیا، تاکہ پانی اپنے قابو میں رہے، پانی پر اگرچہ مسلمانوں کا قبضہ تھا، لیکن آپ کی رحمت عامہ نے اسے گوارہ نہیں کیا کہ اپنے جانی دشمنوں کو بھی پانی سے محروم کریں، اس لئے اہل مکہ کو بھی پانی لینے کی عام اجازت تھی، صحابہ نے غزوۂ بدر کی شب رات میں آرام کیا، لیکن امیر قافلہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری شب بارگاہ الٰہی میں دُعاء والتجا کرتے گذری، صبح ہوئی، تو لوگوں نے نماز ادا کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے بعد جہاد پر خطبہ ارشاد فرمایا، ہدایات دیں اور جنگی حکمت عملی کے مطابق فوج مرتب فرمائی، مہاجرین —— جو ساٹھ نفوس پر مشتمل تھے —— کا جھنڈا حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو دیا گیا، انصار میں سے قبیلہ خزرج کے علم بردار حضرت خباب بن منذر رضی اللہ عنہ ہوئے اور اوس میں حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو یہ شرف عطا فرمایا گیا، پھر آپ نے ان کی صفیں درست کیں۔

اس درمیان حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ اور حضرت ہذیل رضی اللہ عنہ دو صحابی آپہنچے، انھیں راستہ میں کافروں نے روکا تھا کہ تم مسلمانوں کی مدد کو جارہے ہو، انھوں نے انکار کیا

اور وعدہ کیا کہ ہم مسلمانوں کے ساتھ شریک نہیں ہوں گے، عین اس وقت جب جنگ شروع ہوا چاہتی تھی، خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، وہ شریک جہاد ہونے کو بے چین تھے، آپ ﷺ سے صورت حال عرض کی، تو آپ نے وعدہ پورا کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ ہمیں صرف اللہ کی مدد چاہیے، ادھر معرکہ کارزار گرم ہوا اور ادھر آپ خدا کی چوکھٹ پر جھک گئے، میدان جنگ کے کنارے ایک چھوٹا سا چھپر ڈال دیا گیا تھا، یہیں حضرت سعد بن معاذ شمشیر بکف کھڑے تھے، کہ اگر کوئی دشمن خدا ادھر کا رُخ کرے تو اس کا سر قلم کر دیا جائے، آپ اسی چھپر کے نیچے بارگاہ ربانی میں ہاتھ پھیلائے ہوئے ہیں، پیکر رحمت سراپا عجز و فروتنی اور خضوع و بندگی کی تصویر بنا ہوا ہے، اللہ تعالیٰ سے عرض کرتے ہیں کہ الٰہا! آپ نے جو وعدہ فرمایا تھا، اسے آج پورا فرمایئے، دُعاء میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر آج یہ چند نفوس ہلاک کر دیئے گئے تو زمین پر پھر کبھی تیری بندگی نہ ہو سکے گی، بار بار شانۂ مُبارک سے چادر گر جاتی اور آپ کو احساس تک نہ ہوتا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی اس بے تابی اور خدا کے سامنے آہ و زاری کو دیکھ کر بے چین ہوئے اور عرض کیا کہ اللہ آپ کی دُعاء کو رد نہیں فرمائے گا!

پہلے عرب کے قدیم دستور کے مطابق انفرادی مقابلے ہوئے اور مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا، پھر عام حملہ شروع ہو گیا، کفار کا بھروسہ اپنی طاقت پر تھا اور مسلمانوں کا اللہ تعالیٰ کی نصرت پر، چنانچہ فتح یاب ہوئے، ستر اہل مکہ قتل ہوئے اور اتنے ہی قید، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان قیدیوں کے ساتھ بہت ہی اکرام کا معاملہ فرمایا، صحابہ خود بھوکے رہے اور انھیں کھلایا، رخصت کرتے ہوئے آپ نے ہر ایک کو نیا جوڑا عنایت فرمایا، جو پڑھے لکھے لوگ تھے، ان کے لئے دس مسلمان بچوں کو پڑھانا فدیہ قرار دیا گیا اور جو دوسرے لوگوں سے مالی فدیہ وصول کیا گیا، یہ اسلام اور کفر کا پہلا باضابطہ معرکہ تھا، جس نے مستقبل پر گہرے اثرات ڈالے۔

بدر کے اس معرکہ میں کئی سبق آموز پہلو ہیں، جو قیامت تک مسلمانوں کے لئے نقش راہ بنے رہیں گے :

- پہلی بات یہ ہے کہ غزوۂ بدر سے پہلے طویل عرصہ آپ نے خالصۃً دعوت میں صرف

فرمایا، پھر نبوت کے پندرہویں سال یہ معرکہ جہاد گرم ہوا، اس سے معلوم ہوا کہ فطری ترتیب مسلمانوں کی دوسری اقوام کے مقابلے میں یہی ہے؛ کہ پہلے ان پر دین کی حجت تمام کرنے کی کوشش کی جائے اور تبلیغ حق میں کوئی کسر نہ چھوڑی جائے، جب حجت تمام ہونے کے باوجود کافروں کی طرف سے سرتابی پیش آتی ہے، تو مسلمانوں کی طرف نصرتِ الٰہی متوجہ ہوتی ہے۔

- دوسرے: اس جہاد سے صحابہ کے جذبہ قربانی اور فداکاری وجاں نثاری کی تصویر بھی سامنے آتی ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ قوم نبی اسرائیل لاکھوں کی تعداد میں تھی، پھر بھی اس نے قوم عمالقہ سے جہاد کرنے سے انکار کر دیا تھا اور گستاخانہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: آپ اور آپ کے رب قتال کریں، ہم یہیں بیٹھیں گے، فاذهب انت وربک فقاتلا إنا هٰهنا قاعدون (المائدہ:۲۴) —— لیکن رسول للہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کا اثر تھا کہ صحابہ نے تعداد کی کمی اور ظاہری اسباب نہ ہونے کے باوجود آپ کی آواز پر لبیک کہا، بلکہ عرض کیا کہ اگر آپ ہمیں سمندر میں کود جانے کا حکم دیں، تو ہمیں اس سے بھی عذر نہ ہوگا، اس سے صحابہ کی عظمت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نتیجہ خیز اور اثر انگیز تربیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

- آپ نے غزوۂ بدر سے پہلے صفیں آراستہ کیں، فوج کو مختلف دستوں میں تقسیم کیا اور ان کے الگ الگ کمانڈر مقرر کئے، دشمن کی نقل وحرکت جاننے کے لئے خفیہ خبر رساں مقرر کئے، پانی کے چشموں پر پیش قدمی کر کے قبضہ فرمایا، یہ تمام باتیں تدبیر کے قبیل سے ہیں، پس معلوم ہوا کہ ظاہری اسباب سے آنکھیں موند لینا، تدبیر سے تعلق توڑ لینا اور صرف تقدیر پر تکیہ کر لینا توکل نہیں، بلکہ بے عملی اور ناسمجھی ہے، سنت یہ ہے کہ ظاہری تدابیر اور اسباب کو اختیار کرتے ہوئے پھر نتیجہ خدا پر چھوڑ دیا جائے اور خدا کا جو بھی فیصلہ ہو اس پر راضی رہا جائے۔

- عین معرکہ قتال کے وقت دو رفقاء حاضر خدمت ہوئے، اس وقت مسلمان قلت تعداد سے دوچار تھے اور ایک ایک فرد کی اہمیت تھی، لیکن اس کے باوجود آپ نے ایفاءِ عہد کو ترجیح دی اور مسلمانوں کے ساتھ شریک جنگ نہ ہونے کا جو وعدہ ان لوگوں نے کیا تھا، آپ نے اس پر قائم رہنے کا حکم دیا، اس سے ایفاء عہد کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، کہ ایسے نازک

وقت میں بھی آپ نے اس سے پہلو تہی نہیں برتی۔

- غزوۂ بدر کے موقع سے ایک طرف فوجیں آمنے سامنے ہیں اور دوسری طرف آپ کی پیشانی خدا کے سامنے جھکی ہوئی ہے اور دست دُعاء بارگاہِ ربانی میں اٹھا ہوا ہے، یہ اس پورے واقعہ کی اصل روح ہے، کہ مؤمن کا اصل بھروسہ خدا کی طاقت پر ہونا چاہئے نہ کہ اپنی طاقت پر، وہ قوت بازو سے فتح نہیں پاتا، بلکہ نصرت الٰہی سے فتح یاب ہوتا ہے، اس کا اصل ہتھیار دُعاء ہے اور یہی ہتھیار ہے جو اَن ہونی کو ہونی اور ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے۔

- ان واقعات سے ایک سبق دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک اور فیاضی کا ملتا ہے، میدان جنگ میں پانی کے چشمے آپ کے قابو میں تھے، اگر آپ دشمنوں کو پانی لینے سے روک دیتے تو ان کی جنگی قوت کمزور پڑ سکتی تھی، لیکن آپ نے ان پر پانی بند نہیں فرمایا، جو لوگ قید ہو کر آئے، یہ وہی تھے جنھوں نے مکہ میں آپ کو تکلیف پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی، لیکن آپ نے ان کے ساتھ حسن سلوک اور مدارات کا معاملہ فرمایا، مسلمانوں نے خود بھوکے رہ کر انھیں کھلایا اور باعزت طریقہ پر نئے جوڑوں میں انھیں رخصت کیا —— اس سے معلوم ہوا کہ دشمنوں کے ساتھ بھی حسن سلوک اور بدخواہوں کے ساتھ بھی خیر خواہی اسوۂ نبوی ہے، یہ کافی نہیں کہ جو ہمارے ساتھ بہتر سلوک کرے ہم بھی اس کے ساتھ بہتر سلوک کریں؛ بلکہ اسلامی کردار یہ ہے کہ جو پتھر پھینکے اس پر پھول برسایا جائے اور جو کانٹے بچھائے اس کے لئے آنکھیں فرش راہ کی جائیں۔

- اہل مکہ میں جو لوگ پڑھے لکھے تھے، تعلیم کو آپ نے ان کا فدیہ مقرر فرمایا، اس سے اسلام میں علم کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، کہ علم تو دشمنوں سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الحکمة ضالة المؤمن کہ حکمت مومن کا گم شدہ مال ہے، جہاں مل جائے حاصل کیا جائے اور اس میں کسی ذہنی تحفظ سے کام نہ لیا جائے۔

○ ○ ○ ○

غزوۂ اُحد — عبرت وموعظت کے پہلو

ہجرت کے دوسرے سال بدر کے میدان میں مسلمانوں اور مشرکین مکہ کے درمیان پہلا معرکہ ہوا، اس نے پورے مکہ میں نہ صرف رنج والم کی فضا پیدا کردی؛ بلکہ انھیں اس شکست فاش پر بہت ہی غضبناک بھی بنا دیا؛ کیوں کہ اس جنگ کی آگ میں مکہ کے چوٹی کے سردار خاکستر بن چکے تھے، ابوسفیان کے تجارتی قافلہ نے —— جو زبردست تجارتی فوائد کے ساتھ شام سے واپس آیا تھا اور مسلمانوں کی گرفت سے بچ نکلا تھا —— اپنا کا پورا نفع قریش مکہ کے باہمی مشورہ سے جنگی تیاری کے لئے وقف کردیا گیا، اس طرح زبردست تیاری کے ساتھ تین ہزار سپاہی مدینہ کی طرف روانہ ہوئے، ان کے ہمراہ تین ہزار اونٹ، دوسو گھوڑے اور سات سو زرہ پوش جنگجو تھے، ابوسفیان کو سپہ سالار مقرر کیا گیا، قریش کی پندرہ معزز خواتین —— جن کے قریبی رشتہ دار بدر کی لڑائی میں مارے گئے تھے —— بھی فوجیوں کو غیرت دلانے اور ان کے جوش کو دوآتشہ کرنے کے لئے ساتھ نکلیں۔

ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ —— جو مسلمان ہوچکے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حسب منشاء انھوں نے اپنے ایمان لانے کو خفیہ رکھا تھا —— نے ایک تیز رفتار قاصد کے ذریعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس تیاری کی اطلاع کردی اور بنوغفار کے اس قاصد کو تاکید کردی کہ تین دنوں کے اندر آپ کے پاس خط پہنچ جائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت مسجد قبا میں تشریف فرما تھے، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے خط پڑھ کر سنایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا اور تاکید فرمائی کہ ابھی اس بات کو خفیہ رکھا جائے؛ کیوں کہ قریش، یہود اور منافقین کے ساتھ رابطہ میں تھے اور اندیشہ تھا کہ اگر جوابی جنگی حکمت عملی کو راز میں نہیں رکھا گیا تو اس سے نقصان ہوسکتا ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انس بن فضالہ اور مونس بن فضالہ رضی اللہ عنہما دونوں کو جاسوسی کے لئے روانہ فرمایا، یہ عقیق پہنچ کر اہل مکہ کے لشکر میں شامل ہوگئے اور مدینہ کے قریب پہنچنے کے بعد لشکر سے الگ

ہوکر بارگاہ نبوی میں لشکر کی تفصیلات پیش کر دیں، آپ ﷺ نے مزید تحقیق کے لئے حضرت حباب بن منذر رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا، جنھوں نے اس فوج کی تعداد اور جنگ کی تیاریوں کے بارے میں پوری تفصیل سے مطلع کیا، نیز امکانی خطرات کے تحت سعد بن معاذ، سعد بن عبادہ اور اسید بن حضیر رضی اللہ عنہم کو کاشانۂ نبوت اور مسجد نبوی پر پہرہ دار مقرر کیا گیا۔

پھر آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے جنگ کے بارے میں مشورہ کیا، بعض حضرات کا مشورہ تھا کہ مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کی جائے، اس گروہ میں نوجوانوں کے علاوہ سید الشہداء حضرت حمزہ اور حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہم جیسے بزرگ صحابہ بھی تھے، دوسری رائے یہ تھی کہ مدینہ میں رہ کر مقابلہ کیا جائے، منافقین کے سردار عبداللہ بن ابی کی بھی یہی رائے تھی اور اس کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا میلان بھی تھا، آپ ﷺ نے مشورہ تو کیا؛ لیکن فوری طور پر اپنے فیصلہ کا اعلان نہیں فرمایا؛ بلکہ جمعہ کے بعد جہاد پر ترغیبی خطبہ ارشاد فرمایا اور اس کے لئے تیاری کا حکم دیا، عصر کے بعد آپ حجرۂ اقدس میں تشریف لے گئے اور ہتھیار پہنا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی ہتھیار پہننے میں آپ ﷺ کی مدد کی، جب آپ ﷺ ہتھیار بند باہر تشریف لائے تو بعض صحابہ کو ندامت ہوئی اور انھوں نے عرض کیا کہ ہم نے آپ ﷺ کے منشاء کے خلاف مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ کرنے پر اصرار کیا؛ اس لئے ہمیں معاف کر دیں اور جو مناسب سمجھیں قدم اٹھائیں، آپ ﷺ نے فرمایا: کسی نبی کے لئے یہ بات روا نہیں ہے کہ وہ ہتھیار پہن کر پھر اُتار دے؛ تا آں کہ اللہ تعالیٰ اس کے اور دشمنوں کے درمیان فیصلہ نہ کر دے؛ اس لئے اب چلو، جو کہوں اس پر عمل کرو اور ثابت قدم رہو۔

آپ ﷺ نے تین نیزے طلب کئے، تینوں پر کپڑا باندھ کر جھنڈا بنایا گیا، قبیلۂ خزرج کا جھنڈا حضرت حباب ابن منذر رضی اللہ عنہ کو، قبیلۂ اوس کا جھنڈا حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کو اور مرکزی علم قریش میں سے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو حوالہ فرمایا، حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کا تعلق بنو عبدالدار سے تھا اور مکہ میں اسی قبیلہ کو علمبردار ہونے کا اعزاز دیا جاتا تھا، آپ نے اس کو قائم رکھا، آپ ﷺ نے آج سر مبارک پر خُود پہن رکھی تھی اور جسم پر دو دو زرہیں

تھیں، کاندھے پر کمان ڈالی، ہاتھ میں نیزہ لیا، گھوڑے پر سوار ہوئے، دائیں بائیں حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی مصاحبت میں آگے بڑھے، یہ دونوں حضرات بھی زرہ پوش تھے اور گھوڑے پر سوار تھے، اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر کو کوچ کرنے کا حکم فرمایا۔

مدینہ کی سرحد سے باہر نکلے تو ایک نظر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوج پر ڈالی، ان میں سترہ لڑکے ایسے پائے گئے، جن کی عمر چودہ سال سے کم تھی، انھیں آپ نے واپس کردیا، ان میں سے حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کو تیر اندازی کی خصوصی صلاحیت کی وجہ سے ساتھ رکھا گیا، سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ ان کے ہم عمر تھے، انھوں نے کہا کہ ہم کشتی میں رافع کو زیر کردیتے ہیں؛ اس لئے ہمیں بھی اجازت دی جائے، دونوں میں کشتی کرائی گئی اور واقعی حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ غالب رہے؛ اس لئے انھیں بھی شریک کرلیا گیا، یہاں کچھ انجانے چہرے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نظر آئے، تحقیق پر معلوم ہوا کہ یہ یہودی ہیں، جو عبداللہ بن ابی کے ساتھ آئے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں واپس فرمادیا؛ کیوں کہ یہ کسی سازش کا حصہ بن سکتے تھے، یہیں رات گذاری گئی، پچاس منتخب مجاہدین نے پہرہ داری کی، محمد بن سلمہ انصاری رضی اللہ عنہ ان پہرہ داروں پر نگراں مقرر ہوئے اور جس خیمہ میں شمع نبوت کو آرام کرنا تھا، اس پر ذکوان بن عبداللہ رضی اللہ عنہ پہرہ دار مقرر ہوئے، ابھی رات ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ مجاہدین کو کوچ کرنے کا حکم دیا گیا، اُحد کے بالکل قریب 'قنطرہ' نامی مقام پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان دی اور مسلمان بارگاہِ الٰہی میں سجدہ ریز ہوگئے، دشمنانِ اسلام دور سے یہ منظر دیکھ رہے تھے، یہیں سے عبداللہ بن ابی اپنے تین سو ساتھیوں کے ساتھ الگ ہوگیا کہ چوں کہ مدینہ میں رہ کر مقابلہ کرنے کے سلسلہ میں میری رائے نہیں مانی گئی؛ اس لئے ہم ساتھ نہیں رہیں گے اور اللہ نے منافقین کے اس سازشی گروہ سے اس فوج کی حفاظت فرمائی۔

نمازِ فجر کے بعد مسلمانوں کا لشکر تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے جنگی حکمت عملی کی رعایت کے ساتھ ٹھکانہ پر قابض ہوگیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی فوجیں اس طرح آراستہ کیں کہ دائیں طرف اُحد کا پہاڑ تھا، بائیں طرف وادی قناۃ کا عمودی کنارہ تھا، جو جبل رماۃ تک پہنچتا تھا،

پیچھے کی طرف آپ ﷺ نے جبل رماۃ کو رکھا تھا، یہ ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی، جسے "جبل عینین" یعنی دو چشموں والا پہاڑ کہا جاتا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ اُحد میں اسی پہاڑی پر تیر اندازوں کا دستہ مقرر فرمایا تھا، اس مناسبت سے بعد میں اس کا نام 'جبل رماۃ' پڑ گیا، اس طرح تین جہتوں سے مسلمانوں کی فوج محفوظ تھی اور صرف سامنے کی جانب سے ہی قریش حملہ آور ہو سکتے تھے، اس میدان کی چوڑائی چار سو گز سے زیادہ نہیں تھی، اس طرح کم تعداد کے باوجود دشمن کی بڑی تعداد کا مقابلہ آسان تھا، یہیں صفیں آراستہ کی گئیں، چودہ جانبازوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لئے رکھا گیا اور آپ ﷺ نے پچاس ماہر تیر اندازوں کو جبل رماۃ پر رکھا تھا؛ تاکہ وہ اس پہاڑی پر سے دشمن کی فوج پر تیر سے حملہ بھی کر سکیں اور اگر کوئی فوجی ٹکڑی مسلمانوں کی پشت پر حملہ آور ہونا چاہے تو وہ اس کو روک سکیں، نیز آپ ﷺ نے ان پر حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر کرتے ہوئے نصیحت کر دی تھی کہ چاہے ہماری لاشوں پر چیل اور پرندے گرنے لگیں، پھر بھی وہ اپنی جگہ نہ چھوڑیں۔

آپ ﷺ نے اپنی فوج کو پانچ دستوں پر تقسیم فرمایا اور ہر ایک پر الگ الگ کمانڈر متعین کیا، نیز ایک محفوظ دستہ بھی رکھا؛ تاکہ بوقت ضرورت کام آئے، دشمنوں کو صف بندی کا شعور نہیں تھا؛ لیکن غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی صف بندی کو دیکھتے ہوئے انھوں نے بھی مختلف دستے بنائے، معرکہ عربوں کے اس قدیم طریقہ کے مطابق شروع ہوا کہ کفار مکہ کا ایک فوجی علم کو اٹھائے ہوئے باہر نکلتا اور مسلمانوں کو دعوت مبارزت دیتا، سب سے پہلے طلحہ بن ابی طلحہ نے مقابلہ کی دعوت دی، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی تیغ آبدار سے دو ہی ضرب میں اس کے ٹکڑے کر دیئے، بنوعبدالدار کے مختلف نمائندے جھنڈا تھام کر نکلتے، مسلمانوں سے ان کا مقابلہ ہوتا، یہاں تک کہ بائیس دشمنانِ اسلام اس انفرادی مقابلہ میں واصل جہنم ہوئے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عبدالرحمٰن بھی کفار مکہ کے ساتھ تھے، انھوں نے جب للکارا تو خود حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی شمشیر سونت کر مقابلہ میں آگئے، یہاں تک کہ اہل مکہ شکست خوردہ فوج کی طرح بکھرنے لگے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجاہدین میں جوش پیدا کرنے کے لئے جنگ کے آغاز ہی پر اپنی تلوار لہراتے ہوئے دریافت کیا ''کون ہے، جو اسے لے گا اور اس کا حق ادا کرے گا''؟ حضرت زبیر بن عوام، حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہم نیز دوسرے سرفروشانِ اسلام آگے بڑھے؛ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ روکے رکھا، جب تیسری بار اس جملہ کے ساتھ آپ نے اپنا ہاتھ لہرایا تو مجاہدین کی رگ حمیت، جذبۂ جاں نثاری کے اوجِ کمال پر پہنچ گئی، حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اللہ کے رسول! اس کا کیا حق ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ اس سے دشمن کے منھ پر وار کرو، کوئی کافر اس سے بچنے نہ پائے اور کوئی مسلمان اس سے مارا نہ جائے، حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ میں اس کا حق ادا کروں گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں تلوار عنایت فرمائی، حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ کے لئے یہ شمشیر آبدار ہی نہیں تھیں؛ بلکہ تمغۂ افتخار بھی تھی، انھوں نے اپنے سر پر سرخ کپڑے کی پٹی باندھی، پورے ولولے کے ساتھ رجزیہ اشعار پڑھتے ہوئے دشمنوں پر ٹوٹ پڑے اور اپنے مقدر پر اکڑ اکڑ کر چلنے لگے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خدا کو یہ چال پسند نہیں، مگر میدانِ جہاد میں یہ خوب ہے! حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے اس تلوار کی ایسی لاج رکھی کہ دشمن کی صف میں گھس کر آخری صف پار کر کے آگے نکل گئے، یہاں تک جب آپ رضی اللہ عنہ نے تلوار اٹھائی تو ایک سہمی ہوئی چیخ آئی کہ میں ایک عورت ہوں، دیکھا تو ابوسفیان کی بیوی ہندہ تھی، حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ ہاتھ روک لیا کہ شمشیر نبوی کے احترام کے خلاف ہے کہ اسے ایک عورت پر چلایا جائے۔

مسلمانوں کے غلبہ کو دیکھ کر جبل رماۃ کے تیر انداز مالِ غنیمت لوٹنے کے لئے ٹوٹ پڑے، حضرت عبداللہ ابن جبیر رضی اللہ عنہ نے بہت روکا، مگر لوگوں نے مانا نہیں، یہاں تک کہ صرف دس افراد ان کے ساتھ رہ گئے، ابوسفیان کے اشارہ پر خالد بن الولید نے اپنے دستہ کے ساتھ پیچھے سے حملہ کیا اور مجاہدین دونوں طرف سے دشمنوں کے درمیان گھر گئے، جنگ کا یہ آخری مرحلہ بڑا صبر آزما ثابت ہوا، بہت سے مجاہدین نے جام شہادت نوش کیا، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نہ صرف شہید ہوئے؛ بلکہ ہندہ نے مثلہ بھی کیا، ان کے اعضاء کا ہار بنا کر پہنا اور کلیجہ چبانے کی

کوشش کی ، مگر نگل نہ سکی ، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بار بار یلغار ہوتی رہی ، حضرت مصعب بن عمیر ، حضرت طلحہ بن عبداللہ حضرت ابودجانہ اور حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح اپنے حصار میں لے لیا اور تیروں نیزوں اور تلواروں کے زخم کھائے کہ گویا ان کے بدن گوشت پوست کے نہ ہوں ؛ بلکہ آہن وفولاد کے ہوں اور جاں نثاری کا حق ادا کر دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دندانِ مبارک شہید ہو گئے، پیشانی پر ایک شخص نے پتھر مارا، جس سے چہرہ لہولہان ہو گیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر ارشاد فرمایا کہ وہ قوم کیوں کر فلاح پاسکتی ہے، جو اپنے نبی کو خون سے رنگین کر دے؛ حالاں کہ وہ اسے اللہ کی طرف بلا رہا ہے؟ اس موقع پر آیت نازل ہوئی، **لیس لک من الأمر شئ أو یتوب علیھم أو یعذبھم ، فانھم ظالمون** ، (آل عمران: ۱۲۸) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی اختیار نہیں ہے، اللہ چاہے تو ان کی توبہ قبول کر لے یا عذاب دے کہ وہ ظلم کرنے والے ہیں —— حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر دُعاء فرمائی: الٰہا! انھیں معاف کر دے، کہ مجھے پہچانتے نہیں —— یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی خبر بھی مشہور ہو گئی، جس نے مجاہدین کو اور بھی مایوس کر دیا۔

آخر معرکہ ختم ہوا ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم کی مدد سے ، پہاڑ کی اونچائی پر ایک غار میں پہنچ گئے ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے اوپر چڑھنے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کی ، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ اور کچھ اور صحابہ رضی اللہ عنہم بھی یہیں آگئے ، زخم دھویا گیا، مگر خون بند نہ ہوتا تھا، آخر خواتین جنت کی سردار حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی پہنچ گئیں اور حصیر کو جلا کر اس کی راکھ سے زخموں کو بھرا، محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ صاف پانی لائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے نوش فرمایا، اس طرح معرکہ ختم ہوا ، ابوسفیان اپنے کیمپ میں گیا ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ابوسفیان پر نظر رکھے، اگر ابوسفیان اونٹ پر سوار ہو تو اس کا مطلب ہے کہ وہ مکہ واپس ہو رہا ہے، اور اگر گھوڑے پر سوار ہو تو اس کا رُخ مدینہ کی طرف ہوگا، ایسی شکل میں ہم ضرور اس کا مقابلہ کریں گے۔

یہ جنگ مسلمانوں کے لئے ایک امتحان تھی ، صبر کا بھی امتحان اور جاں نثاری کا بھی

امتحان، اوراس میں کوئی شبہ نہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اس امتحان میں پورے اترے، انھوں نے ایسی جاں نثاری کا ثبوت دیا کہ تاریخ میں شاید ہی اس کی کوئی مثال مل سکے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس شان سے نذرانۂ زندگی پیش کیا کہ گویا خدا کی راہ میں مرنے سے بڑھ کر کوئی چیز محبوب نہیں، جنگ ختم ہونے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ کوئی سعد ابن ربیع رضی اللہ عنہ کی خبر لائے، حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو تلاش کیا گیا تو وہ لاشوں کے درمیان آخری سانس لے رہے تھے اور جسم پر نیزہ کے بارہ زخم تھے، حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے آخری پیغام انصار کے لئے دیا کہ اگر خدانخواستہ آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہید کردیئے گئے اور تم میں کا ایک شخص بھی زندہ رہا تو تم خدا کے یہاں منھ دکھانے کے لائق نہیں رہوگے، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کہلوا بھیجا اور روح پرواز کرگئی، حضرت عمرو بن جموح انصاری رضی اللہ عنہ کی بیوی حضرت ہند رضی اللہ عنہا کے شوہر، بھائی، بیٹا، تینوں شہید ہوگئے، شہادت کی ہر خبر پر بے قرار ہوکر پوچھتیں کہ آقا صلی اللہ علیہ وسلم کیسے ہیں؟ یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھایا گیا تو کہنے لگیں: ''اگر آپ سلامت ہیں تو ہر مصیبت ہیچ ہے''! بعض انصاری خواتین سے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے صاحبزادہ کی شہادت پر تعزیت کی تو انھوں نے کہا: ''کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں تہنیت (مبارکباد) دیجئے، نہ کہ تعزیت''۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش دیکھی تو دل بے قرار ہوگیا، اتنا روئے کہ ہچکی بندھ گئی اور جوش میں فرمایا کہ جیسے انھوں نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا مثلہ کیا ہے، میں اس کے بدلہ ستر کافروں کا مثلہ کروں گا؛ لیکن اسی وقت سورۂ نحل کی آیت، **وإن عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم به**، (النحل:۱۲۶) نازل ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بات واپس لی اور فرمایا کہ حمزہ سید الشہداء ہیں، چنانچہ سب سے پہلے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ پر نماز جنازہ پڑھی، پھر ہر شہید کا جنازہ ان کے ساتھ رکھا گیا، اس طرح ستر سے زیادہ دفعہ آپ رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ پڑھی گئی، حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ —— جن کے ہاتھوں میں مسلمانوں کا جھنڈا تھا —— نے بھی جام شہادت نوش فرمایا، ان کے بعد ان کے بھائی ابوالروم رضی اللہ عنہ یا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جھنڈا عطا ہوا، اس غزوہ میں ستر سے زیادہ صحابہ رضی اللہ عنہم شہید ہوئے اور سوائے حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کے، سبھوں

کی لاش کا مثلہ کیا گیا، آخر ہفتہ کے دن تین یا سات شوال کو مغرب کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجاہدین کے ساتھ مدینہ واپس آئے، سرفروشانِ اسلام گو زخم سے چور چور تھے؛ لیکن پھر بھی انھوں نے جاگ کر پوری رات مدینہ کا پہرہ دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی کہ قریش مکہ واپس ہو کر مدینہ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، آپ ﷺ نے صبح میں اعلان کیا کہ قریش مکہ کی فوج کا تعاقب کرنا ہے، چنانچہ جھنڈا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو عطا ہوا اور مجاہدین مدینہ سے نکل کھڑے ہوئے، آٹھ میل تک تعاقب کرتے ہوئے حمراء الاسد میں یہ لشکر خیمہ زن ہوا، مسلمانوں کے اس ولولہ کو دیکھ کر اہل مکہ پر رعب بیٹھ گیا اور وہ واپس ہو گئے۔

قرآن مجید میں اس غزوہ کا تفصیل سے ذکر آیا ہے اور متعدد آیتیں اس بارے میں نازل ہوئی ہیں، اسی لئے غزوۂ احد میں عبرت وموعظت کی بہت سی جہتیں ہیں :

○ صالحین اور نیکوکاروں پر بھی اللہ کی طرف سے آزمائشیں آتی ہیں، قرآن مجید میں بہت سے انبیاء کا ذکر آیا ہے، جو ابتلاؤں اور آزمائشوں سے گذرے ہیں، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مختلف آزمائشوں سے گذارا گیا ہے؛ اس لئے مسلمانوں کو دین کی راہ میں آنے والی آزمائشوں سے ہمت نہ ہارنا چاہئے اور صبر و استقامت کا ثبوت دینا چاہئے، مادی فتح وشکست حق اور باطل ہونے کی دلیل نہیں ہے؛ بلکہ اللہ اور اس کے رسول کی خوشنودی کو پانا اصل کامیابی اور خوشنودی سے محروم رہنا اصل ناکامی ہے۔

○ اسلام کے دفاع کے لئے ظاہری وسائل کو اختیار کرنا اور خوش تدبیری سے کام لینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، آپ ﷺ نے جنگ کے لئے جو صف آرائی کی اور جس طرح مجاہدین اسلام کے لئے جگہ کا انتخاب کیا، وہ زبردست جنگی حکمت عملی کا نمونہ ہے، یہ حکمت عملی تیغ وشمشیر ہی کی جنگ میں مطلوب نہیں ہے؛ بلکہ فکری اور تشہیری جنگ میں بھی مطلوب ہے۔

○ حب رسول اللہ ﷺ کا اصل مظہر امتحان کے مواقع پر جاں نثاری ہے، زبان سے عشق ومحبت کے دعوے، بے روح دعوے ہیں، اگر ان پر عمل کی شہادت نہ ہو، صحابہ رضی اللہ عنہم کی

شان یہی تھی کہ ان کی زبان پر دعوے نہیں ہوتے تھے؛ لیکن وہ اپنی رگ گلو کا آخری قطرہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نچھاور کرنے کو تیار رہتے تھے۔

○ مسلمانوں کا تعلق ہر حال میں اللہ سے قائم رہنا چاہئے، آپ ﷺ نے جہاد شروع ہونے سے پہلے بھی فجر کی نماز پڑھی اور جب پہاڑ کی اونچائی پر غار کی پناہ لی تو اس وقت بھی باوجود زخم سے چور ہونے کے نماز ادا فرمائی، یہی جذبۂ خود سپردگی ہے، جو بزم سے رزم تک مسلمانوں کا اصل سرمایہ ہے۔

○ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرکزی جھنڈا قریش کی قدیم روایت کے مطابق بنو عبدالدار کے ایک فرد حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو عنایت فرمایا، اس میں سبق ہے کہ جو روایت چلی آرہی ہو، اگر اس پر عمل کرنے میں کوئی شرعی قباحت نہ ہو تو اسے باقی رکھا جاسکتا ہے، بلاوجہ ہر روایت کو توڑ دینا معقول بات نہیں ہے۔

○ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو ہمیشہ اپنی اخلاقی سطح بلند رکھنی چاہئے، مکہ میں مشرکین قتل کیے گئے؛ لیکن کسی کا مثلہ نہیں کیا گیا، ہندہ حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ کی تلوار کی زد میں آچکی تھیں؛ لیکن ان پر وار نہیں کیا گیا، جب کہ تقریباً تمام ہی شہداءِ اُحد کا مشرکین نے مثلہ کیا اور جب فرط جذبات میں زبانِ مبارک سے مثلہ کرنے کی بات نکل گئی تو فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ کی گئی، گو اس میں برابر کا بدلہ لینے کی اجازت دی گئی ہے؛ لیکن مسلمانوں نے کبھی بھی جوابی طور پر بھی ایسی ناشائستہ حرکت نہیں کی ہے۔

○ داعی کے دل میں ہمیشہ مدعو کی محبت ہونی چاہئے، خواہ وہ ظلم وزیادتی میں کتنا بھی آگے بڑھ جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کی ان ظالمانہ حرکتوں کے باوجود اہل مکہ کے لئے دُعاء ہی فرمائی ہے کہ یہ مقام نبوت سے ناآشنا ہیں، انھیں معاف کردیا جائے۔

○ داعی کو کبھی بھی مدعو سے نا اُمید اور مایوس نہیں ہونا چاہئے، خواہ بہ ظاہر وہ کتنی ہی سخت دلی اور شقاوت قلبی کا ثبوت دے، چنانچہ اس جنگ میں، جو سردارانِ قریش مسلمانوں کے خلاف پیش پیش تھے اور فتح مکہ تک زندہ رہے، ان سب نے اسلام کے سامنے سر تسلیم خم کیا،

یہاں تک کہ ابوسفیان، ہندہ اور صفوان بن امیہ نے بھی۔

○ اس غزوہ میں نوعمر بچوں کو بہ اصرار واپس بھیجنا پڑا اور بہت سی خواتین وہ تھیں، جو جذبۂ جاں نثاری کے ساتھ ہم رکاب تھیں، یہاں تک کہ حضرت اُم عمارہؓ نے تو باضابطہ جہاد میں حصہ لیا، ظاہر ہے کہ یہ تربیت کا نتیجہ تھا، صحابہ رضی اللہ عنہم خواتین اور بچوں کی ایسی تربیت فرماتے تھے کہ وہ دین کے لئے ہر طرح کی قربانی میں مردوں اور بڑوں کے شانہ بہ شانہ رہتی تھیں، جب تک گھر کے تمام لوگوں میں دینی مزاج پیدا نہ ہو، مثالی اسلامی معاشرہ نہیں بن سکتا۔

○ اس غزوہ کا سب سے اہم سبق یہ ہے کہ مسلمانوں کی کامیابی و ناکامی اصل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع واطاعت میں مضمر ہے، اس جنگ میں مسلمانوں کو جو نقصان اٹھانا پڑا، بہ ظاہر اس کا سبب یہی تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے 'جبل رماۃ' پر جس دستہ کو مقرر فرمایا تھا اور جس سے کہا گیا تھا کہ وہ کسی بھی صورت میں اپنی جگہ سے ہٹے نہیں، وہ اپنی جگہ سے ہٹ گئے، اگر یہ صورتِ حال پیش نہیں آئی ہوتی تو شاید مسلمان اس نقصان سے دوچار نہیں ہوتے، اسی لئے قیامت تک مسلمانوں کی کامیابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت واتباع میں مضمر ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع سے گریز کر کے یہ اُمت فلاح نہیں پاسکتی، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موجود ہوتے ہوئے قدسی صفت صحابہ رضی اللہ عنہم کی لغزش کو بھی قابل عفو نہیں سمجھا گیا تو دوسروں کا کیا ذکر؟

○ ○ ○ ○

غزوۂ احزاب اور موجودہ عالمی حالات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا ایک اہم واقعہ غزوۂ احزاب کا ہے، اہل مکہ کو مسلمانوں کا مدینہ میں سکھ چین کے ساتھ رہنا کسی طرح گوارا نہیں تھا، وہ بار بار اس چھوٹی سی نو آباد بستی پر یلغار کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح اس کی اینٹ سے اینٹ بج جائے، ہجرت کے دوسرے ہی سال انھوں نے بدر کے میدان میں کارزار گرم کیا، تیسرے سال احد کے میدان میں معرکہ گرم کیا، جس میں ستر مسلمان شہید ہوئے، چوتھے سال پھر اہل مکہ کی دعوت پر دوبارہ جنگ کی تیاری تھی، لیکن مسلمانوں کی جرأت دیکھ کر انھیں آگے بڑھنے کی ہمت نہیں ہوئی، اس سازش کا اصل نقشہ بنو نضیر کے یہودیوں نے بنایا، جنھیں ان کی مسلسل سازشوں کی وجہ سے خیبر کی طرف جلاوطن کر دیا گیا تھا، یہودیوں نے قریش مکہ اور قبیلہ بنی غطفان کو تیار کیا، بنو اسد غطفان کے اور بنو سلیم قریش کے حلیف تھے اور بنو سعد سے خود یہود کا معاہدہ تھا، اس طرح یہود اور تمام قبائل عرب مل کر مدینہ کی طرف سے بڑھے، مدینہ میں اس وقت مسلمانوں کی تعداد کل تین، ساڑھے تین ہزار کے قریب تھی جب کہ یہ لشکر جرار دس ہزار آزمودہ کار فوجیوں پر مشتمل تھا، سردارِ مکہ ابوسفیان بن حرب اس فوج کے سپہ سالارِ اعظم تھے، ادھر مسلمانوں کی صف میں منافقین بھی گھسے ہوئے تھے، جو عین جنگ کے وقت آ آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے رخصت ہونے کی اجازت چاہتے تھے اور گویا یہ بھی نفسیاتی طور پر دشمن فوج کو تقویت پہنچا رہے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا، تو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ خندق کھودی جائے، مدینہ میں تین طرف سے مکانات اور کھجور کے گھنے باغات تھے، جو فصیل شہر کا کام کرتے تھے، صرف شام کی سمت سے کھلا ہوا تھا، خندق کھودی جاتی تو اس جانب سے بھی محفوظ ہو جاتا، اس لئے اس رائے کو سبھوں نے پسند کیا، خود رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم نے خندق کی حدود قائم فرمائیں اور خط کھینچ کر دس دس آدمی پر دس دس گز زمین تقسیم کردی، خندقیں اتنی گہری کھودی گئیں کہ تری نکل آئی، یہ عجیب وقت تھا، جاڑے کا موسم، سرد ہوائیں، مسلمانوں پر کئی دنوں کے فاقے، لیکن جوش جنوں میں کوئی کمی نہیں، جاں نثارانِ اسلام خندقیں کھودتے، مٹی اُٹھا اُٹھا کر لاتے اور یہ شعر پڑھتے جاتے :

نَحْنُ الَّذِيْنَ بَايَعُوْا مُحَمَّداً

عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِيْنَا أَبَداً

ہم ہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے محمد ﷺ کے دست مبارک پر

جب تک جان میں جان ہے، جہاد کی بیعت کی ہے

آقا صلی اللہ علیہ وسلم غلاموں کے اس جوش وطرب کا جواب اس طرح دیتے :

اَللّٰهُمَّ لَاعَيْشَ إِلَّا عَيْشَ الْآخِرَة

فَاغْفِرْ لِلْاَنْصَارِ وَالْمُهَاجِرَة

اے اللہ ! زندگی تو آخرت کی زندگی ہے

پس انصار و مہاجرین کی مغفرت فرما دیجئے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی بنفس نفیس اس خندق کو کھودنے میں شریک تھے، راوی کہتے ہیں کہ شکم مبارک گرد آلود تھی، صحابہ جوش سے کام کرتے اور رفقاء کے حوصلے کو بلند کرنے کے لئے رجز یہ اشعار بھی پڑھتے جاتے، جن کا ترجمہ اس طرح ہے :

خدا کی قسم ! اگر اللہ کی توفیق نہ ہوتی، تو نہ ہدایت پاتے، نہ صدقہ دیتے اور نہ نماز پڑھتے، خداوندا! ہم پر سکون نازل فرما اور مقابلہ کے وقت ہمیں ثابت قدم رکھ، ان لوگوں نے ہم پر بڑی زیادتی کی ہے، جب کبھی یہ فتنہ میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں تو ہم اس کو قبول نہیں کرتے۔

خندق میں ایک سخت چٹان آگئی، جو کسی سے توڑے نہ ٹوٹتی تھی، آپ ﷺ نے بہ نفس

نفیس وار فرمایا اور وہ ریزہ ریزہ ہوگئی، چھ دن میں یہ وسیع و عریض خندق تیار ہوئی، خندق مکمل ہوئی اور اعدائے اسلام کا لشکر آ پہنچا، بیس دنوں تک مدینہ کا محاصرہ جاری رہا، زیادہ تر دونوں طرف سے تیروں کا تبادلہ ہوتا، ایک دن اس جگہ سے دشمن فوج نے آگے بڑھنے کی کوشش کی، جہاں خندق کی چوڑائی نسبتاً کم تھی، عرب کے چند مانے ہوئے بہادروں نے خندق کو عبور بھی کر لیا ،لیکن مسلمانوں کی ہمت مردانہ کے مقابلہ ٹھہر نہیں سکے، دو نے تو راہ فرار اختیار کی اور دو حیدرِ کرار اور صاحبِ ذوالفقار حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں کیفر کردار کو پہنچے، اس نازک وقت میں بنو قریظہ نے بھی عہد شکنی کی اور دشمنوں سے جا ملے، اس معرکہ میں ایک دن تو ایسا سخت گذرا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چار نمازیں قضاء ہو گئیں۔

اسی دوران کہ جنگ اپنے شباب پر تھی، اللہ تعالیٰ نے 'نعیم بن مسعود اشجعی ' جو قبیلہ بنو غطفان کے رؤساء میں تھے کے دل میں ایمان کا بیج ڈال دیا، وہ خدمتِ صلی اللہ علیہ وسلم اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میرے اہل قبیلہ میرے ایمان لانے سے واقف نہیں ہیں، تو اگر آپ اجازت دیں تو ہم اس محاصرہ کو ختم کرنے کی کوئی تدبیر کریں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت مرحمت فرمائی اور انھوں نے ایسی تدبیر کی کہ اہل مکہ اور یہودیوں کے درمیان پھوٹ پڑ گئی، ادھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی زوردار آندھی آئی کہ خیمے اکھڑ گئے، ہانڈیاں الٹ گئیں، گرد و غبار نے لوگوں کو مضطرب کر دیا، موسم کی سختی اور دن بہ دن غذائی اشیاء میں ہونے والی قلت اس سے سوا تھی، ان حالات میں عربوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور ان کے لئے واپس جانے کے سوا چارہ نہیں رہا، اس طرح ایک بہت بڑی آزمائش سے مسلمانوں کو نجات ملی، بیس دن کے محاصرہ کے بعد رات کے اندھیرے میں یہ فوج واپس ہوئی اور صبح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی طرف کوچ فرمایا، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک پر یہ کلمات تھے :

خدائے واحد کے سوا کوئی معبود نہیں، نہ کوئی اس کا شریک ہے، اسی
کے لئے حکومت ہے اور وہی قابل تعریف ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے،
ہم اللہ کی طرف لوٹنے والے، اسی کی بندگی کرنے والے اور اسی کو

سجدہ کرنے والے ہیں، ہم اپنے پروردگار کی ستائش کرتے ہیں،
اللہ نے اپنے وعدہ کو پورا فرمایا، اپنے بندے کی مدد کی اور تنہا پورے
لشکر کو شکست دی۔

خندق کی مناسبت سے اسے 'غزوۂ خندق' اور تمام دشمنانِ اسلام کے یکجا ہو جانے کی وجہ سے 'غزوۂ احزاب' کہتے ہیں، یہ جنگ اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں اسلام کے خلاف موجود اس وقت کی تمام باطل طاقتیں یکجا ہوگئی تھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صورت ِحال کے پیش نظر جرأت وہمت ساتھ ساتھ حکمتِ عملی اور تدبیر و مصلحت سے کام لیا، اِس وقت بھی صورتِ حال یہ ہے کہ اسلام کے خلاف یہود و نصاریٰ اور مشرکین دوش بدوش اور قدم بہ قدم کھڑے ہیں، اُس وقت بھی ان سب کو یکجا کرنے کا کام یہودی دماغ نے کیا تھا اور آج بھی یہودی دماغ ہی اس کے پیچھے کارفرما ہے، جیسے اس وقت فوج کی تعداد اور اسلحہ کے اعتبار سے مسلمان کمزور موقف میں تھے، اسی طرح آج بھی دفاعی ٹکنالوجی میں مسلمان پیچھے ہیں، اس لئے موجودہ حالات میں مسلمان ایک نئی جنگ احزاب سے گذر رہے ہیں، ظاہر ہے کہ ان حالات میں ہمیں وہی اسوہ اختیار کرنا ہوگا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد میں اختیار کیا تھا اور اس میں تین باتیں بنیادی طور پر اہمیت کی حامل ہیں :

- اول : یہ کہ مسلمان خود متحد ہوں، وہ اپنی صفوں میں کوئی انتشار و بکھراؤ نہ پیدا ہونے دیں، جیسا کہ اس وقت مہاجرین وانصار نے شیر وشکر ہو کر اس کا نمونہ پیش کیا، اس وقت اس اُمت کا سب سے بڑا روگ اس کی باہمی نااتفاقی اور انتشار وافتراق ہے، جو قوم بکھری ہوئی حالت میں ہوتی ہے، وہ یکے بعد دیگرے دشمن کا لقمہ تر بنتی جاتی ہے۔

- دوسرے : اعدائے اسلام کے درمیان افتراق واختلاف کی جو بنیادیں ہیں، مسلمان انھیں نمایاں کریں اور موجودہ ایک قطبی نظام کو ختم کرنے کی کوشش کریں؛ کیوں کہ دو مختلف طاقتوں کی عدم موجودگی طاقتور کو ظالم و جابر اور خودسر بنا کر رکھ دیتی ہے، جنگِ عراق کے موقع سے امریکہ و برطانیہ کے مقابلہ روس وچین اور فرانس وجرمنی کا ایک گونہ اُٹھ کھڑا ہونا ایک

سے زیادہ عالمی طاقتوں کی موجودگی کی طرف ایک مؤثر قدم ہے، عالم اسلام کو چاہئے کہ وہ اس رجحان کو تقویت پہنچائیں اور ان کی سیاسی، معاشی، اخلاقی مدد کریں، تا کہ مخالف اسلام اتحاد میں شگاف پڑ سکے اور دنیا میں طاقت کا توازن قائم ہو۔

○ تیسرے: اس وقت مسلم مما لک کی تعداد پچاس سے زیادہ ہے، یہ ایک دوسرے کے لئے حصار اور دشمن کے مقابلہ خندق کا درجہ رکھتے ہیں، مسلم ملکوں کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنی اپنی سرحدوں کی فکر پر قناعت کرنے کے بجائے پورے عالم اسلام کی سرحدوں کی حفاظت کے لئے کوئی متحدہ نظم قائم کریں اور اپنے دشمنوں کا متفقہ طور پر مقابلہ کریں، اس طرح وہ سرکش سے سرکش دشمنوں کو بھی اپنا رویہ بدلنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔

یہ ہیں غزوۂ احزاب کے اسباق آج کے عالمی حالات کے پس منظر میں!

○ ○ ○ ○

فتح مبین

سیرتِ نبوی ﷺ کا ایک اہم واقعہ؛ بلکہ اسلامی تاریخ کا ایک اہم موڑ ''صلح حدیبیہ'' کا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کے بعد ۱۳ سال اپنے جاں نثار رفقاء کے ساتھ مکہ میں آبلہ پائی کی، یہاں تک کہ دشمنوں نے آپ ﷺ کا مقتل سجانے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، پھر خدا کے حکم سے آپ ﷺ نے مدینہ کا رُخ فرمایا، یا تو مکہ کی زمین آپ ﷺ پر وسعت کے باوجود تنگ کردی گئی تھی، یا مدینہ نے دل کی آنکھیں بچھا کر آپ ﷺ کا استقبال کیا اور آخری دم تک محبت اور وفا شعاری کا حق ادا کیا؛ لیکن مشرکین مکہ کے سینوں میں حسد، نفرت اور بغض کے جو شعلے ابل رہے تھے، انھیں ابھی بھی چین نہ آیا، یہ چنگاری شعلہ بن کر بدر و احد کے میدان میں کودی اور شعلۂ آتش فشاں بن کر غزوۂ خندق کے موقع سے مدینہ پر حملہ زن ہوا؛ لیکن خدا کو جس چراغ کا روشن رکھنا اور جس کی کرنوں کو دنیا کے کونے کونے تک پہنچانا تھا منظور تھا، کس کی مجال تھی کہ اسے گل کرے، وَاللہُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ ،غزوۂ خندق کی ناکامی و نامرادی نے اہل مکہ کی کمر ہمت توڑ دی اور مسلمانوں کے بغلی دشمن یہود جو شب و روز مسلمانوں کے خلاف سازشوں کے جال بننے میں لگے رہتے تھے اور جنھوں نے غزوۂ خندق کے موقع سے بدعہدی اور بے وفائی کی تمام حدوں کو توڑ ڈالا تھا، غزوۂ بنو قریظہ کے بعد مسلمانوں کو ایک حد تک ان کی طرف سے یکسوئی حاصل ہو چکی تھی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ اب نفرت کی آگ کو محبت کی شبنم سے بجھایا جائے، اہل مکہ سے ایسے راہ و رسم قائم ہوں کہ وہ مسلمانوں کے معاشرہ اور ان کی سماجی زندگی کو دیکھ سکیں، ان کے دلوں کی زمین نرم ہو اور ان کو سنجیدہ طور پر اسلام کو سمجھنے کی توفیق میسر آئے، چنانچہ آپ ﷺ نے خواب دیکھا کہ آپ ﷺ اپنے رفقاء کے ساتھ عمرہ کر رہے ہیں، اور کلیدِ کعبہ آپ ﷺ کے ہاتھ میں ہے، یہ اشارۂ غیبی تھا کہ آپ ﷺ عمرہ کا ارادہ فرمائیں، کیوں کہ نبی کے

خواب حکم الٰہی کے درجہ میں ہوتے ہیں، اس خواب نے حرم محترم کی زیارت کی آرزو کو اور بھی سوا کر دیا اور آپ ﷺ نے مکہ کی طرف کوچ کرنے کا اعلان فرما دیا، یکم ذوقعدہ ۶ ہجری (مارچ ۶۲۸ء) کو آپ ﷺ نے غسل فرما کر احرام کا لباس زیب تن کیا اور قصویٰ نامی اونٹنی پر سوار ہوئے، آپ ﷺ کے ساتھ ۱۴۰۰ سے ۱۵۰۰ تک رفقاء شریکِ سفر تھے، معمول کے خلاف صرف تلواریں ساتھ رکھی گئیں، جو عرب میں مسافروں کے لئے حفاظت کا کم سے کم سامان تھا، اہل ثروت صحابہ رضی اللہ عنہم نے قربانی کے جانور بھی ساتھ رکھے، خود آپ ﷺ کے ساتھ بھی ستر قربانی کے جانور تھے، ذوالحلیفہ میں علامتی طور پر ان کے گلے میں قلادہ ڈالا گیا اور کوہان کو کسی قدر خون آلود کر دیا گیا، تا کہ حجاز کے رواج کے مطابق لوگ اچھی طرح محسوس کر لیں کہ یہ قربانی کے جانور ہیں اور لوگ عبادت کی غرض سے آئے ہیں۔

اہل مکہ کو اس کی اطلاع ہوگئی، انھوں نے طے کر لیا کہ مسلمانوں کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے، وہ اپنے حلیفوں کو ساتھ لے کر آٹھ ہزار سپاہیوں کے ساتھ مکہ کے مغربی جانب بلاح میں خیمہ زن ہو گئے اور دو سو شہسواروں کا دستہ خالد بن ولید کی قیادت میں کراع غمیم کی گذرگاہ پر پوری تیاری کے ساتھ آدھمکا، تا کہ مکہ پہنچنے سے پہلے ہی مسلمانوں کے قافلہ پر بھر پور یلغار کی جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان حالات کی اطلاع مل گئی، آپ ﷺ نے قریش کی ناسمجھی پر افسوس کا اظہار کیا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور پُر جوش صحابہ رضی اللہ عنہم چاہتے تھے کہ جو معمول کا راستہ ہے، اس سے آگے بڑھا جائے اور جو سدِ راہ بنے اس کا مقابلہ کیا جائے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تصادم سے بچتے ہوئے خالد بن ولید والی گذرگاہ سے ہٹ کر دوسرے راستہ سے مکہ کی طرف بڑھنے کو ترجیح دی، یہاں تک کہ جب آپ ﷺ حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو قصویٰ بیٹھ گئی، لوگوں نے سمجھا کہ اونٹنی تھک گئی ہے، لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے اصحابِ فیل کو روکا تھا، اسی نے آج اس اونٹنی کو بھی روکا ہے۔

یہاں آپ ﷺ نے صلح کے لئے سلسلۂ جنبانی شروع کی، پہلے آپ ﷺ نے حضرت خراش بن امیہ خزاعی رضی اللہ عنہ کو بھیجا، لوگوں نے ان کے اونٹ کی کوچیں کاٹ ڈالیں اور ان پر حملے

کئے، وہ کسی طرح جان بچا کر واپس آئے، پھر بنوخزاعہ کے سردار بدیل بن ورقاء آئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں سمجھایا کہ قریش کیوں مزاحمت پر کمر بستہ ہیں، چاہیں تو کچھ مدت متعین کرلیں، کہ ایک دوسرے سے جنگ وجدال سے باز رہیں گے، بدیل اس تجویز سے متاثر ہوا اور اہل مکہ سے اس کو قبول کرنے کی تلقین کی، لیکن پر جوش لوگوں نے بدیل کی بات پر کان نہ دھرا، اس موقع پر اہل مکہ کے حلیف بنوثقیف کے سردار عروہ بن مسعود بھی موجود تھے، انھوں نے بھی اس تجویز کی تائید کی، وہ سردارِ قریش ابوسفیان کے داماد بھی تھے، اس لئے اس کی بات کو رد کرنا آسان نہیں تھا، چنانچہ اہل مکہ کی طرف سے عروہ بن مسعود نمائندہ بن کر آئے اور آپ ﷺ سے مذاکرات کی ابتدا ہوئی، عروہ بڑے ذہین، حاضر جواب اور معاملہ فہم آدمی تھے، انھوں نے مسلمانوں کو مرعوب کرنے کی کوشش میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور بہت ہی باریک بینی کے ساتھ صحابہ رضی اللہ عنہم کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق کا جائزہ لیتے رہے۔

وہ واپس ہوئے، تو انھوں نے بڑی دانشمندانہ گفتگو کی اور کہا کہ میں نے قیصر وکسریٰ کے دربار دیکھے ہیں اور نجاشی کے یہاں بھی باریاب ہوں، لیکن جو محبت اور جاں نثاری ہم نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رفقاء میں ان کے تئیں دیکھی ہے، کہیں اور نہیں دیکھی، ہر شخص اشارۂ چشم کا منتظر، وضو کا پانی اور لعابِ دہن تک زمین پر گرنے نہیں دیتے، اس لئے بہتر ہے کہ ان کی پیشکش قبول کرلی جائے، اس گفتگو سے متاثر ہوکر قریش کے قدیم حلیف حُلَیس بن علقمہ نے کہا کہ ذرا میں بھی آپ ﷺ سے مل لوں، جب وہ مسلمانوں کی طرف بڑھے تو آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے کہا: یہ قربانی کے جانور کی بہت تعظیم کرتے ہیں، اس لئے ''ہدی'' کے جانور کو ان کے سامنے سے گذارو، وہ یہ منظر دیکھ کر راستہ ہی سے واپس ہوگئے اور قریش سے کہا کہ یہ لوگ عمرہ کے لئے آئے ہیں، ان کو واپس نہیں کیا جاسکتا، اس حکمتِ عملی سے خود ان کے یہاں اختلاف پیدا ہوگیا، پھر مکرز بن حفص نمائندۂ قریش بن کر آئے، یہ بہت منفی ذہن کا آدمی تھا، اس لئے بات آگے نہ بڑھ سکی۔

اب آپ ﷺ نے طے کیا کہ خود مسلمانوں کی طرف سے نمائندہ بھیجا جائے، نظر انتخاب

حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر پڑی؛ لیکن ان کے قبیلے کا کوئی ایسا شخص مکہ میں موجود نہیں تھا جو ان کو اپنی امان میں لے سکے، اس لئے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا نام طے پایا، جن کا خانوادہ بنوامیہ بڑی تعداد میں مکہ میں موجود تھا اور یہی خاندان اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت میں پیش پیش تھا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مکہ میں داخل ہوئے، فخرج عثمان إلى مكة فلقيه أبان بن سعيد بن العاص حين دخل مكة أو قبل أن يدخلها ، فحمله بين يديه ثم أجاره ، (البدایہ: ۴/۶۷) وادیٔ بلاح سے گذر رہے تھے کہ ان کے چچازاد بھائی ابان بن سعید ملے، انھوں نے آپ رضی اللہ عنہ کو اپنی پناہ میں لے لیا اور اپنے گھوڑے پر بٹھا کر آگے بڑھے، رؤساء قریش نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے خواہش کی کہ اگر چاہو تو گفتگو سے پہلے کعبۃ اللہ کا طواف کرلو، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی غیرتِ ایمانی نے اس کو گوارا نہیں کیا اور فرمایا کہ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طواف نہ کریں، عثمان اس سلسلہ میں سوچ بھی نہیں سکتا، قریش بپھر گئے اور انھوں نے آپ رضی اللہ عنہ کو روک لیا، ادھر مسلمانوں کو پہلے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قید کئے جانے اور پھر شہید کردیئے جانے کی اطلاع ملی، مسلمان اس خبر سے رنجیدہ بھی تھے اور انھیں غصہ بھی تھا، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ببول کے ایک درخت کے نیچے صحابہ رضی اللہ عنہم سے بیعت لی کہ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہوں تو بدلہ لیا جائے گا اور جب تک بدلہ نہ لے لیں، وہ کسی حال یہاں سے واپس نہیں ہوں گے، جب تمام لوگ بیعت سے فارغ ہوگئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سیدھے ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھ کر فرمایا کہ یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت ہے، قرآن مجید نے بڑے اہتمام سے اس بیعت کا ایک سے زیادہ مواقع پر ذکر فرمایا ہے، (الفتح: ۱۸) اور کہا ہے کہ اس بیعت میں بیعت کرنے والوں کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ تھا، يد الله فوق ايديهم ، (الفتح: ۱۰) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر اِن صحابہ رضی اللہ عنہم سے اپنی رضا اور خوشنودی کا ذکر فرمایا ہے، اسی نسبت سے غالباً صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ ''رضی اللہ عنہ'' کے دُعائیہ کلمہ کہنے اور لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔

اس بیعت کا فوری فائدہ یہ ہوا کہ قریش میں مسلمانوں کا رُعب بیٹھ گیا اور اہل مکہ نے خبر کرائی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ زندہ ہیں اور اہل مکہ کا پیغام لے کر واپس جا رہے ہیں، حضرت

عثمان رضی اللہ عنہ واپس آئے اور یہ عندیہ ساتھ لائے کہ اہل مکہ صلح کے لئے تیار ہیں، پھر سہیل بن عمرو، حویطب بن عبدالعزیٰ اور مکرز بن حفص کے ساتھ آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مذاکرات شروع کئے، قریش کی شرطیں تھیں کہ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں اور حدیبیہ ہی میں اپنی قربانی کرلیں، آئندہ سال اس کی قضاء کرلیں، اس وقت تین دن مکہ کو مسلمانوں کے لئے خالی کردیا جائے گا، دوسری شرط یہ تھی کہ کوئی مسلمان مرتد ہوکر مکہ آجائے تو ہم اسے واپس نہیں کریں گے، لیکن اگر کوئی مسلمان ہوکر مکہ سے مدینہ چلا جائے تو مسلمان اسے واپس کردیں گے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ شرط بالکل گوارا نہیں تھی، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمالیا اور حضرت عمر سے کہا کہ ہم میں سے جو اہل مکہ کی طرف جانا چاہے گا وہ منافق ہی ہوگا اور ہمیں اس سے نجات مل جائے گی اور مکہ سے جو شخص ہماری طرف آنا چاہے گا، اللہ تعالیٰ اس کے لئے راستہ نکال دے گا، معاہدہ کی دفعات میں یہ بات بھی تھی کہ مسلمان حج وعمرہ اور تجارت وزیارت کے لئے مکہ آمد ورفت کرسکیں گے اور قریش مصر وشام یا عراق جاتے ہوئے مدینہ سے گذریں گے اور دونوں فریق کو جان ومال کی امان حاصل رہے گی، نیز یہ کہ دس سال تک ایک دوسرے سے جنگ نہیں کریں گے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے معاہدہ نامہ کی کتابت کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ نفس نفیس معاہدہ کی دفعات املا کرائیں، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' لکھایا تو سہیل بن عمرو معترض ہوا، کہ جیسے زمانۂ جاہلیت میں ''باسمک اللّٰھم'' لکھا جاتا تھا وہی لکھا جائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بات قبول کرلی، پھر آپ نے لکھا: یہ معاہدہ محمد رسول اللہ اور سہیل بن عمرو کے درمیان طے پایا، سہیل بن عمرو نے کہا کہ: اگر ہم نے آپ کو رسول اللہ مان لیا ہوتا تو پھر اختلاف کس بات کا ہوگا؟ اس لئے محمد بن عبداللہ (عبداللہ کے بیٹے محمد) لکھا جائے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بھی قبول کرلیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جوشِ ایمانی میں عرض کیا کہ: میں ''رسول اللہ'' کے لفظ کو نہیں مٹا سکتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں محمد رسول اللہ بھی ہوں اور محمد بن عبداللہ بھی، چنانچہ اپنے دستِ مبارک سے ''رسول اللہ'' کا لفظ

مٹا دیا اور اس کی جگہ محمد بن عبداللہ لکھا گیا، اس کے بعد دونوں طرف سے گواہان کے دستخط ہوئے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم اس معاہدہ کو اپنی ہزیمت محسوس کر رہے تھے اور انھوں نے محض آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احترام اور فرماں برداری میں اسے قبول کر لیا تھا، سہیل بن عمرو واپس ہو گئے، ادھر ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہوا کہ قربانی کے جانور ذبح کر لو اور بال منڈا لو؛ لیکن کوئی شخص بال منڈانے اور قربانی کرنے کو کھڑا نہ ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین تین بار ارشاد فرمایا اور ہر بار صحابہ رضی اللہ عنہم کا سکوت سامنے آیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہایت ہی دل گرفتہ اور محزون اپنے خیمہ میں واپس آئے اور اُمت کی ماں حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا سے صورتِ حال سنائی، وہ بہت ہی دانش منداور فریس خاتون تھیں، انھوں نے عرض کیا: بہتر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی سے کچھ نہیں کہیں، خود اپنے اونٹ کی قربانی فرمائیں اور بال منڈ والیں، چنانچہ حضرت خراش بن امیہ رضی اللہ عنہ نے سر مبارک مونڈا، یہ دیکھ کر تمام صحابہ رضی اللہ عنہم اُٹھ کھڑے ہوئے اور ایک دوسرے کے بال مونڈنے لگے، فرطِ جذبات میں ایسا لگتا تھا کہ بال کے ساتھ چمڑے بھی چھیل ڈالیں گے؛ کیوں کہ وہ اس صلح سے بہت رنجیدہ خاطر تھے، صلح کے بعد بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دنوں یہاں قیام فرمایا اور بہ حیثیتِ مجموعی دو ہفتہ کے قیام کے بعد مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوئے، ابھی کچھ ہی مسافت گذری تھی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سورۂ فتح کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں اور ارشادِ ربانی ہوا کہ ہم نے آپ کو ''فتح مبین'' عطا فرمائی ہے۔ اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحاً مُّبِیْناً ۔ (الفتح:۱)

بہ ظاہر یہ صلح مسلمانوں کے لئے شکست اور ہزیمت نظر آتی تھی؛ لیکن خدائے بصیر و خبیر نے اسی کو مسلمانوں کے لئے ''فتح مبین'' قرار دیا، اس صلح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دور رس حکمت عملی کا دخل تھا، اہل مکہ اور یہودِ مدینہ بعض روایتوں کے مطابق مسلمانوں کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کرنے کا عہد کر چکے تھے، جیسا کہ غزوۂ خندق میں اس کا ظہور ہو چکا تھا، اس صلح نے زیادہ طاقتور فریق قریش مکہ کو اس اتحاد سے الگ کر دیا؛ کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ابتداءً یہودیوں سے قربت چاہتے تھے؛ لیکن ان کے منافقانہ رویہ نے واضح کر دیا تھا کہ وہ قابل اطمینان لوگ

نہیں ہیں؛ اس لئے دوسرے فریق کو آپ ﷺ نے قریب کرنے کی کوشش فرمائی، مسلمانوں کے بابِ مکہ تک کوچ کرنے کی وجہ سے عربوں میں ان کا ایک رعب و دبدبہ قائم ہوا اور اہل مکہ ان کی حیثیت اور وجود کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے، صلح حدیبیہ کے موقع سے کئی بار دشمنوں نے یلغار کرنے کی کوشش کی اور مسلمانوں نے انھیں گرفتار بھی کرلیا؛ لیکن آپ ﷺ نے رہا فرمادیا، اس طرح آپ ﷺ نے قریش مکہ کو مسلمانوں کے خلاف اس کا موقع بالکل نہیں دیا کہ وہ حرم کی بے احترامی کا پروپیگنڈہ کرسکیں، اس معاہدہ کی رو سے اس بات کی بھی گنجائش رکھی گئی کہ جو فریق جس کے ساتھ چاہے، دوستی کا معاہدہ کرلے، ایسی صورت میں وہ بھی اس معاہدہ میں شریک سمجھا جائے گا، چنانچہ بنوخزاعہ نے مسلمانوں سے اور بنوبکر نے قریش کے ساتھ دوستی کا معاہدہ کرلیا۔

اس صلح سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ حرم اقدس اور کعبۃ اللہ پر اہل مکہ کی اجارہ داری ختم ہوگئی اور مسلمانوں کو مساوی حقوق حاصل ہوگئے، جو لوگ مکہ میں خفیہ طور پر اسلام لائے ہوئے تھے، انھیں اپنے ایمان کے اظہار کا موقع ملا اور باہمی تعلقات کی بحالی کی وجہ سے مسلمانوں کے اخلاق سے متاثر ہوکر بہت سے لوگ ایمان لائے، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ، حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ، حاتم بن عدی رضی اللہ عنہ وغیرہ اسی دَور میں مسلمان ہوئے اور سب سے اہم بات یہ ہوئی کہ اہل مکہ کی طرف سے مطمئن ہونے اور جنگ کا خطرہ کم ہونے کا موقع ملا اور اس صلح نے لوگوں کے قلوب کو فتح کرنے اور اہل مکہ کے دلوں کی زمین میں ایمان کا شجر طوبیٰ لگانے اور اسے پروان چڑھانے میں ایسا کردار ادا کیا کہ سیرتِ نبوی ﷺ کا شاید ہی کوئی اور واقعہ اس سلسلہ میں اس درجہ مؤثر اور مفید ثابت ہوا ہو۔

صلح حدیبیہ کا واقعہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لئے بہت ہی سبق آموز اور عبرت خیز ہے، اور اس وقت مسلمان جن حالات سے دوچار ہیں، ان میں سیرت کے اس عظیم الشان واقعہ کا پوری گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرنے اور افراط وتفریط سے بچتے ہوئے صحیح نتیجہ اخذ کرنے کی ضرورت ہے۔

○ صلح حدیبیہ کا سب سے اہم سبق دعوتِ دین کے لئے مواقع حاصل کرنا ہے، جیسا کہ ذکر کیا گیا، اس صلح سے پہلے مسلسل جنگ یا جنگ کے خطرہ کی وجہ سے اہل مکہ سے بڑی حد تک روابط منقطع تھے؛ اس لئے معتدل فضاء میں ان کو اسلام کے بارے میں خالی الذہن ہو کر سوچنے کا موقع نہیں ملا تھا اور قریش مکہ پر گویا دعوت کا راستہ ہی بند ہو گیا تھا، جب کہ قریش کی حیثیت جزیرۃ العرب میں فکری مقتدیٰ کی تھی؛ اس لئے جب تک قریش کے دلوں کو فتح نہیں کیا جاتا، عام عرب آسانی سے اسلام کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، صلح حدیبیہ کی وجہ سے اہل مکہ اور مسلمانوں کی ایک دوسرے کے یہاں آمد ورفت شروع ہوئی اور مسلمانوں کے تئیں مکہ والوں کے دلوں میں نرم گوشہ پیدا ہونے لگا۔

○ جب کوئی گروہ دشمن کی یلغار وتصادم کے خطرہ سے دوچار رہتا ہے، تو فطری بات ہے کہ دوسرے ضروری اور مثبت کاموں کی طرف کما حقہ توجہ نہیں ہو پاتی، چنانچہ مسلمان عرب کے دوسرے قبائل اور جزیرۃ العرب کے قرب وجوار میں رہنے والے لوگوں تک دعوتِ اسلام پہنچانے کا کام بھی نہیں کر پا رہے تھے، جب مکہ کی طرف سے اطمینان ہوا، تو اب مختلف رؤساء اور سربراہانِ مملکت کو آپ ﷺ نے نامۂ مبارک روانہ فرمایا اور انھیں اسلام کی دعوت دی، یہ خطوط حبش، روم، ایران، مصر، دمشق اور یمامہ کے فرمانرواؤں کو لکھے گئے اور یہ رسول اللہ ﷺ کا معجزہ ہے کہ یہ تمام ہی نامہ ہائے مبارک آج دریافت ہو چکے ہیں، اسی طرح صلح حدیبیہ نے نہ صرف اہل مکہ کو دعوت کا موقع فراہم کیا؛ بلکہ دنیا کے بقیہ معلوم قابل رسائی حصوں تک بھی دعوتِ دین پہنچانے کا موقع ملا اور اسلام تیزی سے پھیلنا شروع ہوا اور اس وقت کے اہم سلاطین میں سے نجاشی شاہِ حبش نے بھی اس دعوت پر لبیک کہا۔

صلح حدیبیہ نے اسلام کی اشاعت میں جو مؤثر کردار ادا کیا ہے، اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے، کہ جہاں حدیبیہ میں ۱۴ تا ۱۵ سو مسلمان آپ ﷺ کے ساتھ تھے، وہیں صرف دو سال بعد فتح مکہ کے موقع سے آپ ﷺ کے ساتھ مسلمانوں کی تعداد دس ہزار سے متجاوز تھی اور اس کے دو سال بعد حجۃ الوداع کے موقع سے آپ ﷺ کے رفقاء ایک لاکھ سے بھی زیادہ

تھے، اس میں مسلمانوں کے لئے سبق ہے کہ اسلام کی سربلندی کا سب سے بڑا ذریعہ دعوت ہے؛ کیوں کہ یہ دین انسانی فطرت سے پوری طرح ہم آہنگ اور عقل کی کسوٹی پر پورا اترنے والا مذہب ہے؛ اس لئے اس میں دلوں کو فتح کرنے اور قلب ونظر کو اپنی چوکھٹ پر خم کرا لینے کی غیر معمولی صلاحیت ہے، آج بھی اگر مسلمان دعوت کے کام کی طرف توجہ دیں اور غیر مسلموں تک اسلام پہنچانے کی کوشش کریں تو ''فتح مبین'' حاصل کر سکتے ہیں۔

○ صلح حدیبیہ کا دوسرا اہم سبق جوش پر ہوش کو غالب رکھنا ہے، کسی قوم کے لئے باعزت زندگی گذارنے میں حوصلہ و ہمت اور جرأت و شجاعت کا بھی بڑا کردار ہوتا ہے اور حوصلہ ہی جوش کو جنم دیتا ہے؛ اس لئے گاہے غیرت وحمیت اور جوش وولولہ کے اظہار کی بھی ضرورت ہوتی ہے؛ لیکن یہ ضروری ہے کہ ہمیشہ جوش پر ہوش کو اور جذباتیت پر شعور کو غالب رکھا جائے، صلح حدیبیہ کے موقع سے مکہ کے اشرار نے بار بار مسلمانوں پر یلغار کی اور مسلمانوں نے انھیں گرفتار بھی کرلیا، وہ انھیں ان کے جرم کی مناسب سزا دے سکتے تھے اور اگر وہ انھیں سزا دیتے تو یہ کوئی ناواجبی بات نہیں ہوتی، اسی طرح معاہدہ کی بعض دفعات —— بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ —— مسلمانوں کے خلاف جاتی ہیں، یہی بات کہ اتنا طویل سفر کر کے مسلمان مکہ تک پہنچے، یہ احرام کے لباس میں تھے اور قربانی کے جانوروں کے ساتھ تھے، عرب کی روایت کے مطابق انھیں روکنے کا کوئی جواز نہیں تھا، اس کے باوجود انھیں عمرہ کے بغیر واپسی پر مجبور کرنا، جذبات کو سخت ٹھیس پہنچانے والی بات تھی؛ لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ نے ایک دوررس فیصلہ کرتے ہوئے اس شرط کو قبول فرمالیا۔

قوموں کی زندگی میں بہت سے مواقع ایسے آتے ہیں جب خوش تدبیری کے تحت صبر کا دامن تھامنا پڑتا ہے اور مقصد اور منزل کے اعتبار سے آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹنے میں ان کی کامیابی مضمر ہوتی ہے، لیکن یہ پیچھے ہٹنے کا فیصلہ چوں کہ ظاہری وقار اور جذبات کے خلاف ہوتا ہے؛ اس لئے اسے قبول کرنا آسان نہیں ہوتا، ایسے مواقع پر صلح حدیبیہ اُمت کے لئے اسوہ ہے کہ وقتی جوش وخروش پر دوررس اور وسیع تر مفاد کو مقدم رکھا جائے۔

○ صلح حدیبیہ کا ایک سبق یہ بھی ہے کہ دشمنوں کی وحدت کو توڑنے اور تقسیم کرنے کی کوشش کی جائے، غزوۂ خندق نے اہل مکہ، بنو غطفان اور یہودیوں کے وسیع تر اور طاقتور اتحاد کو جنم دیا تھا، اسی وجہ سے مسلمان اس بات پر مجبور ہو گئے کہ اس جنگ میں دو بدو مقابلہ کرنے کے بجائے خندقیں کھود لی جائیں اور مخالف فوج کو قریب آنے نہیں دیا جائے، صلح حدیبیہ کی وجہ سے اہل مکہ اس اتحاد میں شریک نہیں ہو سکتے تھے اور اہل مکہ کے بغیر بنو غطفان یا خیبر میں بسنے والے یہودیوں کو مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی، مسلمانوں کو موجودہ حالات میں یہی کرنے کی ضرورت ہے، عالمی سطح پر مسلمانوں کے خلاف یہودیوں اور عیسائیوں کا اتحاد قائم ہو چکا ہے، ملکی سطح پر سنگھ پریوار اقلیتوں کے خلاف فسطائی اتحاد قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہے، مسلمانوں کا کام ہے کہ وہ حکمت و دانائی سے کام لیتے ہوئے اس اتحاد کو بکھیرنے کی کوشش کریں، جو تخریبی مقاصد پر مبنی ہیں۔

○ صلح حدیبیہ کا ایک اہم سبق عوام کا مخلص، خدا ترس اور باشعور قیادت کے سامنے سر جھکا دینا ہے، صلح حدیبیہ کے لئے رسول اللہ ﷺ نے جن شرطوں کو قبول فرمایا تھا، عام صحابہ رضی اللہ عنہم ہی نہیں؛ بلکہ اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی ان میں مسلمانوں کی تحقیر کا احساس ہوتا تھا اور غیرتِ ایمانی کی وجہ سے یہ اسے قبول کرنا نہیں چاہتے تھے؛ لیکن جب آپ ﷺ نے صلح فرمائی تو بالآخر انھوں نے اپنا سر جھکا دیا، آج یہ کیفیت مسلمانوں میں مفقود ہے، اگر اجتماعی مسائل کے بارے میں اُمت کا ہر فرد اپنے طور پر درست و نا درست اور صواب و خطا کا فیصلہ کرنے لگے تو کبھی اجتماعیت باقی نہیں رہ سکتی اور جو قوم اجتماعیت سے محروم ہو، اس کے اقدام و فیصلے کا کوئی وزن نہیں ہوتا، اطاعت ہی سے قیادت بنتی ہے اور طاقتور قیادت ہی فریق مخالف پر اثر انداز ہوتی ہے۔

کسی بات کو تسلیم کرانے کے لئے یہ بات بھی ضروری ہوتی ہے کہ قابل قبول تدبیر اختیار کی جائے اور مخاطب کے مزاج اور جذبات کو سامنے رکھتے ہوئے قدم اٹھایا جائے، رسول اللہ ﷺ نے تین تین بار صحابہ رضی اللہ عنہم سے احرام کھولنے اور قربانی کرنے کی خواہش فرمائی؛ لیکن

خاموشی چھائی رہی، پھر جب حضرت اُم سلمہؓ کے مشورہ پر آپ ﷺ نے خود اپنے بال منڈوائے اور قربانی کی، تو جاں نثاروں نے آگے بڑھ کر احرام کھولے اور خدا کے حضور قربانی کا نذرانہ پیش کیا؛ کہ جذبات کی آگ کو بجھانے کے لئے اس وقت اسی طرزِ عمل کی ضرورت تھی۔

غرض کہ صلح حدیبیہ کا واقعہ سیرتِ نبوی ﷺ کا نہایت اہم واقعہ ہے، جو شکست کی صورت میں فتح اور پسپائی کی صورت میں پیش قدمی ہے اور رسول اللہ ﷺ کی سیاسی فراست اور تدبیر کا ایک شاہکار ہے، اسی لئے قرآن مجید نے اس واقعہ کو ''فتح مبین'' سے تعبیر کیا ہے، آج بھی اگر مسلمان اس واقعہ کے سبق آموز پہلوؤں کو سامنے رکھیں اور اسے اپنے لئے نقش راہ بنائیں تو ''فتح مبین'' سے ہمکنار ہو سکتے ہیں!

○ ○ ○ ○

فتح مکہ
رمضان المبارک کا ایک اہم معرکہ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں مسلمانوں کو جو سب سے عظیم الشان اور فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی وہ ہے مکہ کی فتح، ابھی آٹھ سال پہلے آپ اور آپ کے رفقاء نے بے سروسامانی میں نہ چاہتے ہوئے بھی مکہ کو چھوڑ مدینہ کی پناہ لی تھی، یہ عجب وقت تھا کہ ہر مسلمان اپنے سر پر موت کو سایہ فگن محسوس کرتا تھا، اور اپنی پیشانی کو خدا کے سامنے جھکانا بھی نا قابل معافی جرم تھا، مسلمانوں پر ہر طرح کے جور وستم روا رکھے جاتے اور ظالموں سے پنجہ آزمائی تو کجا کوئی زبان نہ تھی جوان مظام پر اُف بھی کرے اور کوئی آنکھ نہ تھی جوان ستم انگیزیوں پر نم بھی ہو، مسلمانوں کا لٹا پٹا بے سروسامان، ستم زدہ قافلہ، سینے میں ایمان اور تن پر کپڑوں کے ساتھ مدینہ پہنچا اور یہاں اس نے ایمان کی ایک نئی بستی بسائی، پھر بدر واحد اور خندق کے معرکوں نے اس کمزور پودے کو ایک سایہ دار شجرۂ طوبیٰ بنا دیا، یہاں تک کہ ہجرت کے چھٹے سال اہل مکہ مسلمانوں سے صلح کرنے پر مجبور ہوئے، جسے سیرت میں 'صلح حدیبیہ' کے نام سے جانا جاتا ہے، لیکن اہل مکہ اس صلح پر قائم نہیں رہ سکے اور سن ۸ ہجری میں انھوں نے مسلمانوں کے ایک حلیف قبیلہ کے خلاف عین حرم مکی میں بدعہدی کی، نہ اپنے معاہدہ کا خیال رکھا اور نہ حرم اقدس کی حرمت کا کوئی پاس، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ سے بچتے ہوئے اس کی تلافی کے لئے دو تجویزیں رکھیں؛ لیکن اہل مکہ نے طاقت کے نشہ میں ان کو مسترد کر دیا اور صلح حدیبیہ کے ختم ہو جانے کا اعلان کر دیا، اس طرح خود انھیں کی جانب سے مکہ پر فوج کشی کی راہ ہموار ہوئی۔

مکہ مسلمانوں کا قبلہ اور کعبۃ اللہ توحید کا پہلا مرکز تھا، اس پاک خطہ کو کفر کی آلودگی سے پاک کرنا اور معمار کعبہ کے مقصد و منشأ کے مطابق اسے توحید کی روشنی میں منور کرنا مسلمانوں کی

سب سے بڑی آرزو اور ان کا دیرینہ خواب تھا، جس کی تعبیر اب سامنے نظر آتی تھی، چنانچہ ہجرت کے آٹھویں سال، ماہ رمضان المبارک میں آپ نے مکہ کی طرف اپنے رفقاء کے ساتھ کوچ فرمایا، اکثر مسلمان آپ کے ہم رکاب تھے، اور حریف قبائل کو بھی خفیہ طور پر اس کی اطلاع کر دی گئی تھی، روشنی اور نور کا یہ کارواں مدینہ سے نکل کر مکہ کی طرف بڑھ رہا تھا، قافلہ مکہ کے بالکل قریب پہنچ گیا، لیکن ایسی رازداری کے ساتھ کہ اہل مکہ کو کوئی خبر نہ تھی، 'مرالظہران' کے مقام پر دس ہزار کا یہ لشکر جرار خیمہ زن ہوا، آپ کے حکم سے فوجیں دور دور تک پھیل گئیں اور منشأ نبوی کے مطابق ہر گروہ نے الگ الگ چولھے سلگائے، جب دور تک یہ چولھے سلگ رہے تھے، تا حد نگاہ ان کی آگ نظر آتی تھی، اہل مکہ مسلمانوں کی طرف سے پہلے سے خدشہ میں مبتلا تھے، مکہ کے تین سرداران میں ابوسفیان بھی تھے، حالات کے تجسس میں مکہ کے باہر آئے، عرب چولھوں کی تعداد سے افراد کی تعداد کا اندازہ کیا کرتے تھے، یہاں انھوں نے جو منظر دیکھا، اس نے انھیں دم بخود کر دیا، ابوسفیان پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نگاہ پڑ گئی، وہ چاہتے تھے کہ قائد کفر کو کیفر کردار تک پہنچا دیا جائے، لیکن حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی خواہش پر آپ نے درگذر سے کام لیا، قدرت خداوندی کی جلوہ آرائیوں نے تو اسی وقت ابوسفیان کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا، آخر رفتہ رفتہ ایمان کی چنگاری ابوسفیان کے دل کو گرم کرتی رہی اور بالآخر وہ مخلص مسلمان بن گئے۔

اگلے دن یہ نور ایمان میں ڈوبی اور آہن و فولاد سے سجی ہوئی فوج مکہ شہر میں داخل ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر قبیلہ کا الگ الگ دستہ بنا دیا تھا، ان کے جھنڈے بھی الگ تھے، لشکر اسلام کے جوش و خروش اور شوکت و قوت کا دیدار کرانے کے لئے حضرت عباس رضی اللہ عنہ، حضرت ابوسفیان کو لے کر اس تنگ وادی کے فراز پر کھڑے تھے، جہاں سے یکے بعد دیگرے یہ فوجی دستے مارچ کر رہے تھے، ہر دستہ ہتھیاروں سے لیس اور جوش و خروش سے معمور، پھر جب ان کی نعرۂ تکبیر کی صدائیں بلند ہوتیں تو لگتا کہ پہاڑوں کا کلیجہ بھی پانی ہو جائے گا، ابوسفیان حیرت کی آنکھوں اس منظر کو دیکھتے، یہاں تک کہ انصار کا لشکر جرار سامنے آیا جس میں تا حد نگاہ سر ہی سر نظر آتے تھے، ان کی حمیت ایمانی اور غیرت اسلامی ایسا سماں پیدا کر رہی تھی، کہ اعداء اسلام کو

ان کو دیکھنے کی بھی تاب نہ تھی، اخیر میں وہ کاروانِ کوکب وانجم اور نور وسرور آیا جس میں خود رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم مجاہدانہ لباس کے ساتھ جلوہ فرما تھے، آپ اونٹنی پر سوار تھے، زبان پر اللہ کی تحمید وتقدیس اور جبین مبارک عجز وفروتنی سے اس قدر جھکی ہوئی کہ بار بار اونٹ کی کوہان سے لگ جاتی، اس موقع سے سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے نعرہ مارا کہ آج کشت وخون کا دن ہے، الیوم یوم الملحمة، آپ نے فوراً نکیر فرمائی اور ارشاد ہوا کہ آج مہر ووفا کا دن ہے، الیوم یوم المرحمة اور جھنڈا ان سے واپس لے کر ان کے صاحب زادہ کو دے دیا گیا۔

آپ مکہ میں داخل ہوئے، تو خود اپنے مکان میں قیام نہیں فرمایا؛ کیوں کہ اگر آپ اپنے مکان میں فروکش ہوتے تو تمام مہاجرین اپنے اپنے مکانات پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتے اور مہاجرین اور موجودہ قابضین کے درمیان ایک نئی جنگ شروع ہوجاتی، اس لئے آپ نے وادیٔ خیف میں قیام فرمایا، حضرت خالد بن ولید مکہ کے بالائی حصہ سے فوج لے کر داخل ہوئے، انھیں ہدایت تھی کہ ممکن حد تک جنگ سے اجتناب کریں، لیکن کچھ لوگوں نے حملہ کیا، اس لئے مجبوراً ان پر حملہ کرنا پڑا اور اس طرح تیرہ افراد مارے گئے، چند ساعت گذرنے کے بعد آپ کعبۃ اللہ میں تشریف لائے، اس وقت کعبہ کے گرد تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے، آپ ایک ایک کو عصاء مبارک سے ٹھوکر مارتے اور فرماتے: جاء الحق وذهق الباطل، کعبہ کے اندر بھی بہت سے بت اور فرضی مجسمے تھے، ان کو بھی آپ نے صاف کرایا، کعبہ کی کنجی عثمان بن طلحہ کے پاس رہتی تھی، ہجرت سے پہلے ایک بار آپ نے کعبہ میں نماز پڑھنی چاہی اور عثمان سے خواہش کی کہ وہ کعبہ کھول دیں، لیکن وہ تیار نہ ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس وقت کیا ہوگا، جب یہ کنجیاں میرے ہاتھ میں ہوں گی، اور میں جسے چاہوں دوں گا؟ عثمان بن طلحہ کو یہ بات مضحکہ خیز محسوس ہوئی، لیکن آج عثمان نے اپنی آنکھوں سے اس منظر کو دیکھا، آپ نے عثمان بن طلحہ کو بلوایا، کنجیاں لیں، خود کعبۃ اللہ میں داخل ہوئے، دو رکعت نماز ادا فرمائی، پھر باہر تشریف لائے، مختلف لوگ خواہش مند تھے کہ انھیں کلید بردار کعبہ ہونے کا شرف حاصل ہو، ان خواہش مندوں میں آپ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی تھے، لیکن آپ نے فرمایا: آج کا

دن حسن سلوک اور وفا شعاری کا ہے، **الیوم یوم بر و وفاء** اور کنجیاں عثمان کو واپس کر دیں۔

اس کے بعد آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا، اس خطبہ میں نہ کہیں فاتحانہ انداز ہے نہ اپنی بہادری اور شجاعت کا اظہار اور نہ دشمنوں کی تذلیل اور للکار، بلکہ اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء اور اس بات کا اعلان کہ نسل ونسب کا افتخار کوئی چیز نہیں، تمام لوگ آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور آدم علیہ السلام کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے، خطبہ کے بعد آپ نے مجمع کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھا تو سارے اعداء اسلام نگاہوں کے سامنے تھے، وہ لوگ جنھوں نے آپ کو گالیاں دی تھیں، جنھوں نے آپ کی راہ میں کانٹے بچھائے تھے، جن کی شمشیریں مسلمانوں کے خون کے لئے تشنہ لب تھیں اور جن کی خوں آشام تلواریں مدینہ کی در ودیوار کو چھوتی تھیں، آپ نے دریافت کیا کہ تم ہم سے کیا توقع رکھتے ہو؟ —— یہ بہر حال آپ کے مزاج شناس اور آپ کی مروت سے واقف تھے، کہہ اُٹھے آپ ایک شریف بھائی اور شریف بھائی کی اولاد ہیں، اُخ کریم وابن اُخ کریم، آپ نے جواب میں فرمایا: آج تم پر کوئی گرفت نہیں، تم سب آزاد ہو، **لاتثریب علیکم الیوم ، اذھبوا فأنتم الطلقاء ۔**

کچھ دیر گذری تھی کہ ظہر کا وقت ہو گیا، حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے بام کعبہ پر چڑھ کر ندائے اذان بلند کی مدت کے بعد کعبہ پر پھر اللہ کی بڑائی اور توحید کی صدا لگائی گئی اور مکہ کی فضاؤں میں یہ نغمۂ توحید رس گھول گیا، فتح مکہ کے موقع سے بے شمار لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی، آنے والی خواتین میں ابوسفیان کی بیوی ہندہ بھی تھیں، عم رسول حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی جگر خوار، انھوں نے اس حالت میں بھی کسی قدر، تیز وتند گفتگو ہی کی پھر بیعت ایمان سے مشرف ہوئیں، لیکن آپ کی وسیع القلبی اور عفو عام کا حال یہ تھا کہ ہندہ کے خلاف کوئی تعزیر تو کیا ان تلخیوں کو یاد دلانا بھی مناسب نہیں سمجھا، جن سے آپ کو شاید زندگی میں سب سے زیادہ رنج ہوا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد مہاجرین کو تلقین فرمائی کہ وہ اپنے مکانات پر دوبارہ قبضہ کی کوشش نہ کریں، مکہ میں داخل ہوتے ہوئے آپ نے امن وامان کا اعلان فرمایا، کہ جو کعبۃ اللہ میں داخل ہو جائے، اسے امن ہے، جو اپنے گھر کے دروازے بند کر لے اسے امن

ہے اور جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوجائے اسے امن ہے، —— اس طرح امن اور عفو ودرگذر کی فضاء میں ہجرت کے آٹھویں سال دس رمضان المبارک کو مکہ پر اسلام کی فتح مندی کا جھنڈا لہرایا گیا، جو ان شاء اللہ تا ابد توحید اور اسلام کا مرکز بنا رہے گا، اللہ تعالیٰ تمام شرور وفتن سے اس ارض پاک کی حفاظت فرمائے۔

فتح مکہ کے اس واقعہ میں کئی سبق آموز اور عبرت خیز پہلو ہیں :

- اس سے ہمیں حساس قومی اور ملی مسائل کے بارے راز داری کا سبق ملتا ہے، کہ ہماری تدبیریں مخالفین کی نظر سے مخفی رہنی چاہئیں ، نہ یہ کہ قدم اُٹھانے سے پہلے ہی اپنے ارادوں کو اخبارات کی شاہ سرخیوں کی زینت بنا دیا جائے ، یہ اس وقت مسلمانوں کی بڑی کمزوری ہے، کہ وہ اپنے ارادوں کو مناسب وقت تک چھپا کر نہیں رکھ پاتے ،رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کی سرحدوں تک پہنچ گئے ،ایک بڑی فوج آپ کے ساتھ تھی،اس کے باوجود اہل مکہ کو اس کی بھنک تک نہیں لگ سکی۔

- فتح مکہ کا سب سے بڑا سبق عفو ودرگذر ہے،قدرت کے باوجود آپ نے اپنے جانی دشمنوں کی جان بخشی فرمادی اور آپ نے انھیں مسلمان ہونے پر بھی مجبور نہیں کیا،عفو ودرگذر اور مفتوحین کے ساتھ ایسے حسن سلوک کی شاید ہی کوئی اور مثال مل سکے۔

- کامیابی اور فتح مندی انسان کے جذبۂ نخوت اور احساس تعلّی کو مہمیز کرتی ہے،ایسے مواقع پر سینے اکڑ جاتے ہیں، گردنیں تن جاتی ہیں اور زبان سے بلند و بانگ دعوے ابلنے لگتے ہیں،لیکن فتح مکہ کے موقع پر شروع سے اخیر تک آپ عجز وفروتنی کی تصویر بنے ہوئے ہیں، گردن مبارک اس قدر جھکی ہوئی ہے کہ پیشانی بار بار اونٹنی کی کوہان سے لگ جاتی ہے،مفتوحین کے سامنے جو خطبہ ارشاد فرمایا جاتا ہے،اس میں اللہ کی کبریائی اور سر بلندی کے ساتھ اپنی بڑائی اور فتح یابی کا کہیں کوئی ذکر نہیں —— خوشی کے موقع پر مؤمن کا یہی کردار ہونا چاہئے۔

- آپ نے مہاجرین کو اپنے مکانات سے دست بردار ہوجانے کی تلقین فرمائی اور خود اپنے مکان میں اترنے سے اجتناب فرمایا، یہ آپ کی زبردست حکمت عملی اور معاملہ فہمی تھی،

کفار نے جن مکانات پر قبضہ کرلیا تھا، اگر آپ اور آپ کے رفقاء ان مکانات پر دوبارہ قبضہ کرنے کی کوشش کرتے تو نئی خانہ جنگی کی صورت پیدا ہو جاتی، نفرت و عداوت کے شعلے بھڑکتے اور اہل مکہ کو ایمان کی طرف لانے کی جو کوشش ہو رہی تھی، اس میں رخنہ پڑ جاتا، اس لئے آپ نے یہ تدبیر اختیار فرمائی کہ جو جائداد جس کے قبضہ میں ہے، وہ اسی کے پاس چھوڑ دی جائے اور مہاجرین مدینہ واپس آ جائیں، گویا جب حکمت و مصلحت اور دین کی تبلیغ و دعوت کا تقاضا ہو تو مسلمان اپنے بعض حقوق سے دستبردار ہو جائیں اور ایسے وقت میں ایثار سے کام لیں۔

- ابوسفیان اس وقت اہل مکہ کے سب سے بڑے سردار تھے، آپ نے مکہ میں داخل ہوتے ہوتے اعلان فرمایا کہ جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو وہ مامون رہے گا، حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ، انصار کے سرداروں میں تھے، آپ نے ان کے ایک نعرہ کو ناپسند فرما کر علم قیادت ان کے ہاتھ سے لیا؛ لیکن ان ہی کے صاحب زادہ کے ہاتھ میں دے دیا، جس میں لوگوں کی نفسیات کی رعایت کا سبق ملتا ہے، کہ جو شخص جس مقام کا ہو اس کا پاس و لحاظ رکھا جائے، اس سے ابوسفیان کا اعزاز مطلوب تھا اور سعد بن عبادہ کو جو رنج ہو سکتا تھا اس کی تلافی مقصود تھی۔

- احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ فتح ہونے کے بعد آپ حضرت ام ہانیؓ کے گھر تشریف لے گئے، وہاں غسل فرمایا اور نماز ادا کی، بعض اہل علم کا خیال ہے کہ یہ نماز اشراق تھی اور بعض کی رائے ہے کہ نماز شکرانہ، بہر حال نماز اشراق کے ضمن میں بھی نماز شکرانہ ہو سکتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جب بھی خوشی کا کوئی موقع آئے اور انسان کو کوئی کامیابی حاصل ہو تو اس وقت ایسا مخمور نہ ہو کہ اپنے خالق و مالک ہی کو بھول جائے؛ بلکہ فوراً اس کی جبین شکر کو خدا کی چوکھٹ پر بچھ جانا چاہئے؛ کہ :

جو کچھ ہوا ، ہوا ہے کرم سے تیرے
جو بھی ہوگا ، تیرے کرم سے ہوگا

○ ○ ○ ○

معرکۂ وجود میں بدرو "حنین" بھی ہے عشق!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اُمت کے لئے اسوۂ ونمونہ ہے، اسی لئے آپ کو مشقتوں اور آزمائشوں سے بھی گزارا گیا اور فتح مندی و کامیابی کے ساتھ ساتھ عارضی شکست و ہزیمت سے بھی آمایا گیا، تاکہ اُمت جس طرح کے حالات سے بھی دوچار ہو، آپ کی حیات طیبہ کو اپنے لئے نمونہ بنائے اور اسوۂ محمدی کے آئینہ میں اپنی زندگی کو سنوارنے کی کوشش کرے، اس لئے سیرت نبوی میں جہاں ہمیں بدر و فتح مکہ کے واقعات ملتے ہیں، وہیں احد اور حنین کی داستانیں بھی ملتی ہیں، کہ اس کے بغیر عشق و جاں نثاری کا امتحان مکمل نہیں ہوسکتا تھا۔

غزوۂ حنین کا ذکر خود قرآن مجید میں سورۂ توبہ کی آیت ۲۵-۲۶ میں آیا ہے، حنین مکہ اور طائف کے درمیان ایک مقام کا نام تھا، اب اس نام سے کوئی آبادی موجود نہیں ہے؛ لیکن عہد نبوی میں یہ مشہور جگہ تھی اور اس وادی کے گرد و پیش بازار بھی لگا کرتے تھے، حنین میں قبیلۂ ہوازن آباد تھا، جو تیر اندازی میں طاق سمجھا جاتا تھا، یہ قبیلہ قریش مکہ سے رقابت کا جذبہ پہلے ہی سے رکھتا تھا، جب مکہ سے اسلام کا سورج طلوع ہوا تو بنو ہوازن اور بنو ثقیف دونوں ہی نے اس کی شدت سے مخالفت کی۔

جب مکہ فتح ہوا، تو بنو ہوازن اور بنو ثقیف کو خیال ہوا کہ اب اس طوفان کا رُخ ہماری طرف ہوسکتا ہے، چنانچہ مالک بن اوس کی قیادت میں دونوں قبیلوں کے جنگجو وادیٔ اوطاس میں جمع ہوگئے، ان بہادر جنگجوؤں کی تعداد چار ہزار تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان تیاریوں کی اطلاع مل چکی تھی، اندیشہ تھا کہ وہ مکہ کی طرف بڑھیں اور خطرہ تھا کہ کہیں اس سے مکہ کے شورش پسندوں کو موقع نہ ہاتھ آجائے، اس لئے مکہ کی مہم سے فارغ ہوکر آپ ﷺ نے اس غزوہ کی تیاری فرمائی، دس ہزار جاں نثار تو پہلے ہی سے آپ کے ساتھ تھے، مکہ کے نو مسلموں کو ملاکر بارہ ہزار کی تعداد ہوگئی، جن میں ایسے مشرکین بھی تھے، جو محض مالِ غنیمت کی

لالچ میں شامل ہو گئے تھے، آپ ﷺ نے صفوان بن اُمیہ سے جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، بطور عاریت مزید اسلحہ حاصل کیا اور مکہ کے مختلف لوگوں سے ایک لاکھ تیس ہزار درہم سامان جنگ کے لئے بطور قرض بھی حاصل فرمایا، غرض کہ اب تک غزوات میں سب سے زیادہ تیاری اور مجاہدین کی کثیر تعداد کے ساتھ لشکر اسلام حنین کی طرف بڑھنے لگا۔

دس شوال منگل کے دن شام کے وقت یہ لشکر وادی میں داخل ہوا، آپ نے صبح کے انتظار میں وہیں قیام فرمایا، دشمنوں نے راتوں رات پہاڑیوں پر اپنے مورچے بنالئے، گھاٹی کے سرے پر ماہر تیر اندازوں کو بٹھادیا، جب لشکر اسلام آگے بڑھا اور ایک تنگ راستہ سے اس کا گذر ہونے لگا تو چھپے ہوئے تیر اندازوں نے اس طرح تیر کی بارش شروع کردی کہ گویا مینھ برس رہا ہے، صفین درہم برہم ہوگئیں اور لوگوں کے قدم اکھڑ گئے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چٹان کی طرح جمے رہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نعرے لگائے :

انا النبی لا کذب ، أنا ابن عبد المطلب .

میں نبی ہوں اس میں کوئی جھوٹ نہیں، میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔

اس وقت آپ ﷺ کے ساتھ چچا حضرت عباس چچازاد بھائی حضرت ابوسفیان بن حارث، سیدنا حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم تھے، دشمن بار بار آپ ﷺ تک پہنچنے کی کوشش کرتے اور یہ جانثارانِ شمعِ نبوت ان کے قدم روک دیتے، پھر جب آپ ﷺ نے مہاجرین اور انصار کو آواز دی اور آپ کے حکم سے حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے صدا بلند کی تو پورا مجمع واپس آگیا اور بنو ہوازن کو شکست فاش ہوئی، چھ ہزار مرد، عورتیں اور بچے قید ہوئے اور اونٹوں، بکریوں اور چاندی کی ایک بڑی مقدار مجاہدین کے ہاتھ آئی۔

اس غزوہ سے پہلے مسلمانوں کی تیاریوں اور بنو ہوازن کی تعداد کی قلت کو دیکھتے ہوئے بعض حضرات کو یہ خیال ہوا کہ آج مسلمانوں کو شکست نہیں ہو سکتی اور یہ خیال بعض حضرات کی زبان تک پہنچ گیا، اللہ تعالیٰ نے اس پر تنبیہ فرمائی اور حنین کی ابتدائی شکست بظاہر اس کی پاداش میں ہوئی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

اللہ اس سے پہلے بہت سے مواقع پر تمہاری مدد کر چکا ہے، ابھی غزوۂ
حنین کے روز اس کی دستگیری کی شان تم دیکھ چکے ہو، اس روز تمہیں
اپنی کثرت تعداد کا غرہ تھا، مگر وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی
وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگے نکلے، پھر
اللہ نے اپنی سکینت اپنے رسول اور مؤمنین پر نازل فرمائی اور وہ لشکر
اتارے، جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور منکرین حق کو سزا دی، یہی بدلہ ہے
ان لوگوں کے لئے جو حق کا انکار کریں۔ (التوبہ: ۵-۲٦)

طائف بنوثقیف کا مسکن تھا، انھوں نے حنین میں شکست کھا کر طائف کا رُخ کیا، بنو ثقیف کے بچے کھچے لوگ نیز فوج کا پر جوش جوان سپہ سالا مالک بن عوف بھی یہیں قلعہ بن ہوگیا اور کافی دنوں قلعہ کا محاصرہ جاری رہا، اہل سیرت نے اس کی مدت پندرہ دونوں سے چالیس دنوں تک کی لکھی ہے، بارہ صحابہ شہید ہوگئے؛ لیکن بنوثقیف اور بنوہوازن نے ایسی سخت تیراندازی کی اور بعض نئے ہتھیار استعمال کیا، جس کے ذریعہ دور سے پتھر برسائے جاسکتے تھے اور قلعہ کی دیوار میں شگاف ڈالے جاسکتے تھے، منجنیق سے آگ بھی پھینکی جاتی تھی؛ لیکن اہل طائف کی کوشش کے سامانے کامیابی نہیں ہوسکی اور اشارۂ غیبی ہوا کہ اس وقت یہ مہم ترک کردی جائے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کی طرف روانہ ہوئے اور جاتے ہوئے 'جعرانہ' میں رکے، یہیں سارا مال غنیمت آچکا تھا، دس روز تک آپ ﷺ نے اہل ہوازن کا انتظار کیا کہ شاید وہ اپنے سامان اور عورتوں کے لئے آئیں؛ لیکن نہیں آئے، تب آپ ﷺ نے مالِ غنیمت کی تقسیم فرمائی اور زیادہ تر مال مکہ کے نومسلموں اور دوسرے نومسلم سرداروں کو عنایت فرمائے، تاکہ وہ پوری طرح اسلام پر ثابت قدم ہوجائیں، عام مہاجرین نیز انصار کو اس مالِ غنیمت سے کوئی خاص حصہ نہیں دیا گیا۔

فطری طور پر انصار کے درمیان اس کا بڑا چرچا تھا، انھیں احساس ہوا کہ مکہ فتح ہونے کے بعد آپ ﷺ کے قربت اپنے شہر کے لوگوں سے بڑھ گئی ہے اور ہماری قربانیوں کی اہمیت

کم ہوگئی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ بات پہنچی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو ایک خیمہ میں جمع فرمایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: اے گروہ انصار! یہ کیا بات ہے، جو تمہارے بارے میں مجھ تک پہنچی ہے؟ انصار کے بزرگ اور ذمہ دار افراد نے عرض کیا: کچھ نوجوانوں کے احساسات ہیں، جو آپ ﷺ تک پہنچے ہیں، پھر آپ ﷺ نے نہایت ہی مؤثر خطاب فرمایا، آپ ﷺ نے کہا: اے جماعت انصار! کیا یہ حقیقت نہیں کہ تم گمراہ تھے اور اللہ نے میرے ذریعہ تمہیں ہدایت سے سرفراز فرمایا؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ تم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے اور اللہ نے میرے ذریعہ تمہارے شکستہ دلوں کو جوڑا؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ تم مفلس اور نادار تھے، اللہ نے میری وجہ سے تمہیں غنی اور مالدار بنایا؟ انصار ہر سوال کے جواب میں کہتے جاتے: ''بے شک یہ اللہ اور اس کے رسول کا احسان ہے''۔

پھر آپ ﷺ کا ارشاد ہوا، تم چاہو تو کہہ سکتے ہو کہ آپ کے لوگوں نے آپ کو جھٹلایا اور ہم نے آپ کی تصدیق کی، تم کہہ سکتے ہو کہ آپ کے لوگوں نے آپ کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا تھا، ہم نے آپ کے ہاتھ تھامے، تم کہہ سکتے ہو کہ آپ کے لوگوں نے آپ کو گھر سے نکال دیا اور ہم نے آپ کو پناہ دی، تم کہہ سکتے ہو کہ آپ بے سروسامانی کی حالت میں اور ہم نے آپ پر اپنے مال نثار کئے، اگر تم ایسا کہو گے تو سچ کہو گے؛ لیکن اے گروہ انصار! تم متاع دنیا کے لئے رنجیدہ اور ملول خاطر ہو، میں نے کچھ نو مسلموں کو اسلام پر ثابت قدم رہنے کے لئے ان کے ساتھ دل داری کی ہے اور تم کو تمہارے ایمان کے حوالہ کر دیا، کیا تمہیں یہ بات پسند نہیں کہ لوگ اونٹ، بکریاں اور چوپائے سمیت کرلے جائیں اور تم اپنے ساتھ اللہ کے رسول کو لے جاؤ؟ خدا کی قسم! جو تم لے کر اپنے گھر جاؤ گے، وہ اس سے بہتر ہے، جسے وہ لے جائیں گے، اس ذات کی قسم! جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اگر ہجرت کا درجہ بڑا نہیں ہوتا، تو میں انصار ہی کا ایک فرد ہوتا، اگر تمام لوگ ایک راستہ چلیں اور انصار ایک گھاٹی کو اختیار کریں، تو میں انصار کے ساتھ چلنا پسند کروں گا، انصار میرا شعار، یعنی ''جسم سے لگا ہوا کپڑا'' ہیں اور دوسرے لوگ ''دثار'' یعنی ''کپڑے کا بیرونی حصہ'' ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ خطاب اتنا

مؤثر اور دل گداز تھا، کہ کوئی آنکھ نہ تھی، جو اشک بار نہ ہو اور کوئی داڑھی نہ تھی، جس نے آنسوؤں سے وضوء نہیں کیا ہو، حاضرین کی ہچکیاں بندھ گئیں اور وہ پکار اٹھے، کہ ہمیں رسول عربی چاہئے اور کچھ نہ چاہئے۔

غزوۂ حنین وطائف کے اس واقعہ میں عبرت وموعظت کے کئی پہلو ہیں :

○ اسباب ووسائل کا استعمال کرنا ایمان وتوکل کے خلاف نہیں، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ حنین کے لئے بھرپور تیاری کی اور محاصرۂ طائف میں منجنیق بھی استعمال کیا اور واقعہ کی تفصیلات کے مطابق چمڑے کی بکتر بند گاڑیاں بھی استعمال کی گئیں۔

○ یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمان اپنی کسی مہم میں غیر مسلم بھائیوں سے بھی مدد لے سکتے ہیں، آپ نے مشرکین مکہ سے قرض لیا، صفوان بن امیہ سے ہتھیار لیا اور غیر مسلم سپاہیوں کو بھی اپنے ساتھ شریک فرمایا۔

○ یہ بھی معلوم ہوا کہ اسباب ووسائل اختیار تو کرنا چاہئے؛ لیکن کبھی بھی ان پر ناز نہ ہو اور عجب وپندار پیدا نہ ہو جائے، ہمیشہ اپنے پروردگار پر نظر رہے، حنین کے موقع سے بعض لوگوں کو اپنی عددی کثرت پر بھروسہ ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے باضابطہ تنبیہ فرمائی۔

○ جو لوگ ہدایت سے محروم ہیں، ان کے تئیں مسلمان کے دل میں ہمدردی، بہی خواہی، اور محبت کا جذبہ ہونا چاہئے کہ انھیں ایمان کی نعمت میسر ہو جائے، چنانچہ دیکھئے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے بنو ثقیف کے لئے بددُعاء کی خواہش کی؛ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق می ں ایمان اور ہدایت کی دُعاء فرمائی۔

○ مسلمانوں کو میدانِ جنگ میں جس قدر بہادر ہونا چاہئے، صلح کی میز پر اسی قدر فراخ دل اور فیاض بھی ہونا چاہئے، قبیلۂ بنی ہوازن کا مقابلہ بھی بے جگری سے کیا گیا اور جب ان کا وفد مدینہ آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری فیاضی سے کام لیتے ہوئے، ان کے قیدی ان کو واپس بھی کر دیئے۔

○ اسلام کی اشاعت، فتنہ سے حفاظت اور حق پر استقامت کے لئے تعاون کرنا ھی

سنت نبوی ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے نو مسلموں کے ساتھ معاملہ فرمایا، آج مسلمانوں کو اس طریقہ کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے اور یہ مزاجِ شریعت کے عین مطابق ہے۔

○ اسلام رشتۂ و پیوند کا اسیر نہیں، یہ آفاقی مذہب ہے، اسلامی اُخوت کا رشتہ تمام رشتوں سے بڑھ کر ہے اور خدا اور اس کے رسول کی خوشنودی اصل مقصود ہے، اس کے مقابلہ متاعِ دنیا کی کوئی اہمیت نہیں، یہی وہ حقیقت ہے، جس نے چند فقروں میں انصار کے شکوہ کو دور کر دیا۔

○ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کی تمام قربانیوں کا صاف طور پر ذکر فرمایا اور واضح طور پر اس کا اعتراف کیا، اس سے اقرار و اعتراف کا سبق ملتا ہے، اُمت کے جس شخص اور جس گروہ نے جو خدمت انجام دی ہو، اس کا اعتراف کیا جانا چاہئے اور اس کے اظہار میں کوئی تکلف نہ ہونا چاہئے اور اس سلسلہ میں ذہنی تحفظ سے کام نہ لینا چاہئے، اعتراف سے حوصلہ بڑھتا ہے، محبت اضافہ ہوتا ہے اور اتحاد و اتفاق کو تقویت پہنچتی ہے۔

○ ○ ○ ○

وداعی خطاب!

جب مکہ فتح ہوگیا، پورا جزیرہ دامن اسلام میں آ گیا، اسلام کی دعوت عرب کی سرحدوں سے نکل کر عجمی نژاد حکومتوں اور اس عہد کی بڑی طاقتوں تک پہنچ گئی، اور آپ ﷺ کو یہ اشارۂ غیبی مل گیا کہ مقصد بعثت کی تکمیل ہوچکی ہے، اور اب نبوت کے آفتاب جہاں تاب کو روپوش ہونا ہے، تو ہجرت کے دسویں سال آپ ﷺ نے حج کا ارادہ فرمایا، یہ حج فرض ہونے کے بعد آپ ﷺ کا پہلا اور آخری حج تھا، اور اس سال کا انتخاب اس لئے کیا گیا تھا کہ اس سال حج اپنے صحیح وقت پر ہورہا تھا، ورنہ تو اس سے پہلے زمانۂ جاہلیت کے طریقہ کے مطابق سال میں دنوں کے اضافہ اور کمی کی وجہ سے حج اپنے وقت سے پہلے ہورہا تھا، یہ پورے جزیرۃ العرب میں پھیلے ہوئے مسلمانوں سے آپ ﷺ کی آخری ملاقات تھی، اسی لئے آپ ﷺ نے اس حج کے موقع سے کئی خطبے ارشاد فرمائے۔

ان خطبات میں سب سے تفصیلی خطبہ وہ ہے جو ۹/ ذوالحجہ (یوم عرفہ) کو اپنی اونٹنی ''قصویٰ'' پر کھڑے ہوکر جبل رحمت کے قریب آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا، اس حج میں تقریباً سوا لاکھ اہل ایمان آپ ﷺ کے ساتھ شریک تھے، اور ربیعہؓ بن امیہ بن خلف کو اس بات پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مامور فرمایا تھا کہ وہ بلند آواز میں آپ ﷺ کے خطبہ کو لوگوں تک پہنچائیں، یہ خطبہ اسلامی زندگی کا پورا نقشہ پیش کرتا ہے، مسلمانوں کے باہمی روابط، قصاص کے سلسلہ میں جاہلی نظام کی تردید، مالیات سے متعلق بنیادی احکام، توحید، انسانی وحدت، غلاموں اور عورتوں کے ساتھ حسن سلوک، اور بنیادی انسانی حقوق، گویا اسلامی نظام حیات کا ایک اُصولی اور دستوری منشور ہے، جسے دریا بکوزہ کے مصداق آپ نے چند خوبصورت، اثر انگیز اور معنویت سے بھرپور فقروں میں سمیٹ دیا ہے، مختلف اہل علم نے اس خطبہ کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے، اور جناب صبار دانش نے ''خطبہ حجۃ الوداع'' کے عنوان سے مختلف احادیث

اور کتب سیرت سے اس خطبہ کے فقروں کو جمع کیا ہے، جو شاید اس سلسلہ کی سب سے نتیجہ خیز کاوش ہے، اس فکر انگیز خطبہ کا ترجمہ اس حقیر کے قلم سے پیش خدمت ہے :

تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، ہم اسی کی ستائش کرتے ہیں، اسی سے مدد کے خواستگار ہیں، مغفرت کے طالب ہیں اور اسی کی طرف توبہ کرتے ہیں، ہم اپنے نفسوں کی برائیوں اور برے اعمال سے اللہ کی پناہ میں آتے ہیں، اللہ تعالیٰ جسے ہدایت عطا فرمائے اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا، اور جسے محروم کردے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا، میں گواہی دیتا ہوں کہ تنہا اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، نہ اس کا کوئی شریک ہے، اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

اللہ کے بندو! میں تم لوگوں کو اللہ کے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں، اس کی فرمانبرداری کی تلقین کرتا ہوں، اور بہتر بات سے اپنی گفتگو کا آغاز کرتا ہوں۔

حمد و ستائش کے بعد، لوگو! میری بات سنو تو تمہیں زندگی ملے گی، میں تم پر اچھی طرح واضح کردیتا ہوں؛ کیوں کہ مجھے نہیں معلوم کہ اس سال کے بعد اس جگہ میری تم لوگوں سے ملاقات ہوسکے گی یا نہیں؟ —— پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسیح دجال کا ذکر کیا، اور تفصیل سے اس کا ذکر فرمایا، پھر ارشاد فرمایا: —— اللہ تعالیٰ نے جس نبی کو بھی بھیجا اس نے اپنی اُمت کو دجال سے ڈرایا ہے، حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی اُمت کو ڈرایا، اسی طرح آپ کے بعد دوسرے پیغمبروں نے بھی اپنی اُمتوں کو ڈرایا ہے، اور وہ تم لوگوں کے بیچ نکلے گا، تم پر اس کی حالت پوشیدہ نہیں رہے گی، تمہیں

معلوم ہونا چاہئے کہ وہ دائیں آنکھ سے کانا ہوگا، آنکھ ایسی ہوگی گویا گردش کرتا ہوا دانۂ انگور، خبردار! تم پر اس کی حالت مخفی نہ رہے، تم اس بات سے خوب واقف ہو کہ تمہارا پروردگار کانا نہیں ہے، آپ ﷺ نے اس بات کو مکرر ارشاد فرمایا۔

اے لوگو! یہ کون سا دن ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: حرمت والا دن ہے، ارشاد ہوا: یہ کون سا شہر ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: حرمت والا شہر، پھر ارشاد ہوا: یہ کون سا مہینہ ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: حرمت والا مہینہ، —— آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تمہارا خون، تمہارا مال، تمہاری عزت وآبرو، تمہارے جسم اور تمہاری اولاد تم میں سے ایک دوسرے پر حرام ہیں، اس وقت تک جب تک کہ تم اپنے رب سے جا ملو، ٹھیک اسی طرح جیسا کہ تمہارے اس دن کی، تمہارے اس مہینہ کی اور تمہارے اس شہر کی حرمت ہے، اور بے شک تم عنقریب اپنے پروردگار سے ملوگے، وہ تم سے تمہارے اعمال کے بارے میں سوال کرے گا، سنو! کیا میں نے خدا کا پیغام پہنچا دیا؟ لوگوں نے عرض کیا: ہاں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اللہ! گواہ رہنا!!

جس کے پاس کوئی امانت ہو وہ اسے صاحب امانت کو واپس کردے، قرض ادا کیا جائے، عاریت پر لی ہوئی چیز لوٹائی جائے، دودھ کے لئے ہدیہ کیا ہوا جانور دودھ سے استفادہ کے بعد مالک کو لوٹا دیا جائے، ضمانت قبول کرنے والا اپنی ضمانت کا ذمہ دار ہے، آگاہ ہوجاؤ! جاہلیت کی تمام باتیں میرے قدموں کے نیچے دفن کی جاتی ہیں، تمام سودی معاملات کالعدم قرار دیئے جاتے ہیں،

البتہ تم کو اپنا اصل مال لینے کی اجازت ہے، نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے، اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمادیا ہے کہ سود کی اجازت نہیں، اور پہلا سودی معاملہ جسے میں کالعدم قرار دیتا ہوں، میرے چچا عباس رضی اللہ عنہ بن عبدالمطلب کا وصول طلب سود ہے، عہد جاہلیت کے خون ساقط کئے جاتے ہیں، پہلا خون جسے میں ختم کرتا ہوں (میرے خاندان کے ایک شخص) عامر بن ربیعہ کا خون ہے، جو قبیلہ نبولیث میں زیر پرورش تھا، اور اسے قبیلۂ ہذیل کے لوگوں نے قتل کر دیا تھا۔

خبردار! زمانہ جاہلیت کے تمام طریقے، تمام خون، پانی اور مال کے دعوے میرے ان دونوں قدموں کے نیچے پامال ہیں، سوائے بیت اللہ شریف کی تولیت اور حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمت کے، جان بوجھ کر قتل کرنے میں قصاص ہے، شبہ عمد وہ ہے، جس میں لاٹھی اور پتھر سے قتل کا ارتکاب ہو، اور اس میں ایک سو اونٹ بطور دیت واجب ہیں، جس نے اس میں زیادتی کی، وہ اہل جاہلیت میں سے ہے، سنو! کیا میں نے اللہ کا پیغام پہنچا دیا؟ اے اللہ! آپ گواہ رہیں۔

اے گروہ قریش! ایسا نہ ہو کہ تم قیامت کے دن اپنی گردنوں پر دنیا اٹھا کر لاؤ، اور لوگ اپنے ساتھ آخرت لے کر آئیں، میں اللہ کے مقابلہ تمہارے کام نہیں آسکتا۔ ــــ اے گروہ قریش! بے شک اللہ نے تم سے جاہلیت کی نخوت اور آباء واجداد پر فخر وغرور کو ختم کر دیا ہے۔

اے لوگو! تم سب کا رب ایک ہے، اور تم سب کے باپ

بھی ایک ہیں، تم سب آدم کی اولاد ہو، اور آدم کی تخلیق مٹی سے ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

یا أیها الناس إنا خلقناکم من ذکر و أنثی وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ، إن أکرمکم عند اللہ أتقاکم ، إن اللہ علیم خبیر . (حجرات:۱۳)

اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد وعورت سے پیدا کیا ہے، اور تمھیں ، خاندانوں اور قبیلوں میں تقسیم کیا ہے ، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو ، بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے باعزت شخص وہ ہے، جو سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہو، بے شک اللہ تعالیٰ جاننے والے، خبر رکھنے والے ہیں۔

کسی عربی کو کسی عجمی پر، اور کسی عجمی کو کسی عربی پر فضیلت حاصل نہیں، نہ کسی گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر فضیلت حاصل ہے، مگر تقویٰ ہی کی بنیاد پر، سنو! کیا میں نے اللہ کا پیغام پہنچا دیا؟ اے اللہ! آپ گواہ رہیے، لوگوں نے عرض کیا: ہاں۔

اے لوگو! شیطان اس بات سے مایوس ہوگیا ہے ، کہ تمہاری اسی زمین میں کبھی بھی اس کی پرستش ہوگی، لیکن وہ اس بات پر راضی ہے کہ عبادت کے سوا تمہارے ان اعمال میں شیطان کی اطاعت کی جائے، جنہیں تم معمولی خیال کرتے ہو، لہٰذا اپنے دین کے معاملہ میں شیطان سے بچ کر رہو۔

اے لوگو! ''نسیٔ'' (مہینہ کو ہٹا کر آگے پیچھے کر دینا) کفر میں زیادتی ہے، اس سے وہ لوگ گمراہ ہوتے ہیں، جنھوں نے کفر کیا ہے، وہ ایک سال تو اسے حلال کر لیتے ہیں، اور دوسرے سال

حرام؛ تا کہ حرمت کے مہینوں کی جو تعداد مقرر ہے، اسے پورا کرلیں ؛ چنانچہ اسی طرح وہ اللہ کے حرام کئے ہوئے کو حلال اور اللہ کے حلال کئے ہوئے کو حرام کرلیتے ہیں، کسی سال صفر کو حلال کرلیتے ہیں، (اور دوسرے سال حرام) اور ایک سال محرم کو حرام قرار دیتے ہیں، (اور دوسرے سال حلال) —— یہی ''نسئی'' ہے، اب زمانہ گھوم کر اسی ہیئت پر آ گیا ہے، جس پر وہ آسمان وزمین کی تخلیق کے دن سے تھا، مہینوں کی تعداد اللہ کے نزدیک آسمان و زمین کی پیدائش ہی کے دن سے بارہ ہے، جس کا ذکر اللہ کی کتاب میں ہے، ان میں سے چار مہینے حرام ہیں، تین مہینے مسلسل اور ایک مہینہ الگ سے، ذوقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب جو جمادی الثانیہ اور شعبان کے درمیان ہے، یہی درست دین ہے، لہٰذا ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو، —— سنو! کیا میں نے تم کو اللہ کا پیغام پہنچا دیا؟ بارِالٰہا! آپ گواہ رہئے!!

اے لوگو! بے شک تمہاری عورتوں کے تم پر حقوق ہیں، اور تمہارا بھی ان پر حق ہے، کہ وہ تمہارے بستر کو تمہارے سوا کسی اور کو روندنے کا موقع نہ دیں، (بالخصوص جن کو تم ناپسند کرتے ہو)، اور کسی ایسے شخص کو تمہاری اجازت کے بغیر تمہارے گھر میں داخل نہ ہونے دیں، جن کا داخل ہونا تمہیں ناگوار ہو، وہ کھلی ہوئی بے حیائی کا ارتکاب نہ کریں، اور اچھی بات میں تمہاری نافرمانی کا ارتکاب نہ کریں، پھر اگر تمہیں ان کی طرف سے سرکشی کا اندیشہ ہو، تو اللہ تعالیٰ نے تم کو اجازت دی ہے کہ انھیں سمجھاؤ، اس سے باز آنے پر مجبور کرو، ان سے بستر الگ کرلو، اور ان کی ایسی سرزنش کرو جو

تکلیف دہ نہ ہو، پس اگر وہ باز آجائیں اور معروف یعنی اچھی باتوں میں تمہاری اطاعت کرنے لگیں تو تم پر واجب ہے کہ بہتر طریقہ پر ان کی خوراک و پوشاک کا نظم کرو، عورتیں گویا تمہاری قید میں ہیں، کہ وہ اپنے آپ کے لئے کسی چیز پر قادر نہیں ہیں، تم نے انھیں اللہ کی امانت کے طور پر حاصل کیا ہے، اور اللہ کے احکام کے واسطے سے ان کی عصمتوں کو اپنے اوپر حلال کیا ہے، لہٰذا عورتوں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو، اور ان کے ساتھ بہتر سلوک کرنے کی نصیحت کو قبول کرو۔

اپنے غلاموں کا خیال رکھو، جو خود کھاؤ وہ انھیں کھلاؤ، جو خود پہنو وہ انھیں پہناؤ، اگر وہ کوئی ایسا گناہ کر گذریں جنھیں تم معاف نہیں کرنا چاہتے تو انھیں فروخت کر دو، اللہ کے بندو! انھیں عذاب نہ دو، —— سنو! کیا میں نے تم کو اللہ کے پیغام پہنچا دیئے؟ خداوندا! آپ گواہ رہئے!!

اے لوگو! اپنے امیر کی بات سنو، اور اس کی اطاعت کرو، اگرچہ تم پر کوئی ناک کٹا حبشی غلام ہی کیوں نہ امیر بنایا گیا ہو، جو تمہارے معاملات میں اللہ کی کتاب کو نافذ کرتا ہو —— اے لوگو! اچھی طرح سمجھ لو، اور میری بات کو سن لو، کہ میں نے خدا کا پیغام تم تک پہنچا دیا ہے، اور میں تمہارے درمیان ایک واضح چیز چھوڑ کر جارہا ہوں، اگر تم انھیں تھامے رہو گے، تو ہرگز گمراہ نہ ہوگے، ''اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت'' لہٰذا اس پر عمل کرو۔

اے لوگو! میری بات سنو، کہ میں اللہ کا پیغام تم کو پہنچا چکا ہوں، اور اسے اچھی طرح سمجھو، تاکہ تم جان لو کہ ہر مسلمان مسلمان

کا بھائی ہے، اور تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں، کسی شخص کے لئے اس کے بھائی کا مال حلال نہیں ہے سوائے اس کے جو اس نے اپنی خوشی سے عطا کیا ہو، پس تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو —— آگاہ ہو جاؤ، کسی عورت کے لئے شوہر کی اجازت کے بغیر اس کے مال میں سے کچھ دے دینا جائز نہیں، سنو! کیا میں نے تمہیں خدا کا پیغام نہیں پہنچا دیا؟ اے اللہ! آپ گواہ رہیں!!

خبردار! میرے بعد کفر کی طرف نہ پلٹ جانا کہ تم ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو، آگاہ رہو، کیا میں نے تم کو اللہ کا پیغام پہنچا نہیں دیا؟ بارِ الٰہا! گواہ رہئے!!

اے لوگو! بے شک اللہ تعالیٰ نے ہر حق دار کا حق متعین کر دیا ہے، اور ہر وارث کا حصۂ میراث مقرر فرما دیا ہے، لٰہذا کسی وارث کے لئے وصیت جائز نہیں، اور تہائی سے زیادہ وصیت (کسی اور کے لئے بھی) جائز نہیں۔

خبردار! اولاد اس شخص کی ہے جس کے بستر پر پیدا ہوئی ہو، اور زانی کے لئے پتھر ہے، اور اس کا حساب اللہ کے حوالہ ہے —— آگاہ رہو! جس نے اپنے باپ سے بے رغبتی کی وجہ سے دوسرے کی طرف اپنے آپ کو منسوب کیا، یا کسی غلام نے دوسرے کو اپنا آقا قرار دیا، تو اس پر اللہ کی، فرشتوں کی، اور تمام انسانوں کی لعنت ہے، اللہ تعالیٰ اس سے نہ فرض قبول کریں گے اور نہ نفل، —— خبردار! مجرم اپنے آپ ہی ہر جرم کرتا ہے، کسی کے جرم کی ذمہ داری اس کی اولاد پر یا اولاد کے جرم کی ذمہ داری اس کے والد پر نہیں ہے۔

اے لوگو! میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، اور نہ

تمہارے بعد کوئی اُمت آنے والی ہے، خبردار! ہر نبی کی دعوت سوائے میرے ختم ہوچکی ہے، میں نے اس کو قیامت تک کے لئے اپنے پرودگار کے پاس جمع کردیا ہے، (لہٰذا اب قیامت تک کسی کو نبوت عطاء نہیں ہوگی) بے شک انبیاء کثرت تعداد پر فخر کریں گے، پس تم مجھ کو رسوا نہ کرنا، میں ''حوض کوثر'' کے دروازہ پر تم لوگوں کا انتظار کروں گا۔

سنو! اپنے پروردگار کی بندگی کرو، پنج وقتہ نماز ادا کرو، رمضان المبارک کا روزہ رکھو، خوش دلی کے ساتھ اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرو، اپنے پروردگار کے گھر کا حج کرو، اپنے امیروں کی اطاعت کرو، اور اس طرح اپنے پروردگار کی جنت میں داخل ہوجاؤ—— راوی کہتے ہیں کہ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں صدقہ کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:—— خوب صدقہ کرو، نہیں معلوم کہ تم اس سال کے بعد پھر مجھے دیکھ پاؤ گے یا نہیں؟ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل یمن کے لئے ''یلملم''، اور اہل عراق یا اہل مشرق کے لئے ''ذات عرق'' کو میقات (احرام باندھنے کی آخری جگہ) قرار دیا۔

میں تمہیں بتاتا ہوں کہ مسلمان کون ہیں؟ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور جس کے ہاتھ سے تمام مسلمان محفوظ ہوں، میں تمہیں آگاہ کرتا ہوں کہ مومن کون ہے؟ مومن وہ ہے جس سے مسلمان اپنی جان و مال کے معاملہ میں مامون ہوں، میں بتاتا ہوں کہ مہاجر کون ہے؟ مہاجر وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی برائیوں سے بچے، اور مجاہد وہ ہے جو اللہ کی اطاعت وفرماں برداری میں اپنے نفس سے جہاد کرے، ایک مومن دوسرے مومن پر اسی

طرح حرام ہے، جیسا کہ آج کے دن کی حرمت ہے، ایک مسلمان کا گوشت دوسرے مسلمان پر حرام ہے، اور یہ جائز نہیں کہ وہ اس کی غیبت کی صورت میں اسے کھائے، کسی مومن کو تکلیف پہنچانا حرام ہے، مومن پر حرام ہے کہ دوسرے مسلمانوں کو از راہ تحقیر دھکا دے، ایک مومن پر دوسرے مومن کی عزت ریزی حرام ہے، اور ایک مومن کے چہرے پر طمانچہ مارنا دوسرے مومن کے لئے حرام ہے، اللہ پر قسمیں نہ کھایا کرو، (یعنی یہ نہ کہو کہ خدا کی قسم! فلاں شخص فلاں کام ضرور ہی کرے گا) جس نے اللہ کے ذمہ لگا کر قسمیں کھائیں، اللہ تعالیٰ اس کو جھوٹا ظاہر کر دے گا۔

میں بھی جواب دہ ہوں اور تم لوگ بھی جوابدہ ہو، تم لوگوں سے میرے بارے میں سوال ہوگا تو تم کیا کہو گے؟ صحابہ نے عرض کیا: ہم گواہی دیں گے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیا، پیغام رسانی کا حق ادا کر دیا، اور ہم لوگوں کے ساتھ خیر خواہی فرمائی، پس اللہ تعالیٰ آپ کو بہترین اجر عطاء فرمائے، —— آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کیا تم لوگ اس بات کی گواہی نہیں دیتے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، جنت حق ہے، دوزخ حق ہے، قیامت آ کر رہے گی، جس میں کوئی شبہ نہیں اور اللہ تعالیٰ قبر والوں کو پھر زندہ فرمائیں گے؟؟ —— سامعین نے عرض کیا: ہم لوگ اس کی گواہی دیتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگشت شہادت آسمان کی طرف اُٹھاتے اور پھر لوگوں کی طرف جھکاتے ہوئے تین بار فرمایا: بارِ الٰہا! آپ گواہ رہئے!!

پھر فرمایا: اے لوگو! میں حوض کوثر پر تم لوگوں سے پہلے پہنچنے والا ہوں، پھر تم بھی اس حوض پر آؤ گے، اس حوض کی وسعت بصریٰ سے مقام صنعاء کی مسافت کے برابر ہے، اس حوض میں ستاروں کی تعداد کے برابر چاندی کے پیالے ہیں، جب تم میرے پاس آؤ گے تو میں تم سے کتاب وسنت (ثقلین) کے بارے میں دریافت کروں گا، تو تم اچھی طرح نظر رکھنا کہ میرے بعد ان دونوں کے ساتھ تمہارے کیا معاملہ رہتا ہے؟ "ثقل اکبر" اللہ کی کتاب ہے، جس کا ایک کنارہ اللہ کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا کنارہ تمہارے ہاتھ میں ہے، پس اس کو مضبوطی سے تھامے رہو، نہ راہ راست سے ہٹو، نہ اس میں کوئی تبدیلی کرو، اور میری عزت، میرے اہل بیت، میں مجھے خدائے لطیف وخبیر نے بتایا ہے کہ یہ دونوں (کتاب اللہ، اور عترت رسول) ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوں گے، یہاں تک کہ حوض کوثر پر آ جائیں۔

بے شک صدقہ میرے لئے اور میرے اہل بیت کے لئے حلال نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اونٹنی کی گردن کا ایک بال پکڑا اور فرمایا: خدا کی قسم! اس کے برابر اور اس کے ہم وزن زکوٰۃ بھی ان کے لئے جائز نہیں۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو اس وقت موجود ہے، وہ اس کو پیغام پہنچا دے جو موجود نہیں ہے، ممکن ہے کہ جسے پیغام پہنچایا جائے، وہ سننے والے سے زیادہ اس کو محفوظ کرنے والا ہو ـــــ سنو! کیا میں نے تمہیں خدا کا پیغام پہنچا نہیں دیا؟؟

تم پر سلامتی اور اللہ کی رحمتیں ہوں

یہ وہ عظیم الشان، معنویت سے بھرپور اور مضامین کے اعتبار سے جامع ترین خطبہ ہے، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۹/ذی الحجہ ۱۰ھ کو عرفات کے میدان میں دیا تھا، جناب صبار دانش نے حدیث وسیرت اور عربی زبان وادب سے متعلق ۱۹ کتابوں سے اس خطبے کے اقتباسات کو جمع کیا ہے، یہ خطبہ ایک طرف مسلمانوں کے لئے انفرادی اور اجتماعی زندگی اور حقوق اللہ اور حقوق الناس کے سلسلہ میں روشن چراغ اور مینارۂ نور ہے، اور دوسری طرف انسانی حقوق کا ایک جامع چارٹ اور راہنما دستور ہے، جس میں جان و مال اور عزت وآبرو کی حفاظت، عورتوں اور غلاموں کے حقوق، اور ان تمام اُمور پر روشنی ڈالی گئی ہے، جو ایک امن وسلامتی کے متلاشی سماج کے لئے ضروری ہے، آیئے اس خطبہ کو بار بار پڑھئے، اس آئینہ میں اپنی تصویر دیکھنے کی کوشش کیجئے، اور اپنی زندگی کے خط وخال کو درست کیجئے:

بہ مصطفیٰ بہ رساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
وگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی ست

○ ○ ○ ○

رفیق اعلیٰ کی طرف

حجۃ الوداع کے موقع پر منیٰ میں رسول اللہ ﷺ پر مکمل سورۂ نصر ایک ساتھ نازل ہوئی، جیسے سب سے پہلے ایک ساتھ سورۂ فاتحہ اتاری گئی، اسی طرح سب سے آخر میں ایک ساتھ سورۂ نصر کا نزول ہوا، پھر عرفات میں آپ ﷺ نے اپنا تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا اور حق رسالت ادا کرنے پر حاضرین سے گواہی لی، اسی کے بعد سورۂ مائدہ کی تیسری آیت نازل ہوئی :

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الإسلام دینا . (المائدہ:۳)

میں نے آج تم پر اپنی نعمت تمام کردی ہے اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسند کیا۔

سورۂ نصر ہی میں اس بات کا اشارہ موجود تھا کہ آپ ﷺ فریضۂ نبوت کو ادا کر چکے ہیں اور آپ ﷺ اس دنیا سے رخصت ہونے والے ہیں، چنانچہ مزاج شناسِ نبوت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر ان آیات کو سن کر گریہ طاری ہوگیا، پھر سورۂ مائدہ کی اس آیت نے اس امر کو مزید واضح کردیا، چنانچہ اس آیت کے نزول کے بعد صرف اکیاسی دنوں آپ دنیا میں رہے۔

حج سے واپسی کے بعد محرم اور صفر آپ ﷺ نے مدینہ منورہ میں گذارے اور کہیں کا قصد نہیں کیا، اسی دوران آپ ﷺ شہدائے اُحد کی زیارت کے لئے اُحد بھی تشریف لے گئے اور فرمایا کہ اب ہم بھی تم سے ملنے والے ہیں، جنت البقیع بھی تشریف لے گئے اور دیر تک اس قبرستان میں آسودۂ خواب خوش قسمتوں کے لئے دُعاء فرمائی، پھر ۱۶ صفر ۱۱ھ کو حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں ایک فوج روم کی طرف روانہ کی، معرکۂ روم میں اس سے پہلے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے والد حضرت زید رضی اللہ عنہ شہید ہو چکے تھے، حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی عمر اس وقت محض اٹھارہ سال کی تھی؛ اس لئے منافقین نے اعتراض کیا کہ ایک نوجوان غلام زادہ کو اکابر صحابہ

ﷺ پر امیر بنایا جارہا ہے؛ لیکن آپ ﷺ نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی، آپ ﷺ نے فرمایا: لوگوں نے اس کے والد زید پر بھی اعتراض کیا تھا؛ حالاں کہ وہ بھی امارت کے لائق تھا اور یہ بھی امارت کے لائق ہے، میں اس سے بھی محبت کرتا ہوں اور اس کے والد سے بھی محبت کرتا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری کا آغاز ہو چکا تھا، اسی درمیان آپ نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو روانہ فرمایا۔

اسی زمانہ میں آپ ﷺ نے خواب میں دیکھا کہ آپ ﷺ کے بازوؤں میں سونے کے کنگن ہیں، آپ ﷺ نے پھونکا اور یہ دونوں کنگن اڑ گئے، آپ ﷺ نے خواب کی تعبیر بیان فرمائی کہ اس سے یمن اور یمامہ سے ظاہر ہونے والے جھوٹے مدعیان نبوت کی طرف اشارہ ہے، اسی دوران اطلاع آئی کہ یمن پر اسود عنسی نے اور یمامہ پر مسیلمہ نے نبوت کے دعویٰ کے ساتھ قبضہ کرلیا ہے، اور بنو اسد کے طلیحہ بنت خویلد نے بھی اپنی نبوت کا اعلان کر کے سمیرا پر قبضہ کر کے اس کو اپنا مرکز بنالیا ہے، اسود تو آپ ﷺ کی وفات سے ایک دن پہلے ہی واصل جہنم ہو گیا اور باقی دونوں فتنے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں ختم ہوئے، صفر کے اواخر میں آپ ﷺ کی بیماری شروع ہوئی تھی، وفات سے سات دن پہلے حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں تشریف آوری ہوئی، اس وقت اتنا ضعف پیدا ہو چکا تھا کہ آپ ﷺ خود سے چل بھی نہ سکتے تھے، یہ ایک ہفتہ آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں گذارا، اس درمیان اپنی وفات سے چار دنوں پہلے آپ ﷺ مسجد نبوی میں تشریف لائے، لوگوں کو نماز پڑھائی اور مختصر خطبہ ارشاد فرمایا، اسی دوران ایک دن حضرت علی رضی اللہ عنہ اور فضل ابن عباس رضی اللہ عنہ کے ساتھ ظہر کے وقت مسجد میں تشریف لائے، ممبر پر بیٹھے، حمد وثناء فرمائی، اصحابِ اُحد کے لئے دُعاء مغفرت کی، پھر ارشاد فرمایا: ''اگر مجھ پر کسی کا حق ہو تو وہ مجھ سے لے لے، اگر میں نے کسی کی پیٹھ پر کوڑا مارا ہو تو میری پیٹھ حاضر ہے، وہ انتقام لے لے، کسی کی عزت کے خلاف کوئی بات کہی ہو تو وہ مجھے کہہ لے، کسی کا مال لیا ہو تو میرے مال میں سے اپنا حصہ لے لے، میرا سینہ کینہ سے خالی ہے، کوئی اس کا اندیشہ نہ رکھے'' آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ جو مجھ سے اپنا حق لے لے گا وہ مجھے زیادہ محبوب ہوگا، جو نہ

لینا چاہے، مجھ پر اپنا حق حلال کر دے۔

ان ایام علالت میں آپ ﷺ نے وقتاً فوقتاً صحابہ رضی اللہ عنہم کو مختلف نصیحتیں کیں، یہ نصیحتیں کسی رخصت ہونے والے مشفق باپ کی طرح تھیں، آپ ﷺ بیماری کی شدت میں فرماتے کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا ہے، تم ہرگز ایسا نہ کرنا، اس بات کو آپ ﷺ نے اپنی وفات سے چند دنوں پہلے ایک خطبہ میں بھی ارشاد فرمایا اور فرمایا: بارِ الٰہا! گواہ رہیئے کہ ہم نے حق کی بات پہنچادی ہے، آپ ﷺ نے اس درمیان غلاموں، باندیوں، بیویوں اور خادموں کے ساتھ حسن سلوک کی خاص طور پر تلقین فرمائی، آپ ﷺ نے مہاجرین کو خاص طور پر انصار کے احسانات اور ان کی وفا شعاری کی یاد دلائی اور ان کے ساتھ بہتر سلوک کی تلقین کی، ایک دن آپ ﷺ نے خاص طور پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے درجہ مقام ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ میرے خلیل ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں، آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ میں نے سب کے احسانات چکا دیئے ہیں سوائے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے، آپ ﷺ نے حکم دیا کہ جتنے دروازے مسجد کی طرف کھلے ہوئے ہیں، وہ سب بند کر دیئے جائیں، صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا دروازہ کھلا رکھا جائے، آپ ﷺ نے خاص طور پر وصیت فرمائی کہ یہود کو جزیرۃ العرب سے نکال دیا جائے، آپ ﷺ نے یہ بھی فرمادیا کہ میرا ترکہ میرے ورثہ میں تقسیم نہیں ہوگا۔

وفات سے ایک دن پہلے آپ ﷺ نے اپنے تمام غلام آزاد فرمادیئے، جن کی تعداد چالیس تک تھی، جو دینار موجود تھے، انھیں صدقہ فرمادیا، اسلحہ بھی مسلمانوں کو عنایت فرمادیا، آخری شب اس حال میں گذری کہ زرہ ایک یہودی کے پاس گیہوں کے عوض رہن رکھی ہوئی تھی، گھر میں چراغ کے لئے تیل تک نہ تھا، چنانچہ پڑوسی سے عاریۃً منگایا، اگلے دن پیر کی صبح جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فجر کی نماز پڑھا رہے تھے، حجرۂ مبارک کا پردہ ہٹایا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نماز کی حالت میں دیکھ کر مسکرائے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پیچھے ہٹنا چاہا؛ لیکن آپ ﷺ نے ہاتھ کے اشارہ سے منع فرمادیا، یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری دیدار تھا۔

دن چڑھتے طبیعت بوجھل ہونے لگی، حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں

تازہ مسواک دیکھی تو نگاہِ شوق کا اشارہ پاکر حضرت عائشہؓ نے مسواک چبا کر اور نرم کر کے آپ ﷺ کے حوالہ کی، آپ ﷺ نے اسے اپنے دندان مبارک پر پھیرا، غرغرہ کی کیفیت طاری ہوئی، پانی کا پیالہ سامنے رکھا ہوا تھا، اس میں ہاتھ ڈبوتے اور چہرۂ اقدس پر ملتے، شدت تکلیف کو دیکھ کر حضرت فاطمہؓ بے چین ہوگئیں تو فرمایا: آج کے بعد تمہارے باپ پر پھر کوئی مصیبت نہیں آئے گی، اس کیفیت میں بھی آپ ﷺ نے نماز کے اہتمام اور غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت فرمائی، اس وقت آپ ﷺ کا سر مبارک اُم المومنین حضرت عائشہؓ کے سینہ پر تھا، یہاں تک آنکھیں چڑھ گئیں، ہاتھ جھک گئے، زبان مبارک پر یہ کلمات جاری ہوئے: ان انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ، جن پر تو نے انعام فرمایا، خداوندا! مجھے بخش دیجئے، مجھ پر رحم فرمایئے، آخر میں تین بار ''اللهم فی الرفيق الاعلیٰ'' فرمایا اور روح مبارک پرواز کرگئی، یہ بارہ ربیع الاول کی تاریخ تھی، پیر کا دن تھا اور آفتاب ڈھل چکا تھا یا ڈھلنے کے قریب تھا، لوگوں نے حساب لگایا ہے کہ دنیا میں آپ ﷺ کے قیام کی پوری مدت بائیس ہزار، تین سوتیس دن، چھ گھنٹے ہوتے ہیں۔

جہاں وفات ہوئی، وہیں حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے قبر مبارک کھودنے کا شرف حاصل کیا حضرت عباس، حضرت علی، حضرت عباس کے دونوں صاحبزادے فضل، قثم، حضرت اسامہ اور شقران رضی اللہ عنہم نے غسل دینے کا شرف حاصل کیا، پھر لوگوں نے تنہا تنہا نماز پڑھی، پہلے اہل بیت نے، پھر مہاجرین نے، اس کے بعد انصار نے، بعض راویوں کا بیان ہے کہ تقریباً تین ہزار افراد نے نماز پڑھی، منگل کا پورا دن تجہیز و تکفین میں گذر گیا، چہارشنبہ کی شب میں آپ ﷺ کی تدفین ہوئی، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عباس رضی اللہ عنہ، اہل بیت اور مہاجرین وانصار میں سے کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم قبر میں اترے، تدفین سے فارغ ہونے کے بعد واپس، حضرت انس رضی اللہ عنہ حجرۂ فاطمہؓ —— کے سامنے رک گئے، حضرت فاطمہؓ جو پیکر رنج والم بنی ہوئی تھیں —— نے بے ساختہ فرمایا: تم لوگوں کے دلوں نے کس طرح گوارہ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر منوں مٹی ڈالو اور تنہا چھوڑ کر آجاؤ، اس طرح حضرت آمنہ کا بدر کامل، جو مکہ میں ظاہر ہوا تھا، مدینہ کی

سرزمین میں مستور ہوگیا، مگر اس کی کرنیں ایسی زندہ و پائندہ اور عالم تاب ہیں کہ قیامت تک پوری کائنات اس سے روشن رہے گی۔

حیات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس آخری باب میں بھی مسلمانوں کے لئے عبرت وموعظت کی بہت سے سوغات ہیں :

- شہداء اُحد اور جنت البقیع کے مدفونین کی زیارت اور ان کے لئے دُعاء واستغفار سے سبق ملا کہ اپنے مرحوم بزرگوں، دوستوں، عزیزوں اور محسنوں کو فراموش نہ کرنا چاہئے، بلکہ ان کے لئے دُعاء کا اہتمام کرنا چاہئے۔

- جو لوگ زندہ ہوں، ان کے احسانات وخدمات کے اعتراف کا حوصلہ ہونا چاہئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور انصار کی اسلام کے ئے قربانی وفدا کاری کا تذکرہ مرض وفات میں بھی فرمایا، یہ جذبۂ اعتراف نہ صرف اظہار حقیقت ہوتا ہے، بلکہ دلوں کو جوڑتا، محبت کو بڑھاتا اور تعلقات کو خوشگوار رکھتا ہے۔

- مسلمانوں کا مزاج یہ ہونا چاہئے کہ آخر دم تک دین کی فکر اسے بے چین رکھے، بیماری کی شدت ہے، مگر اس وقت بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی امارت میں روم کی طرف فوج بھیج رہے ہیں، صحابہ رضی اللہ عنہم کو عقیدہ وعمل کے بارے میں تلقین کی جارہی ہے اور آخر وقت تک مختلف اعمال کی توجہ دلائی جارہی ہے، نہ یہ کہ انسان آخری سانس تک صرف دنیا کی فکر میں بے قرار رہے۔

- حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اور ان کے صاحبزادے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو امیر فوج بنانے سے معلوم ہوا کہ اسلام میں اصل اہمیت صلاحیت اور اہلیت کی ہے، نہ کہ خاندان اور محض سماجی اعتبار سے معزز سمجھے جانے کی، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو کام باپ سے متعلق رہا ہو، اگر بیٹے میں اس کی صلاحیت موجود ہو، تو اسے اس کام کے سونپنے میں حرج نہیں؛ بلکہ ایک حد تک بہتر ہے؛ کیوں کہ اس کام سے اس کا جذباتی اور قلبی تعلق ہوتا ہے، نہ یہ درست ہے کہ ذمہ داریاں میراث کی طرح تقسیم کی جائیں اور نہ یہ صحیح ہے کہ بیٹے کو ہر قیمت پر باپ کی جگہ کا اہل

سمجھا جائے۔

○ جھوٹے مدعیان نبوت کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فکر مندی اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو تاکید سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ختم نبوت کا عقیدہ کتنی اہمیت کا حامل ہے؟ یہ ایمان کی اساس و بنیاد ہے اور اس کے خلاف اٹھنے والے فتنہ کو روکنا نہایت اہم فریضہ ہے، اس لئے موجودہ دور میں مسلمانوں کو خاص طور پر فتنۂ قادیانیت کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔

○ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مرضِ وفات میں بھی مسجد کی طرف متوجہ رہے؛ بلکہ جب چل کر نہ آ سکے تو رفقاء کی مدد سے مسجد تشریف لے گئے، اس سے جماعت کی اور مسجد میں پہنچ کر نماز ادا کرنے کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔

○ آپ مرضِ وفات کے دوران مسجد میں تشریف لائے اور مسلمانوں سے خواہش کی کہ اگر میں نے کسی کے ساتھ زیادتی کی ہو تو وہ مجھ سے بدلہ لے لے، حالاں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم معصوم تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی؛ بلکہ ہمیشہ دوسروں کی زیادتیوں کو سہا اور برداشت کیا، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حقوق الناس کی کیا اہمیت ہے؟ انسان کو دنیا سے اس حال میں جانا چاہئے کہ اس کے دامن پر ظلم و حق تلفی کا کوئی داغ نہ ہو اور اگر کوئی داغ ہو تو وہ جانے سے پہلے دھو لے؛ کیوں کہ دنیا میں حق ادا کر دینا آخرت میں ادا کرنے سے آسان ہے۔

○ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مرضِ وفات میں بار بار غلاموں، باندیوں اور عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین فرماتے رہے، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کے ساتھ بہتر سلوک کی ترغیب دی؛ کیوں کہ انصار کی تعداد بھی کم ہوتی جاتی تھی، اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ کمزوروں، مظلوموں، غلاموں اور پس ماندہ طبقات کی طرف خصوصی توجہ ہونی چاہئے، تاکہ ان کے اوپر اٹھنے میں مدد مل سکے، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو لوگ کمزور ہوتے ہیں، انھیں اور دبایا جاتا ہے اور ناانصافی روا رکھی جاتی ہے؛ تاکہ وہ کبھی سر اٹھا نہ سکیں۔

○ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات سے پہلے غلام آزاد کئے، صدقہ فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ یوں تو انسان کو پوری زندگی ہی صدقہ و انفاق کا اہتمام کرنا چاہئے؛ لیکن جب

اس کی عمر کا آفتاب لبِ بام آچکا ہو تو اس طرف خصوصی توجہ ہونی چاہئے ؛ تا کہ جب اللہ کے دربار میں حاضر ہو تو کچھ اعمال بھی اس کے ساتھ ہوں ، نہ یہ کہ آخر آخر وقت تک صرف اپنے لئے اور اپنے بچوں کے لئے دولت کی فکر اس کو بے چین رکھتی ہو۔

○ مرض وفات میں آپ ﷺ کے ارشادات و معمولات سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا درجہ و مقام بھی واضح ہوتا ہے کہ اسلام کے لئے ان کی خدمات کیسے روشن نقوش کی حیثیت رکھتی ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان کا درجہ سب سے بڑا ہے۔

○ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو نماز میں مشغول دیکھ کر تبسم فرمایا ، جو ظاہر ہے کہ خوشی اور مسرت کا اظہار تھا ، اس سے معلوم ہوا کہ اگر اللہ تعالیٰ دین کے کسی کام کی توفیق عطا فرمائے تو اہل ایمان کو اس پر اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر خوشی ہونی چاہئے ، جو کسی دنیوی کام کے انجام تک پہنچنے پر ہوتی ہے اور یہ خوشی جذبۂ شکر کے ساتھ ہونی چاہئے ، نہ کہ فخر و تکبر کے طور پر۔

○ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرضِ وفات میں بیماری کی شدید مشقت اٹھائی ، روایت میں اس کی تفصیلات آئی ہیں ؛ بلکہ بعض روایتوں میں ہے کہ حضور ﷺ نے یہ بھی خواہش فرمائی کہ اس اُمت کو موت کی جو تکلیف پہنچنے والی ہے ، اس کا کچھ حصہ بھی آپ ﷺ کی تکلیف میں شامل کر دیا جائے ، جس سے آپ ﷺ کی شفقت و محبت کا بھی اندازہ ہوتا ہے ، اس سے جو سبق ملتا ہے وہ یہ ہے کہ بیماری کی تکلیف کو صبر و رضا کے ساتھ جھیلنا چاہئے اور اگر کسی شخص کو موت میں سخت تکلیف اٹھانی پڑے تو اس سے بدشگونی نہ لینی چاہئے اور اس کو اس کے گناہوں کا نتیجہ نہیں تصور کرنا چاہئے۔

○ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بیماری میں بھی مسواک کا اہتمام فرمایا ، اس سے جہاں مسواک کی اہمیت معلوم ہوتی ہے ، وہیں صفائی ستھرائی کی بھی اہمیت معلوم ہوتی ہے ، منھ اور دانت ایسی چیزیں ہیں ، جنھیں صاف کرنے کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے ، اس لئے آپ ﷺ اس کا زیادہ اہتمام فرماتے تھے ، لیکن ویسے ہر سطح پر صفائی ستھرائی مطلوب ہے اور رسول

اللہ ﷺ کے یہاں اس کا بڑا اہتمام تھا۔

○ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض وفات میں آخر آخر تک جس بات کی طرف بار بار متوجہ فرمایا، وہ یہ ہے کہ مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وہ مبالغہ آمیز اور غلو پر مبنی رویہ اختیار نہیں کریں، جو پہلی اُمتوں نے اپنے پیغمبروں کے ساتھ کیا تھا، خاص طور پر قبر کی تعظیم میں اس درجہ آگے بڑھ جانا، جو تعبد اور بندگی کے درجہ میں آجائے۔

○ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تمام ہی صحابہ رضی اللہ عنہم بے حد محبت رکھتے تھے اور یہ سب آپ کے جاں نثاروں کا قافلہ تھا، اس کے باوجود غسل اور تجہیز و تکفین میں زیادہ تر آپ ﷺ کے اہل بیت شامل تھے، اس سے معلوم ہوا کہ ان مرحلوں کو محرم رشتہ داروں کو انجام دینا چاہئے، مردوں کے ساتھ مرد رشتہ دار اور عورتوں کے ساتھ خواتین رشتہ دار، آج کل بڑے شہروں میں پیشہ ور غسال اور غسالہ سے غسل دلانے کا رواج بڑھتا جارہا ہے اور خود اپنے رشتہ دار غسل دینے سے راہِ فرار اختیار کرتے ہیں، یہ درست نہیں ہے؛ بلکہ ایک طرح سے مردہ کے ساتھ حق تلفی ہے۔

○ اسلام سے پہلے خواتین کو منحوس سمجھا جاتا تھا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حال میں جان جاں آفریں کے حوالہ کی کہ آپ کا سر مبارک اُم المومنین سیدنا حضرت عائشہؓ کے سینہ پر تھا، اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی نگاہ میں عورتوں کی کیا عظمت ہے اور آپ نے ان کو کس طرح توقیر و احترام کے مقام پر پہنچایا ہے؟

○ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک پر جو آخری فقرہ آیا اور جس پر آپ ﷺ کی روح پرواز کر گئی، وہ اللہ تعالیٰ کے ذکر پر مشتمل تھا، پس ہر مؤمن کی کوشش ہونی چاہئے کہ کلمۂ توحید پر اس کا خاتمہ ہو اور وہ زندگی میں بھی اپنے لئے حسن خاتمہ اور حسن انجام کے لئے دُعاء کرتا رہے۔

○ ○ ○ ○

خلق عظیم

اللہ کی طرف سے جو نبی و رسول آتے ہیں، وہ انسانیت کے لئے نمونہ اور آئیڈیل ہوتے ہیں، ان کا ہر عمل لوگوں کے لئے دلیل کی حیثیت رکھتا ہے، اسی لئے وہ زندگی کے تمام شعبوں میں اعلیٰ ترین معیار پر قائم رہتے ہیں، ان کی عبادتیں خشوع و خضوع کا نمونہ ہوتی ہیں، ان کے معاملات راست گوئی اور پاکیزگی پر مبنی ہوتے ہیں، ان کی معاشرت حسن سلوک اور سماج کے مختلف طبقہ کے ساتھ برتاؤ کا اور حقوق کی ادائیگی کی بہترین مثال ہوتی ہے، اسی طرح وہ اخلاق کی اعلیٰ ترین سطح پر ہوتے ہیں، یہ بات اس لئے بھی ضروری ہے کہ نبی کا بنیادی فریضہ دعوت و تبلیغ ہے اور دعوت کے مؤثر ہونے کے لئے ضروری ہے کہ مدعو پر اس کے اخلاق وسلوک کے بہترین نقوش ثبت ہوں، کیوں کہ محبت اور خوش اخلاقی سخت سے سخت دل کو بھی پگھلانے کی طاقت رکھتی ہے، قرآن مجید میں مختلف انبیاء کرام اور ان کی اقوام کے واقعات ذکر کئے گئے ہیں، ان واقعات میں قوموں کی انبیاء کے ساتھ بدسلوکی و بدزبانی اور اس کے مقابلہ میں انبیاء کی طرف سے انتہائی درجہ تحمل و بردباری اور خوش گفتاری کا ذکر ملتا ہے۔

جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ بلند اخلاق کی اعلیٰ ترین سطح پر تھے، اسی لئے قرآن مجید میں آپ ﷺ کے بارے میں کہا گیا ہے: ''إنک لعلی خلق عظیم''۔ (القلم:۴)

اکثر اخلاقی کمزوریوں کی بنیاد یہ ہوتی ہے کہ انسان کے قول و فعل میں تضاد ہوتا ہے، وہ گفتگو تو بہت اونچی کرتا ہے، لیکن عمل میں بہت نیچی سطح پر ہوتا ہے، آپ ﷺ کی زندگی میں قول و فعل کا تضاد نہیں تھا، آپ ﷺ لوگوں کو جس بات کی دعوت دیتے اسی پر آپ ﷺ کا عمل ہوتا، اسی لئے حضرت عائشہؓ نے ایک شخص کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ اخلاق محمدی کا خلاصہ یہ

ہے کہ آپ ﷺ سراپا قرآن تھے: ''کان خلقه القرآن'' ۔(مسند احمد: ۶/۹۱)

یوں تو آپ ﷺ کی زندگی کے تمام پہلو روشنی میں ہیں، لیکن اس کا سب سے وسیع باب اخلاق کا ہے، آپ ﷺ کے مزاج کا نمایاں پہلو تواضع وانکساری کا تھا، آپ مقام نبوت پر فائز ہیں اور پورا جزیرۃ العرب آپ کے قدموں میں ہے، لیکن تواضع اور سادگی کا حال یہ تھا کہ گھر پر خود جھاڑو دیتے، بازار سے سودا لاتے، جوتی پھٹ جاتی تو اسے سی لیتے، کھانے کے لئے بیٹھتے تو نہایت تواضع کی کیفیت کے ساتھ، اور فرماتے کہ میں اس طرح کھاتا ہوں جیسے غلام کو کھانا چاہئے: '' أنا آكل كما يأكل العبد ''لوگ تعظیم کے لئے کھڑے ہوتے تو منع فرما دیتے، اگر کسی باندی کا بھی کوئی کام ہوتا اور وہ بھی سرِ راہ اپنی کسی ضرورت کے لئے روکتی تو رُک جاتے، رفقاء کے ساتھ اس طرح بیٹھتے کہ امتیازی شناخت نہ ہونے کی بنا پر لوگ آپ کو پہچان نہیں پاتے، اپنے لئے تعظیم کے جائز الفاظ بھی پسند نہیں فرماتے، ایک بار بعض حاضرین نے عرض کیا: آپ ﷺ ہمارے آقا (سید) ہیں، فرمایا: ''نہیں، آقا تو خدا کی ذات ہے'' ایک بار لوگوں نے عرض کیا کہ آپ ہم میں سب سے افضل و برتر ہیں، آپ ﷺ نے اس تعبیر کو بھی پسند نہیں فرمایا، تواضع وفروتنی کا یہ حال تھا کہ فتح مکہ کے موقعہ پر جب دس ہزار مسلح جاں نثار آپ ﷺ کے گرد و پیش تھے، انکساری کی وجہ سے آپ کا سر مبارک اس قدر جھکا ہوا تھا کہ بار بار اونٹنی کے کوہان سے ٹکرا جاتا تھا۔

تواضع ہی کا ایک پہلو یہ تھا کہ تعظیم میں مبالغہ کو پسند نہیں کرتے تھے، بعض صحابہ دوسرے علاقوں میں گئے تو دیکھا کہ لوگ اپنے سردار کو سجدہ کرتے ہیں، انھوں نے آپ ﷺ سے سجدہ کی اجازت چاہی اور عرض کیا کہ آپ تو ان سے زیادہ مسجود بننے کے مستحق ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر کسی کو سجدہ کی اجازت ہوتی تو بیوی کو اجازت ہوتی کہ وہ شوہر کو سجدہ کرے، لیکن خدا کے سوا کسی کے لئے سجدہ روا نہیں، ایک صاحب دورانِ گفتگو بول پڑے: جو خدا چاہے اور آپ ﷺ چاہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، صرف خدا چاہے، ایک انصاری کی شادی میں کچھ لڑکیاں دف کے ساتھ نغمے گا رہی تھیں، انھوں نے اس میں ایک مصرع پڑھا:

وفینا نبی یعلم ما فی غد

اور ہمارے بیچ ایسے پیغمبر ہیں جو کل واقع ہونے والی باتوں کو جانتے ہیں۔

آپ ﷺ نے اس مصرع کو پڑھنے سے منع فرمایا، جس روز آپ کے صاحب زادے حضرت ابراہیم کی وفات ہوئی، اتفاق سے اسی دن سورج گہن لگ گیا، جاہلیت کے قدیم تصور کے مطابق لوگ کہنے لگے کہ صاحب زادۂ نبوی کے انتقال کی وجہ سے گہن لگا ہے، آپ ﷺ نے فوراً اس کی تردید میں باضابطہ خطبہ ارشاد فرمایا۔

عفو و درگزر کا باب آپ کے یہاں بہت وسیع تھا اور دوستوں اور دشمنوں سب کو اس سے سرفراز ہونے کا موقع ملتا تھا، جب مکہ فتح ہوا تو وہ سارے لوگ آپ کے سامنے موجود تھے، جنھوں نے آپ کے قتل کے منصوبے بنائے، آپ کو اور آپ کے رفقاء کو جسمانی اذیتیں پہنچائیں، آپ کو برا بھلا کہا، معاشی ناکہ بندی کی اور آپ کے پورے خاندان کو دانہ دانہ کے لئے ترسایا، آپ کی صاحب زادیوں کے طئے رشتے توڑوا دیئے، لیکن آپ نے ان سبھوں کو بیک جنبش زبان معاف فرمادیا، یہاں تک کہ ان کے جور و ظلم کا ذکر کر کے انھیں شرمندہ بھی نہیں فرمایا، آپ نے محبوب چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قاتل حضرت وحشی، ان کا کلیجہ چبانے والی حضرت ہندہؓ، بدترین دشمن ابوجہل کے بیٹے عکرمہ اور غزوہ احد اور غزوہ خندق میں مشرکین کی قیادت کرنے والے ابوسفیان سبھوں کو دامن عفو میں پناہ دی۔

آپ ﷺ ہمیشہ عدل و انصاف کی تلقین فرماتے تھے اور خود بھی اس پر عمل کرتے تھے، عرب کا ایک معزز قبیلہ بنومخزوم کی ایک عورت چوری میں پکڑی گئی، لوگ چاہتے تھے کہ وہ سزا سے بچ جائے، آپ کے پروردہ اور محبوب حضرت اسامہ بن زید نے سفارش کی، آپ ﷺ نے اس پر سخت ناگواری کا اظہار کیا اور سزا جاری فرمائی، عدل و انصاف کے معاملہ میں مسلمان اور غیر مسلم کا کوئی امتیاز نہیں تھا، اس لئے یہود بھی اپنے معاملات طئے کرانے آپ ﷺ کے پاس آیا کرتے تھے۔

سخاوت و فیاضی کا حال یہ تھا کہ کوئی سائل واپس نہیں ہوسکتا تھا، اگر اپنے پاس موجود نہ

ہوتو دوسروں سے قرض لے کر دیتے، اگر کچھ درہم ودینار بچا رہتا تو جب تک تقسیم نہ ہو جائے بے چین رہتے، جن لوگوں کی وفات ہوتی، فرماتے کہ ان کے قرض کی ادائیگی میرے ذمہ ہے، اور متروکہ ان کے ورثہ کے لئے، آپ ﷺ کی اس فیاضی کا نتیجہ تھا کہ جب آپ کی وفات ہوئی تو چراغ میں تیل تک نہیں تھا اور آپ ﷺ کی زرہ مبارک چند کیلو جو پر رہن تھی، جہاں آپ کے دربار سے کوئی حاجت مند نامراد واپس نہیں ہوتا تھا، وہیں دوسری طرف سوال اور گداگری کو بھی ناپسند فرماتے تھے، ایک صاحب بھیک مانگتے ہوئے آئے تو آپ ﷺ نے ان کا بستر اور پیالہ (جس کے وہ مالک تھے) منگوایا اور اس کی ڈاک لگوائی، دو درہم میں فروخت ہوا، آپ ﷺ نے انھیں ایک درہم خرچ کے لئے دیا اور دوسرے درہم سے کلہاڑی بنادی کہ جنگل سے لکڑی لائیں اور فروخت کریں، پندرہ دنوں بعد جب وہ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو دس درہم ان کے پاس جمع ہو چکا تھا، آپ نے ارشاد فرمایا: یہ اچھا ہے یا یہ کہ قیامت کے دن چہرہ پر گدائی کا داغ لے کر جاتے؟

انسانی برابری اور مساوات کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے، آپ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں صاف فرمادیا کہ کالے اور گورے یا عربی و عجمی ہونے کی وجہ سے ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے، اسی لئے جب بھی کوئی کام ہوتا، آپ ﷺ اپنے رفقاء کے ساتھ مل کر اس کام میں شریک رہتے، حج میں قریش حدودِ حرم سے باہر نکلنے کو اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے، اس لئے عرفات نہیں جاتے تھے، آپ ﷺ نے اس امتیاز کو ختم کیا اور عرفہ کے وقوف کو حج کے لئے لازم قرار دیا۔

اسلام سے پہلے عربوں میں شرم وحیاء کی بڑی کمی تھی، لوگ کھلے عام برہنہ حالت میں غسل کرتے تھے، قضاء حاجت کے وقت بھی پردہ کا اہتمام نہیں تھا، یہاں تک کہ کعبۃ اللہ کا طواف بھی بے لباس کیا جاتا تھا، آپ ﷺ نے بے حیائی کی ان تمام باتوں کو منع فرمایا، صحابہ رضی اللہ عنہم کا بیان ہے کہ آپ ﷺ دوشیزہ لڑکیوں سے بھی زیادہ شرمیلے تھے اور ہر موقع پر حیاء کا لحاظ کرتے تھے۔

آپ کی راست گوئی اور دیانت مکہ میں ضرب المثل تھی ، لوگ آپ ﷺ کو صادق اور امین کہتے تھے، خود ابو جہل بھی اعتراف کرتا تھا کہ آپ ﷺ جھوٹے نہیں ہیں، لیکن کہتا تھا کہ جو باتیں آپ پیش کر رہے ہیں وہ صحیح نہیں ہے، آپ نے جب بادشاہ روم کو دعوت اسلام کا مکتوب لکھا، اس وقت ابوسفیان روم میں ہی تھے، جو اس وقت آپ کے سخت مخالف تھے، چنانچہ شاہ روم نے ابوسفیان سے آپ کے بارے میں دریافت کیا کہ کیا وہ دعویٔ نبوت سے پہلے جھوٹ بھی بولتے تھے؟ ابوسفیان نے کہا: نہیں، غرض کہ دشمنوں کو بھی آپ کی راست گوئی کا اعتراف تھا، دیانت داری کا حال یہ تھا کہ دشمن بھی اپنی امانتیں آپ کے پاس رکھواتے تھے، چنانچہ جب آپ ﷺ نے ہجرت فرمائی تو اہل مکہ کی بہت سی امانتیں آپ ﷺ کے پاس تھیں، جنھیں آپ ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حوالہ کر کے گئے۔

ایفاء عہد کا آپ کو بڑا لحاظ تھا، صلح حدیبیہ میں جو شرطیں طئے پائیں آپ ان پر سختی سے قائم رہے، بعض مظلوم مسلمانوں کی قابل رحم حالت دیکھ کر بھی وعدہ خلافی کرنا گوارہ نہ کیا، غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی تعداد دشمنوں کے مقابلہ ایک تہائی سے بھی کم تھی، اس لئے ایک ایک آدمی کی اہمیت تھی، چنانچہ عین جنگ کے وقت حذیفہ بن یمان اور ان کے والد یمان (جن کا اصل نام حسیل بن جابر تھا) کہیں سے آ رہے تھے کہ ان دونوں کو اہل مکہ نے پکڑ لیا، لیکن اس شرط پر چھوڑا کہ وہ جنگ میں آپ کا ساتھ نہیں دیں گے، یہ مسلمانوں کے ساتھ غزوہ میں شریک ہونا چاہتے تھے، لیکن آپ نے انھیں واپس کر دیا اور فرمایا کہ ہم ہر حال میں وعدہ پورا کرنے کے قائل ہیں، نبوت سے پہلے ایک صاحب سے معاملہ ہوا وہ آپ ﷺ کو بیٹھا کر چلے گئے کہ آ کر حساب کر دیتا ہوں، مگر ان کو خیال نہیں رہا، تین دنوں بعد آئے تو آپ ﷺ اسی جگہ تشریف رکھتے تھے، آپ نے فرمایا: تین دنوں سے یہیں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔

غرض کہ آپ ﷺ کی ذات گرامی فضائل اخلاق کا نمونہ تھی اور رزائل اخلاق سے مبرا، آپ ﷺ نے نہ صرف اخلاق کی تعلیم دی، بلکہ عملاً انھیں برت کر دیکھایا بھی۔

○ ○ ○ ○

سلام اس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی

ایک بار آپ ﷺ اپنی ازواج سے کسی قدر ناراض ہوگئے اور چند دنوں کے لئے کنارہ کشی اختیار کی، ان ازواج میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ازواجِ مطہرات اور خصوصاً اپنی صاحب زادی کا یہ رویہ ناگوار ہوا، انھوں نے پہلے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی تنبیہ فرمائی، پھر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، آپ ﷺ ایک معمولی چھوٹے سے بالاخانہ میں مقیم تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب اس کمرہ پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ جسم مبارک پر صرف ایک تہبند ہے، ایک چارپائی ہے، جس پر بستر تک نہیں ہے، جسم اقدس پر رسیوں کے نشان ہیں، تکیہ ہے لیکن درختوں کی چھالوں سے بھرا ہوا، ایک معمولی سا مشکیزہ چھپر سے لٹک رہا ہے اور گھر کے ایک کونہ میں تھوڑی سی جَو رکھی ہوئی ہے، یہی آپ ﷺ کا سب کچھ ہے، یہ وقت تھا کہ جزیرۃ العرب میں دور دور تک اسلام کی دعوت پہنچ چکی تھی، روم وایران اور یمن ومصر کے درمیان عرب کے وسیع علاقے پر آپ ﷺ کی حکمرانی کا تخت بچھ چکا تھا اور صرف زمین ومکان ہی پر نہیں؛ بلکہ دل ودماغ پر بھی آپ کی حکومت قائم تھی —— اس کے باوجود بے سروسامانی کا یہ عالم تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ آبدیدہ ہوگئے اور کسی قدر دکھ کے ساتھ عرض کیا کہ قیصر وکسریٰ تو دنیا کا لطف اُٹھائیں اور عیش وعشرت میں مگن ہوں اور اللہ کے رسول کا یہ حال ہو کہ آپ ﷺ کے بدن پر ایک تہبند ہو اور جسم پر چارپائی کے نشانات ہوں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ بات آپ ﷺ کو پسند نہیں آئی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ وہ دنیا کا عیش وآرام حاصل کریں اور ہم آخرت کا؟ (ابن ماجه : باب ضجاع آل محمد ، ابواب الزهد، حدیث نمبر:۴۱۵۳)

یہ فقیری اور درویشی اس شخص کی ہے، جس کی زندگی میں پوری جزیرۃ العرب اس کا جاں نثار اور فداکار ہوگیا تھا اور اعداد وشمار کی زبان میں ہر دن ۲۷۴ مربع میل کا علاقہ اس کی دعوت حق پر لبیک کہہ رہا تھا ''صلی اللہ علیہ وسلم'' —— کچھ اسی پر موقوف نہیں بلکہ آپ ﷺ کی

پوری زندگی اسی فقیرانہ شان کا مظہر تھی، جس دن آپ ﷺ کی وفات ہوئی، اس دن آپ ﷺ کے گھر میں چراغ کے لئے تیل تک موجود نہیں تھا اور آپ ﷺ کی زرہ مبارک تھوڑے سے جو کے عوض یہودی کے یہاں گروی رکھی ہوئی تھی، (بخاری:۱/۳۴۱) ام المؤمنین حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ مہینوں ایسے گذر جاتے کہ گھر میں کھجور اور پانی کے سوا کھانے کو کوئی چیز میسر نہیں ہوتی، (زادالمعاد:۱/۱۴۸) فاقہ مستی کی تلخ کامی بھی معمول بن چکی تھی، جب فاقوں کی کثرت ہوتی اور کمزوری کا احساس ہوتا تو پیٹ پر پتھر باندھ لیتے، ایک بار ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے اپنی بھوک کے اظہار کے لئے پیٹ سے کپڑا اُٹھایا، پیٹ پر ایک پتھر بندھا ہوا تھا، آپ ﷺ نے شکم مبارک سے دامن اٹھایا تو دو دو پتھر بندھے تھے۔

فاقہ آپ ﷺ کے لئے کوئی اتفاقی یا غیر معمولی بات نہیں تھی، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ بسا اوقات آپ ﷺ تشریف لاتے، دریافت فرماتے کہ کچھ کھانے پینے کی چیز ہے؟ معلوم ہوتا کہ کھانے کی کوئی چیز نہیں، تو فرماتے کہ پھر آج روزہ کی نیت کر لیتا ہوں، (مسلم :۱/۳۶۴) ایک دفعہ آپ ﷺ، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سخت فاقہ کی حالت میں تھے، بھوک کی شدت تھی، آپ ﷺ اپنے دونوں رفقاء کے ساتھ ایک انصاری صحابی رضی اللہ عنہ کے یہاں تشریف لے گئے، وہ گھر پر موجود نہ تھے، لیکن جلد ہی آ گئے اور تواضع کے لئے بکرا ذبح کیا، آپ ﷺ نے رفقاء کے ساتھ تناول فرمایا، پھر فرمایا فاطمہؓ کے یہاں بھی فاقہ ہے اور صاحب خانہ کی اجازت سے کچھ ان کے لئے بھی بھیج دیا، (مسلم :۲/۱۷۶) بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ فاقہ کی وجہ سے گفتگو دشوار ہو جاتی، صحابہ محسوس کرتے اور اپنے گھر مدعو کرتے، غزوۂ خندق کے موقعہ سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے یہی کیفیت دیکھی اور اپنے گھر مدعو فرمایا۔ (بخاری:۲/۵۸۸)

آپ کا گھر بھی سادگی کا مرقع تھا، چھوٹے اور تنگ کمرے، حجرۂ عائشہ کو دیکھ کر آج بھی اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، چھتوں کی اونچائی صرف آٹھ فٹ تھی، کروفر کا اظہار آپ ﷺ کو ذرا بھی پسند نہ تھا، ایک بار تشریف لائے تو دیکھا کہ حضرت عائشہؓ نے مصوّر کپڑے کا پردہ لٹکایا ہوا ہے، آپ ﷺ نے ناگواری کا اظہار فرمایا اور حضرت عائشہؓ نے اسے پھاڑ کر تکیوں کا غلاف بنا دیا،

(جمع الفوائد :۱/۳۱۴)ایک دفعہ اپنی لختِ جگر حضرت فاطمہؓ کے گھر گئے دیکھا کہ دیوار پر از راہ آرائش پردے لگائے گئے ہیں، آپ ﷺ واپس ہوگئے، حضرت فاطمہؓ کو ناگواری کا علم ہوا تو ہٹادیا، تب پھر آپ تشریف لائے۔(جمع الفوائد:۱/۳۱۵)

آپ ﷺ خود جس حال میں رہتے تھے، اپنے اہل وعیال کو بھی اسی حال میں رکھتے تھے، ازواج مطہرات کے یہاں ہفتوں چولہا سلگنے کی نوبت نہیں آتی تھی، ایک دفعہ مالِ غنیمت میں بہت سارے غلام اور باندی آئے ہوئے تھے اور مسلمانوں پر تقسیم کئے جارہے تھے، حضرت فاطمہؓ بھی ایک خادم کی خواہش مند ہوئیں، ان کے ہاتھ اور کمر پر چکی پیستے اور مشکیزہ اُٹھاتے اُٹھاتے نشان پڑ گئے تھے، گھر میں کوئی کام کرنے والا نہیں تھا، سارے کام خود ہی کرنے پڑتے تھے، مگر آپ ﷺ نے خادم دینے کے بجائے ارشاد فرمایا :

> کیا تم کو اس سے بہتر چیز نہ دوں؟ پھر آپ ﷺ نے ان کو سوتے وقت ۳۳ دفعہ سبحان اللہ اور الحمد للہ اور ۳۴ دفعہ اللہ اکبر پڑھنے کی تلقین فرمائی اور بس۔

سیم وزر اور دنیا کا ساز وسامان آپ ﷺ کو اس طرح کھٹکتا تھا، جیسے جسم میں چبھتی ہوئی سوئی، ایک دفعہ ایک ضرورت مند آیا اور مدد کا طلب گار ہوا، آپ کے پاس دینے کو کچھ نہیں تھا، لیکن عادت مبارکہ تھی کہ سائل کو کبھی واپس نہیں فرماتے، اس لئے اللہ تعالیٰ کے بھروسہ اس کو بٹھالیا، اسی طرح دوسرا اور تیسرا سائل آتا رہا اور آپ ﷺ ان کو بٹھاتے رہے، اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک صاحب آئے اور چار اوقیہ چاندی آپ ﷺ کی خدمت میں ہدیہ کیا، آپ ﷺ نے ایک ایک اوقیہ تینوں کو مرحمت فرمادیا اور کسی اور ضرورت مند کا انتظار کرتے رہے، اتفاق سے کوئی حاجت مند شخص نہیں آیا اور چاندی آپ ﷺ کے پاس رہ گئی، آپ ﷺ نے اسے اپنے سرہانے میں رکھ لیا، لیکن پوری رات آپ ﷺ بے چین سے رہے اور بے سکون کروٹیں لیتے رہے، بے قرار ہوکر بار بار اٹھتے اور نماز ادا فرماتے، ام المؤمنین حضرت عائشہؓ نے اس کیفیت کا سبب دریافت کیا، تو چاندی نکال کر دکھایا اور فرمایا کہ یہی میری بے قراری کا باعث ہے، ڈر

لگتا ہے کہ کہیں ایسا ہو کہ یہ چاندی میرے پاس رہے اور اسی حال میں خدا کا بلاوا آ جائے۔

آپ ﷺ کے رہن سہن اور طور طریقہ سے قدم قدم پر درویشی ٹپکتی تھی، کپڑے اتنے معمولی اور موٹے ہوتے کہ کھدرا پن کی وجہ سے دوسروں کے لئے پہننا بھی دشوار ہوتا (زاد المعاد: ۱۴۱/۱) کھانے کا حال یہ ہوتا کہ جو میسر آ جاتا، ہنسی خوشی تناول فرماتے، ایک بار سرکہ مل گیا، جسے لوگ معمولی سمجھتے تھے، تو فرمایا کہ سرکہ تو بہترین سالن ہے، (ابن ماجہ: الأتدام بالخل، حدیث نمبر: ۳۳۱۸)، کھانے کی بیٹھک بھی تواضع اور فروتنی کا مظہر تھی، خود ارشاد فرمایا کہ میں اس طرح کھاتا ہوں، جس طرح کوئی غلام کھاتا ہے، ''انا آکل کما یاکل العبد'' (زاد المعاد: ۲۲۱/۴) کوئی امتیاز بالکل پسند نہ تھا، اپنے رفقاء کے ساتھ ایک ہی برتن میں تناول فرما لیتے، حجۃ الوداع کے موقعہ سے زمزم کے پاس تشریف لائے اور زمزم نوش فرمانے کی خواہش کی، زمزم پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور ان کے خانوادے کی ذمہ داری تھی، وہی اپنے بچوں کے ساتھ پانی کھینچتے اور حجاج کو پلاتے، حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اپنے فرزند حضرت فضل سے فرمایا کہ تمہاری والدہ کے پاس صاف برتن میں علاحدہ زمزم رکھا ہوا ہے اس میں سے حضور کے لئے لاؤ، یہاں جو پانی تھا، اس میں ہر شخص کا برتن اور ہاتھ پڑتا تھا، لیکن آپ ﷺ نے اس امتیاز کو پسند نہیں فرمایا اور اسی برتن میں سے پانی پینے کو ترجیح دی۔ (بخاری: ۲۲۱/۱)

گھریلو زندگی میں بھی آپ کے یہاں درویشی کا رنگ چھایا ہوا تھا، حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا گیا کہ گھر میں آپ کی کیا مصروفیت رہتی تھی؟ تو فرمایا کہ آپ ﷺ گھر کے کام کاج کرتے، اپنے کپڑوں میں خود پیوند لگا لیتے، جوتا پھٹ جاتا تو مرمت کر لیتے، دودھ دوہ لیتے، اونٹ کو چارہ بھی ڈال لیتے، جھاڑو بھی دے لیتے اور بازار سے سودے بھی خرید لاتے۔

اپنے رفقاء کے ساتھ آپ ﷺ کا رہن سہن بھی ایسا بے تکلفانہ اور سادہ ہوتا تھا کہ نہ کوئی دربار تھا نہ دربان، اور نہ کسی کے لئے ہٹو بچو، عامی سے عامی بے تکلف آپ کی مجلس میں آ سکتا تھا اور بے تکلفی سے سوال کر سکتا تھا، بعض دیہاتی تو اپنی کم علمی کی وجہ سے ایسی باتیں کر جاتے جن کو سوءِ ادب کہنا غلط نہ ہوگا، جب آپ ﷺ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے ہوتے

تو آپ ﷺ کو پہنچاننا دشوار ہو جاتا، ہجرت کے موقعہ سے جب آپ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رفیق سفر تھے، لوگوں کو سمجھ میں نہ آتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں اور آپ کے رفیق خاص حضرت ابوبکر کون ہیں؟ یہاں تک کہ جب دھوپ بڑھی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے رومال سے آپ پر سایہ کیا تب لوگوں کو معلوم ہوا کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔

کوئی بھی شخص آپ ﷺ سے اپنی ضرورت بے تکلف بیان کرتا اور آپ ﷺ اس کے کام آتے، حضرت خباب رضی اللہ عنہ ایک جنگی مہم پر گئے ہوئے تھے، ان کے گھر میں کوئی مرد موجود نہ تھا، آپ ﷺ پابندی سے ان کے یہاں تشریف لے جاتے اور بکریوں کا دودھ دوہ دیتے، حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ جب خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ بے تکلف ایک باندی نے آپ ﷺ کو روک لیا اور اپنی ضرورت سنائی، آپ ﷺ سنتے رہے اور آپ ﷺ نے ان کی ضرورت پوری فرمائی، حضرت عدی رضی اللہ عنہ نے اس کیفیت کو دیکھ کر فیصلہ کیا کہ یہ کسی بادشاہ کا عمل نہیں ہوسکتا، یہ کسی نبی ہی کا عمل ہوسکتا ہے! —— اجتماعی کاموں میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ مل جل کر کام کرتے اور ''من وتو'' کا امتیاز روا نہیں رکھتے، مسجد نبوی ﷺ کی تعمیر میں آپ ﷺ نے بہ نفس نفیس شرکت فرمائی اور عام آدمی کی طرح کام کرتے رہے حالاں کہ صحابہ چاہتے تھے کہ آپ ﷺ خود زحمت نہ فرمائیں (زاد المعاد:۶۲/۳) غزوۂ خندق کے موقعہ سے خندق کھودنے میں بھی آپ شریک رہے اور جو چٹان کسی سے ٹوٹ نہ پائی، آپ ﷺ نے اپنے دست مبارک سے اسے پاش پاش فرمادیا۔ (بخاری:۵۸۸/۲)

اپنے رفقاء کے ساتھ آپ ﷺ کا سلوک بالکل برادرانہ اور دوستانہ ہوتا تھا، لوگوں کو آپ ﷺ سے ملنے میں نہ کوئی خوف ہوتا اور نہ کوئی جھجک، وہ آپ ﷺ سے ملاقات کے مشتاق رہتے اور آپ کے دیدار سے محرومی ان پر بہت شاق گذرتی تھی، کبھی کسی کو کوئی تکلیف پہنچ جاتی تو آپ ﷺ کو معذرت کرنے میں ذرا بھی عار نہ ہوتی۔ ایک بار فوج کی صفیں درست کر رہے تھے، ایک لکڑی دست مبارک میں تھی، آپ ﷺ اس سے صف برابر کر رہے تھے،

ایک صحابی کے پیٹ میں لگ گئی اور معمولی سی خراش آ گئی، صحابی نے قصاص کا مطالبہ کیا، آپ ﷺ نے اپنے آپ کو قصاص کے لئے پیش فرمایا، انھوں نے عرض کیا کہ میرا پیٹ اس وقت کھلا ہوا تھا، آپ ﷺ نے شکم مبارک سے کپڑے اٹھا لئے، وہ آپ ﷺ سے چمٹ گئے اور شکم مبارک کو بوسہ دینے لگے کہ یہی میرا قصاص ہے — ایک دن مالِ غنیمت تقسیم فرما رہے تھے، اژدحام تھا، ایک صاحب گرے پڑ رہے تھے، یہاں تک کہ منھ کے بل آپ پر گر پڑے، آپ ﷺ کے ہاتھ میں ایک پتلی سی چھڑی تھی، آپ ﷺ نے اسی سے ان کو ہٹایا، اتفاق سے چھڑی سر میں لگ گئی اور کسی قدر خراش آ گئی، آپ ﷺ نے بے تکلف چھڑی بڑھا دی اور فرمایا کہ بدلہ لے لو، صحابی نے عرض کیا کہ میں نے معاف کیا۔

بعض اوقات اپنے رفقاء سے مزاح بھی فرماتے تھے، ایک بوڑھی خاتون آئیں اور سواری کے لئے اونٹنی کی خواستگار ہوئیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ انھیں اونٹنی کا ایک بچہ دے دو، انھوں نے پریشانی کا اظہار کیا اور کہا کہ اونٹنی کے بچہ سے کیا کام چل سکے گا؟ آپ ﷺ مسکرائے اور فرمایا: کوئی بھی اونٹ ہو، وہ اونٹنی کا بچہ ہی تو ہوتا ہے، (احیاء علوم الدین: ۱۲۹/۳)

حضرت زاہر رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے، کبھی کبھی آپ ﷺ ان سے مزاح فرماتے، ایک بار حضرت زاہر رضی اللہ عنہ بازار گئے کچھ سامان لے کر بیٹھے ہوئے تھے اور فروخت کر رہے تھے، آپ ﷺ پیچھے سے تشریف لائے، ان کی آنکھوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور از راہ مزاح فرمایا:

کون اس غلام کو خریدے گا؟ حضرت زاہر آپ ﷺ کو پہچان گئے، اپنی پشت شکم مبارک سے از راہ تبرک چمٹانے لگے اور کہتے جاتے کہ یہ سودا خام ہے۔

دوستوں کی دلداری کا بھی خوب خیال رکھتے، معمولی سے معمولی تحفہ بھی قبول فرماتے اور ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کی دعوت پر بھی تشریف لے جاتے، کسی کے یہاں موت ہوتی تو خود جا کر تعزیت فرماتے، کوئی معمولی شخص بھی بیمار پڑتا تو عیادت کا اہتمام فرماتے، غریبوں اور مسکینوں کو بھی عزیز رکھتے، غلاموں اور باندیوں کے ساتھ انصاف برتا جائے، اس کا پورا لحاظ رکھتے، کسی کی

معمولی سی بھی دل آزاری ہوجائے تو اس کی تلافی فرماتے، حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم غلام بھی تھے اور نابینا بھی، آپ ﷺ رؤساء قریش سے مصروف گفتگو تھے کہ اسی درمیان حاضر خدمت ہوئے اور کچھ سوال کیا، سرداران قریش کی پیشانی پر بل پڑ گیا، وہ ایسے لوگوں کو بہت حقیر اور کمتر جانتے تھے اور اس لائق بھی خیال نہ کرتے تھے کہ ان کو اپنی مجلسوں میں جگہ دی جائے، چنانچہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو دیکھتے ہی انھوں نے ناگواری کا اظہار کیا، آپ ﷺ کو بھی یہ خیال گذرا کہ کاش حضرت عبداللہ ابن مکتوم رضی اللہ عنہ نے اس وقت سوال نہ کیا ہوتا اور کسی قدر ناگوار خاطر ہوا، آپ ﷺ نے سوچا: ممکن تھا کہ ان سرداران قریش کو ایمان کی توفیق میسر آجاتی، قرآن مجید نے خود اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، (عبس: ۱-۲) حالاں کہ عبداللہ ابن مکتوم رضی اللہ عنہ نے اس کا کچھ برا نہیں مانا، لیکن آپ ﷺ کو اس کا اتنا پاس تھا کہ چودہ پندرہ دفعہ مدینے سے باہر جاتے ہوئے آپ ﷺ نے ان کو نابینا ہونے کے باوجود مدینہ کا گورنر مقرر فرمایا، حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے ساتھ موذن ہونے کا اعزاز بخشا، جو بہت بڑا اعزاز تھا اور جس کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر مجھ پر خلافت کی ذمہ داری نہ ہوتی، تو میں اذان دینے کو ترجیح دیتا۔

غرض کھانا، پینا، لباس و پوشاک، رہن سہن، گھریلو زندگی، دوستوں کے ساتھ سلوک اور سماج کے ساتھ اخلاق و برتاؤ، ہر جگہ ایک فقیرانہ شان نمایاں ہے، ایسی فقیری جس پر ہزار سلطنتیں نثار اور ایسی درویشی جس پر صد ہزار بادشاہتیں نچھاور —— یہ درویشی آپ ﷺ کو اتنی عزیز تھی کہ آپ ﷺ خدا کے حضور دُعاء فرماتے کہ بارالٰہا! مجھے مسکینی ہی کی حالت میں زندہ رکھ، اسی حالت میں اٹھا اور مسکینوں ہی کے ساتھ میرا حشر فرمایا! (ترمذی عن انس رضی اللہ عنہ) —— اسی لئے علامہ اقبالؔ نے کہا :

شوکت سنجر و سلیم ، ترے جلال کی نمود

فقر جنید و بایزید ، ترا جمال بے نقاب !

○ ○ ○ ○

باب چہارم

اُمت پر نبی کے حقوق

نبوتِ محمدی ﷺ اور اُمت کے فرائض

ربیع الاول کا مہینہ گذر رہا ہے اور ہر طرف جلسۂ سیرت النبی ﷺ کی دھوم دھام ہے، سیرت کے بہت سے پہلو ہیں، ہر پہلو قلب ونگاہ کے لئے جذب وکشش کا سامان اور ایمان ویقین کے لئے اضافہ وطمانیت کا باعث ہے، لیکن حضور ﷺ کے فضائل واحسانات کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ خود ہم پر آپ ﷺ کے تئیں کیا حقوق عائد ہوتے ہیں؟ اور کیا ہم واقعی ان حقوق کو ادا کر رہے ہیں؟؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا حق آپ ﷺ کی نبوت پر ایمان لانا ہے، ایمان محض زبان کے بول کا نام نہیں ہے بلکہ قلب ونظر کے یقین سے عبارت ہے، آپ ﷺ پر ایمان لانے میں یہ بات بھی شامل ہے کہ آپ ﷺ کے بتائے ہوئے احکام پر بھی ہمارا پورا ایقان ہو، ہماری سوچ یہ ہو کہ ہماری آنکھیں غلط دیکھ سکتی ہیں، ہمارے کان غلط سن سکتے ہیں، ہماری زبان غلط چکھ سکتی ہے، ہمارے ہاتھ چھونے اور محسوس کرنے میں غلطی کر سکتے ہیں؛ لیکن جو بات صحیح اور مستند طریقہ پر آپ ﷺ سے ثابت ہو وہ غلط نہیں ہوسکتی، اگر دل میں یہ یقین گھر کر لے تو انسان کی عملی زندگی میں ایسا انقلاب آجائے کہ اس کے روز وشب اور شام وسحر بدل جائیں، مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہے، مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات ہمیں بتاتی ہے کہ صدقہ برکت کا باعث ہے اور سود بے برکتی کا سبب، اب جو شخص آپ پر کامل ایمان وایقان رکھتا ہو، اس کا قلب وذہن یقیناً اس پر مطمئن ہوگا اور جس شخص کا ایمان آپ کی تعلیمات پر کھوکھلا ہو، وہ تو یہی سوچے گا کہ صدقہ سے مال کم ہوتا ہے اور سود سے بڑھتا ہے۔

نبوت محمدی پر ایمان کا اہم پہلو یہ ہے کہ آپ صرف نبی نہیں ہیں، بلکہ خاتم النبیین ہیں، آپ کے بعد کسی طرح کی کوئی نبوت باقی نہیں رہی، آپ کے بعد جو شخص نبوت کا دعویٰ کرے وہ بالیقین مرتد ہے اور اس کو قبول کرنے والے بھی دائرہ اسلام سے باہر ہیں، یہ ختم

نبوت کا عین تقاضہ ہے، ـــــ اس وقت ہندوستان کے مختلف علاقوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو ختم نبوت کے باغی ہیں اور جو پنجاب کے ایک مدعی نبوت کی طرف لوگوں کو دعوت دے رہے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سچا اور پکا ایمان ایک مسلمان کو تڑپا دے گا اور وہ اس فتنۂ کبریٰ کے استیصال کے لئے اُٹھ کھڑا ہوگا، اگر یہ بات ہماری غیرت کو جنبش نہیں دے تو یہ یقیناً ہمارے ایمان کی صداقت اور اس پر استقامت کے لئے ایک سوالیہ نشان ہوگی، ہمیں اس فتنہ کی بیخ کنی کے لئے قریہ قریہ پہنچنا اور اپنے بھولے بھالے ناواقف اور سادہ ذہن مسلمان بھائیوں کو صحیح صورت حال سمجھانا ہوگا اور اس طرح ہم عمل و قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے نبوت محمدی کے خلاف اس بغاوت کا مقابلہ کرسکیں گے۔

نبی کا اُمت پر دوسرا حق نبی سے محبت ہے، نبی سے اُمت کا تعلق محض قانونی اطاعت اور آئینی احترام کا نہیں؛ بلکہ ایسی اطاعت مطلوب ہے، جس کے پیچھے بے پناہ محبت کارفرما ہو، ایسی محبت کہ انسان لٹ کر محسوس کرے کہ اس نے پایا ہے، ایسی محبت کہ انسان کو کھو کر سمجھے کہ اس نے حاصل کیا ہے، ایسی محبت جس میں کانٹوں کا بستر پھولوں کی ''سیج'' کا لطف دے اور جس راہ میں شعلہ و آتش میں انسان شبنم کی خنکی محسوس کرے، جنون کو چھوتی ہوئی محبت اور فداکاری کے جذبہ سے معمور اتھاہ چاہت، یہی محبت آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی تھی؛ کہ انھیں جان دینا گوارہ تھا اور یہ بات بھی برداشت نہ تھی کہ ان کی جان بچ جائے اور آپ کے تلووں میں ایک کانٹا بھی چبھے۔

یہ حب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ایمان کی حفاظت کا بہت بڑا اثاثہ ہے، اللہ کا شکر ہے کہ مسلمان کتنا بھی گیا گذرا ہو، بے نمازی ہو، فرائض سے غافل ہو، شراب و کباب جیسی بری عادتوں میں مبتلا ہو، دین سے نابلد اور احکام شریعت سے ناواقف ہو، لیکن اس کے سینے میں حب نبوی کی چنگاری ضرور موجود ہوتی ہے، جو وقت پڑنے پر شعلۂ آتش بلکہ آتش فشاں بن جاتی ہے، اس جذبۂ محبت کو حقیر نہ سمجھنا چاہیئے، بلکہ اس کی لَو کو اور بڑھانا اور تیز کرنا چاہیئے اور ہمیں اپنے آباء واجداد سے حاصل ہونے والی اس امانت کو اگلی نسلوں تک پہنچانا چاہیئے، یہ محبت اسی وقت

پروان چڑھے گی، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پہچان ان میں پیدا ہو اور یہ پہچان کیوں کر پیدا ہوگی اگر وہ سیرت نبوی سے آگاہ نہ ہوں؟ مقام افسوس ہے کہ ہمارے بچے نہرو جی اور گاندھی جی کی سیرت سے تو واقف ہوں —— اور یقیناً اپنے وطن کی تاریخ سے آگاہ ہونا بھی ضروری ہے، —— لیکن وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بنیادی باتوں سے بھی واقف نہ ہوں، انھیں صحیح طور پر آپ کا اور آپ کے قریبی متعلقین کا نام تک معلوم نہ ہو، کیا اپنے بچوں کو سیرت محمدی سے واقف کرانے میں بھی ہمارے لئے کوئی رکاوٹ ہے؟ —— حق محبت کا ایک ادنیٰ حصہ بھی اسی وقت ادا ہوگا جب ہم محبت کی اس امانت کو اپنی نسلوں تک پہنچائیں گے۔

رسول اللہ ﷺ سے محبت کا ایک تقاضہ یہ بھی ہے کہ ہمیں آپ کی اُمت سے محبت ہو، رسول اللہ ﷺ نے اپنی اُمت کو اپنی اولاد کا درجہ دیا ہے، آپ نہ صرف اُمت کے صالح اور نیک لوگ بلکہ گنہگاروں سے بھی محبت فرمایا کرتے تھے، آپ کو گناہ سے نفرت ضرور تھی؛ لیکن گنہگاروں سے نفرت نہیں تھی، دیہات وقریہ جات کے لوگ جو مقام نبوت سے کما حقہ واقف نہ تھے اور اسی سادگی اور سادہ لوحی میں آپ کا ادب واحترام کما حقہ ملحوظ نہیں رکھتے تھے، آپ کا رویہ ان کے ساتھ بھی شفقت ورافت کا ہوتا تھا، آپ ان کی غلطیوں کو معاف کرتے، ان کی کوتاہیوں سے درگزر کرتے، ان کی تندخوئی پر تحمل اور بردباری سے کام لیتے، اُمت کے ایک ایک فرد کا دکھ خود محسوس کرتے اور ایک ایک انسان کی فلاح وہدایت کے لئے بے چین رہتے، غرض یہ پوری اُمت آپ کی شفقت ومحبت کے زیر سایہ ہے، جیسے کسی شخص کی محبت اس کی اولاد سے محبت کا باعث ہوتی ہے اور اس کے پورے کنبہ وخاندان سے انسان انس محسوس کرتا ہے، اسی طرح رسول اللہ ﷺ سے محبت کا لازمی تقاضہ یہ ہے کہ آپ کے اس پورے روحانی کنبہ سے ہمیں محبت ہو، ان کے زخم کو ہم اپنے سینہ پر محسوس کریں اور ان کی تکلیف ہم کو بے چین وبے قرار کر دے؛ اسی لئے رسول اللہ ﷺ اللہ اور اللہ کے رسول کے ساتھ ساتھ مسلمان کے ساتھ بھی خیر خواہی کی بیعت لیا کرتے تھے —— آج اُمت میں فرقہ بندی وپراگندگی کی صورت ہے، ہمارے دل ایک دوسرے سے ٹوٹے ہوئے ہیں اور ہماری صفیں بکھری ہوئی ہیں، غور کیجئے کیا

حضور ﷺ سے محبت کا تقاضہ یہی ہے؟

رسول اللہ ﷺ کا چوتھا حق آپ کا احترام اور آپ کی عظمت ہے، اللہ تعالیٰ نے اس بات سے بھی منع فرمایا کہ آپ ﷺ سے ہم کلام ہوتے ہوئے کسی مسلمان کی آواز آپ کی آواز سے بلند ہو جائے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ بحیثیت مسلمان ہم پر آپ کا کس قدر احترام واجب ہے؟ صحابہ کرام نے اس طرح احترام کا حق ادا کیا کہ آپ جب کوئی بات ارشاد فرماتے تو وہ اس طرح گوش بر آواز ہو کر آپ کے گرد بیٹھے کہ جیسے ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوئے ہیں، مبادا اڑ نہ جائیں، جب آپ کلی کرتے تو صحابہ پانی کو زمین پر نہ گرنے دیتے؛ بلکہ ہاتھوں، چہروں اور سینوں پر مَل لیتے —— آج عظمت رسول کا تقاضہ یہ ہے کہ ہمارے سینے سنتوں کی عظمت سے معمور ہوں اور رسول اللہ ﷺ کی ایک ایک سنت کا ہم احترام کریں، کوئی بھی سنت جو آپ سے ثابت ہو گو اس پر عمل کرنا واجب نہ ہو؛ لیکن یہ ضروری ہے کہ اس کا احترام ہمارے دلوں میں بھی ہو اور زبان پر بھی، اگر کسی ایسی سنت کا مذاق اُڑایا جائے جو صحیح روایتوں سے ثابت ہو تو یاد رکھئے کہ یہ کفر ہے؛ کیوں کہ کوئی معمولی عمل بھی جب رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب ہو تو یہ نسبت اُسے عظمت عطا کرتی ہے اور اس کو واجب الاحترام بنا دیتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چوتھا حق اطاعت وفرماں برداری ہے، آپ جن باتوں کا حکم دیں ان کی تعمیل واجب ہے اور آپ جن باتوں سے منع فرما دیں، ان سے رکنا واجب ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''جو شخص اپنے باہمی اختلاف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ پر راضی نہ ہو اور اس کے سامنے سر تسلیم خم نہ کردے وہ مؤمن ہی نہیں ہے'' فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم (النساء:۶۵) کیوں کہ آپ کی اطاعت دراصل اللہ کی اطاعت ہے، من یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔

اطاعت وفرماں برداری اور تسلیم ورضا کا امتحان اس وقت ہوتا ہے، جب کوئی حکم انسان کے مفاد، اس کے جذبات اور اس کی خواہشات کے خلاف سامنے آئے، وہاں اپنے وقتی مفاد اور نفس کی خواہش پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو غالب رکھنا رسول کے حکم کی

اطاعت ہے، —— آج ہم اپنی عملی زندگی کا جائزہ لیں کہ نکاح، شادی بیاہ کی تقریبات، ازدواجی زندگی کے اختلافات، میراث کی تقسیم، کاروبار و معاملات اور نہ جانے کتنے مواقع ہیں کہ تھوڑے سے مفاد کے لئے بھی احکام نبوی کو پامال اور نظر انداز کرنے میں نہ کوئی تکلف ہوتا ہے اور نہ کوئی تأمل۔

رسول اللہ ﷺ کا پانچواں حق آپ کی 'اتباع و پیروی' ہے، یعنی آپ ﷺ کے نقش قدم پر چلنا ہے، آپ کے ایک ایک عمل پر اپنے عمل کی بنیاد رکھنا اور آپ کی زندگی کو اپنے لئے اُسوہ ونمونہ بنانا، قرآن میں ایک سے زیادہ مواقع پر آپ کی اتباع و پیروی کا حکم دیا گیا ہے؛ کیوں کہ آپ کی حیات طیبہ منشاء ربانی کا مظہر ہے، آپ کا اُٹھنا اور بیٹھنا، سونا اور جاگنا، کھانا و پینا، جلوت وخلوت، لوگوں کے ساتھ تعلقات، دوستوں اور دشمنوں کے ساتھ سلوک، وضع وقطع اور لباس وپوشاک، غرض آپ کا ایک ایک عمل انسان کی عملی زندگی کے لئے نمونہ کا درجہ رکھتی ہے، جس کی روشنی میں انسان اپنے خدوخال درست کرسکتا ہے یہی اتباعِ سنت اسلام کا خلاصہ ہے۔

اور یہ انسانیت پر اللہ کا احسان ہے کہ آپ کی سنت اس طرح محفوظ کردی گئی ہے کہ آپ کی پوری زندگی ایک کھلی کتاب ہے، جو آپ پر ایمان رکھتا ہو اس کو عمل اور برتاؤ کے لئے کسی اور طرف دیکھنے اور کسی اور کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی حاجت نہیں، مذاہب عالم میں کوئی مذہب ایسا نہیں جس میں اس کے پیشوا اور اس مذہب کی آئیڈیل شخصیت کی زندگی اس قدر روشن اور تابناک ہو اور وہ تمام نشیب وفراز میں انسان کے لئے نقش راہ کا کام کرسکے —— پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان، آپ سے بے پناہ محبت، آپ کا احترام، آپ کی اطاعت وفرماں برداری اور آپ کی اتباع و پیروی اُمت پر آپ کے حقوق ہیں، ہم اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھیں کہ کیا ہم ان حقوق کو ادا کر رہے ہیں، کہیں روز محشر میں ہمارا اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سامنا نہ ہو کہ ہم آپ ﷺ کی حق تلفی کے مجرم ٹھہرائے جائیں!

○ ○ ○ ○

توقیر واحترام
منصبِ نبوت کا اولین تقاضا

ایمان کی بنیاد دو باتوں پر ہے: توحید اور رسالت، توحید سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات، اپنی خصوصی صفات واختیارات اور بعض حقوق جیسے سجدہ، عبادت وغیرہ کے اعتبار سے یکتا ہے کوئی اس کا شریک وسہیم نہیں، رسالت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کی ہدایت اور اس کی تعلیم وتزکیہ کے لئے وقتاً فوقتاً اپنے رسول بھیجتے رہے ہیں، حضرت آدم علیہ السلام جیسے پہلے انسان تھے، اسی طرح پہلے پیغمبر بھی تھے، نبوت ورسالت کا یہ سلسلہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکا ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ صرف رسول بنایا، بلکہ ختم نبوت کے تاج سے بھی سرفراز فرمایا، اس لئے قیامت تک اس دنیا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی نبوت سایہ فگن رہے گی۔

اب کہ ربیع الاول کا مہینہ شروع ہو چکا ہے، جس سے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے کتنے ہی واقعات متعلق ہیں، ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ''اُمتی'' ہونے کا جو شرف ہمیں حاصل ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کے جس تمغۂ افتخار سے رب کائنات نے ہمیں نوازا ہے، اس کے تقاضے کیا ہیں؟ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کیا حقوق اس اُمت پر ہیں؟ موجودہ حالات میں جب کہ یہودی اور صلیبی طاقتیں اسلام پر چوطرفہ حملہ کر رہی ہیں اور چاہتی ہیں کہ یہ اُمت دامن محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے محروم ہو جائے، اس پر غور کرنے اور توجہ دینے کی بڑی ضرورت ہے۔

اُمت پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا حق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ایک ایک چیز کا احترام ہے، نبی اور اُمت کا تعلق محض قانونی تعلق نہیں ہوتا، جو محبت وگداز

اور جذبۂ توقیر واحترام سے خالی ہو، اُمت کا اپنے نبی سے تعلق خالص روحانی اور ایمانی تعلق ہے، اس تعلق میں نمایاں جہت احترام وتکریم کی ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے خود آپ ﷺ کو پوری انسانیت پر فضیلت عطا فرمائی ہے، گذشتہ پیغمبروں کی بعثت ایک خاص قوم اور گروہ کی طرف ہوتی تھی، حضرت نوح علیہ السلام کی ان کی قوم کی طرف، (اعراف :۵۹) حضرت ہود علیہ السلام قوم عاد کی طرف مبعوث ہوئے، (اعـراف :۶۵) حضرت صالح علیہ السلام کو قوم ثمود کے لئے بھیجا گیا، (اعـراف :۷۳) حضرت لوط علیہ السلام کی بعثت ان کی قوم کی طرف ہوئی (اعـراف:۸۱) اہل مدین کی ہدایت کے لئے حضرت شعیب علیہ السلام کو نبوت عطا کی گئی، (اعـراف :۸۵) لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پوری انسانیت کے لئے ہے، کَـافَّةً لِـلـنَّـاسِ بَشِیْـراً وَّنَذِیْـراً ، (السبا:۲۸) آپ ﷺ تمام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجے گئے، (انبیاء:۱۰۷) پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلایا گیا کہ میں تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں: اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَـمِیْعاً ، (اعـراف:۱۵۸) اس حقیقت کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک ارشاد میں بھی اشارہ فرمایا ہے کہ پانچ چیزیں مجھے امتیازی طور پر عطا کی گئیں، جو مجھ سے پہلے کسی کو عطا نہیں کی گئی تھی، ان میں سے ایک یہ ہے کہ پہلے انبیاء ایک خاص قوم کی طرف بھیجے جاتے تھے اور مجھے پوری انسانیت کی طرف بھیجا گیا ہے، كَانَ النَّبِیُّ یُبْعَثُ اِلٰى قَوْمِهٖ خَاصَّةً وَبُعِثْتُ اِلَى النَّاسِ عَامَّةً ۔ (بخاری مع الفتح:۱/۵۵۳، مسلم ،حدیث نمبر:۵۲۱)

خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکریم کا حال یہ ہے کہ تمام پیغمبروں سے عہد لیا گیا کہ اگر آپ ﷺ ان کی موجودگی میں تشریف لائیں تو وہ آپ ﷺ پر ایمان لائیں اور آپ ﷺ کا تعاون فرمائیں (آل عمران :۸۱) علامہ ابن کثیر نے تفصیل سے انبیاء کے اس میثاق کا ذکر کیا ہے، (تفسیر ابن کثیر :۱/۳۸۶) اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کسی اور شخصیت کی قسم نہیں کھائی، لیکن جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خود باری تعالیٰ نے قسم کھائی ہے، لَـعَمْرُكَ اَنَّهُمْ لَفِیْ سَكْرَتِهِمْ یَعْمَهُوْنَ ، (الحجر:۷۲) قرآن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عام طور پر انبیاء کو ان کے نام سے مخاطب فرمایا ہے: یَا آدَم (بقرہ :۹۳۵) یَا نُوح

(ھود:۴۸)(اعراف :۱۴۴)یَا اِبْرَاھِیْم(صافات:۱۰۴) یَا عِیْسیٰ بْنَ مَرْیَم (المائدہ:۱۱۰)لیکن رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمیشہ یَا اَیُّھَا الرَّسُوْل کے گرامی مرتبت لقب سے یاد فرمایا گیا ہے،(المائدہ:۴۱،۶۷)اور''اے نبی!''فرمایا گیا ہے۔(انفال:۶۲)

جب خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ کی توقیر وتکریم کا یہ معاملہ ہے تو اُمت پر کس قدر آپ ﷺ کی توقیر واجب ہوگی؟ چنانچہ اسی پہلو سے صحابہ رضی اللہ عنہم کو حکم دیا گیا کہ وہ آپ ﷺ کو اس طرح نام لے کر نہ پکاریں، جیسا کہ ایک دوسرے کو آواز دیتے ہیں، لَا تَجْعَلُوْا دُعَاءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَکُمْ کَدُعَاءِ بَعْضِکُمْ بَعْضًا ،(النور :۶۳)حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کا منشاء یہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کو''یا نبی اللہ یا رسول اللہ'' کے الفاظ سے مخاطب کریں،(تفسیر طبری :۱۸/۱۳۴)آپ ﷺ کی فضیلت اور بلندی درجات کی وساطت سے اُمت کو بھی یہ اعزاز حاصل ہوا کہ اسے تمام اُمتوں میں سب سے بہتر اُمت قرار دیا گیا، کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔(آل عمران:۱۱۰)

آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ کو ایک خاص شان عطا کی جائے گی اور آپ ﷺ کو مقام محمود سے سرفراز کیا جائے گا، جس کا خود قرآن میں ذکر ہے،(اسراء:۸۹) جس میں کوئی آپ ﷺ کا شریک وسہیم نہیں ہوگا، اور آپ ﷺ کو نفسا نفسی کے اس دن میں بھی شفاعت کا حق دیا جائے گا۔(بخاری مع الفتح:۱۱/۵۳۲،مسلم، حدیث نمبر:۲۸۶۳)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی توقیر کا حال یہ تھا کہ جب کوئی نصیحت فرماتے تو لوگ اس طرح بیٹھتے جیسے ان کے سروں پر کبوتر بیٹھے ہوئے ہوں، آپ ﷺ جب کوئی سوال فرماتے تو ادب واحترام کے نقطہ نظر سے عرض کرتے:''اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے، اَللہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ ،اگر کسی بات پر آپ ﷺ کی خفگی محسوس کرتے تو کہنے لگتے: میں خدا سے بحیثیت رب کے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بحیثیتِ رسول اور اسلام سے بحیثیتِ دین کے راضی ہوں، رَضِیْتُ بِاللہِ رَبًّا وَبِمُحَمَّدٍ رَسُوْلاً وَبِالْاِسْلَامِ دِیْنًا ،آپ ﷺ تھوکتے یا وضو فرماتے، تو اسے زمین پر گرنے نہیں دیتے اور ہاتھ میں لے کر بدن پر مَل لیتے ، چلتے تو پیچھے پیچھے رہتے ، آپ ﷺ کی

موجودگی میں امامت نہیں کرتے ، یہاں تک کہ ایک بار آپ ﷺ کی ہدایت کے مطابق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امام بنادیا گیا، جب آپ ﷺ ایک نزاع کو حل کرنے میں مصروف تھے، درمیان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جوں ہی آہٹ محسوس کی ، نماز کے درمیان ہی پیچھے ہٹ گئے ، صحابہ رضی اللہ عنہم کے دل میں آپ ﷺ کی جو عظمت تھی اوران کے عمل سے جس احترام وتوقیر کا اظہار ہوتا تھا، انسانی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توقیر اب بھی اسی طرح جزوِ ایمان ہے، جیسے صحابہ رضی اللہ عنہم فرمایا کرتے تھے، اسی لئے فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ اگر کوئی شخص حضور ﷺ کی شان میں گستاخی کرے اور نعوذ باللہ آپ ﷺ کی ہتک کی نیت سے کوئی بات کہے یا لکھے، تو وہ دائرہ ایمان سے باہر ہو جائے گا؛ جب تک کہ توبہ نہ کرلے اور اگر تائب نہ ہو اور اسلامی حکومت ہو، تو عدالت اس کے قتل کا فیصلہ کرے گی؛ بلکہ اگر اسلامی ملک میں کوئی غیر مسلم بھی رسول اللہ ﷺ کی شان میں بدگوئی کرے اور گستاخانہ کلمات کہے تو اس کے لئے بھی یہی سزا ہوگی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احترام کا تقاضا یہ ہے کہ آپ ﷺ کا نام نامی پورے احترام سے لیا جائے اور جب اسم گرامی آئے تو درود شریف پڑھا جائے، نام لینے والا بھی درود پڑھے اور سننے والا بھی، امام طحاویؒ کے نزدیک تو ایک مجلس میں اگر بار بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہو تو ہر بار درود پڑھنا واجب ہے؛ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو بخیل قرار دیا جس کے سامنے آپ ﷺ کا ذکر خیر ہو اور وہ آپ ﷺ پر درود وسلام نہ بھیجے اور بعض حضرات کے نزدیک اگر ایک نشست میں بار بار ذکر آئے تو ایک بار درود پڑھنا واجب ہے اور اس کے بعد مستحب، یہ حکم کہنے اور سننے والوں کے لئے بھی ہے اور لکھنے والوں کے لئے بھی، مشہور محدث علامہ ابن صلاحؒ نے ان لوگوں کی مذمت کی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے ساتھ پورا درود نہیں لکھتے ، بلکہ صرف ''ص'' یا ''صلعم'' لکھتے دیتے ہیں اور اس کو کوتاہی قرار دیا ہے۔

(دیکھئے: القول البدیع: ۳۵۴)

قرآن نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس بات سے منع کیا کہ آپ ﷺ کے سامنے اپنی آواز بلند

کردیں،لاَ تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ ،(الحجرات :۲)علماء نے اس سے یہ بات اخذ کی ہے کہ جس مسلمان کو قبر شریف کی زیارت کا شرف حاصل ہو، وہ روضۂ اطہر کے پاس بھی ایسی ادب واحترام کو ملحوظ رکھے، آواز بلند نہ ہو، یہاں تک کہ صلاۃ وسلام بھی معتدل آواز میں پیش کرے، اس مبارک مقام پر اس تصور کے ساتھ حاضر ہو کہ حضور ﷺ کے سامنے کھڑا ہے۔

احترام نبوی ﷺ کا ایک اہم پہلو آپ ﷺ کی سنتوں کا احترام ہے، آپ ﷺ کے معمولات کو چوں کہ آپ ﷺ کی ذات والا صفات سے نسبت حاصل ہوگئی ہے، اس لئے اس کی حیثیت عام افعال کی سی نہیں ہے، اس کو اپنی زندگی کا معمول بنانا چاہئے، اگر عمل میں کوتاہی ہو جائے تب بھی دل میں اس کی عظمت ہو اور اس کی بے احترامی اور تحقیر کا کوئی کلمہ زبان سے نہ نکلے، مسواک کرنا فرض یا واجب نہیں ہے، لیکن اسی نسبت کی وجہ سے اس کی تحقیر واہانت کو فقہاء نے کفر قرار دیا ہے، افسوس کہ آج ہمارے سماج میں سنتوں کا مذاق اُڑایا جاتا ہے، داڑھی کا استہزاء کیا جاتا ہے، لمبے کرتے اور ٹخنوں سے اوپر پائجاموں اور تہبند پر پھبتیاں کسی جاتی ہیں، تسبیح اور مسواک کی اہمیت کو کم کر کے بتایا جاتا ہے، بعض لوگ اپنی ناسمجھی میں قرآن مجید حفظ کرنے والوں کو''رٹو طوطا''(نعوذ باللہ) تک کہہ گذرتے ہیں، یہ بالواسطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک سنتوں کی تحقیر ہے اور اس میں متاعِ ایمان کے لٹ جانے کا اندیشہ ہے۔

حضور ﷺ سے تعلق اور آپ ﷺ کے احترام کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ان علوم سے بھی محبت ہو جو آپ ﷺ کی ذات سے متعلق ہے، قرآن کی محبت، حدیث کی محبت اور قرآن وحدیث پر مبنی علوم کی محبت، امام مالکؒ جیسے جلیل القدر محدث وفقیہ کا حال یہ تھا کہ جب حدیث کا درس دیتے تو غسل کر کے تشریف لاتے، اچھے کپڑے زیب تن فرماتے اور اپنے لباس کو خوشبو میں بساتے، ایک بار دورانِ درس ایک بچھو کپڑے میں گھس گیا، بچھو نے پشت میں کئی ڈنک مارے، تکلیف کی شدت سے آپؒ کے چہرہ کا رنگ متغیر ہو جاتا، لیکن درس منقطع نہیں فرمایا اور از راہ احترام اپنی بیٹھک میں کوئی فرق نہیں آنے دیا، درس ختم ہونے کے بعد جب کرتا کے اندر دیکھا گیا تو بچھو اور اس کا ڈنک نظر آیا، (الدیباج المذہب :۱۹-۲۳) —— لیکن آج دینی علوم

کی عظمت وتوقیر کا کیا حال ہے؟ جس علم سے مادی منفعت متعلق نہ ہو، اس کی عظمت ہم لوگوں کے دل سے نکلتی جارہی ہے، اخبارات ورسائل میں قرآنی آیات واحادیث اوران کے ترجمے شائع کیے جاتے ہیں، تاکہ لوگ اس سے فائدہ اُٹھائیں، لیکن اس قابل احترام کاغذ کے ٹکڑے ردیوں میں پھینک دیئے جاتے ہیں، بہرحال! آپ ﷺ کے احترام میں ان تمام چیزوں کا احترام شامل ہے جن کی آپ ﷺ سے نسبت ہے۔

کسی شخصیت کا احترام اس کی معرفت سے پیدا ہوتا ہے، اس وقت سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہماری نسل سیرتِ نبوی ﷺ سے نابلد ہے، اسے عام سیاسی شخصیتوں کے بارے میں جتنا معلوم ہے، اتنا بھی اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں معلوم نہیں، انگلش میڈیم کے رجحان نے نئی نسل اور اسلامی لٹریچر کے درمیان خلیج پیدا کردی ہے، ان میں بعض طلبہ وہ ہیں جو مستشرقین کی کتابوں سے سیرت نبوی ﷺ کو پڑھتے ہیں، ان کتابوں میں میٹھا زہر سمویا ہوا ہوتا ہے اوران کی کوشش ہوتی ہے کہ تحسین واعتراف اور ظاہری توقیر واحترام کے ساتھ ساتھ بین السطور میں ایسی باتیں ذکر کردی جائیں، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت پڑھنے والوں کے دلوں میں کم ہوجائے اور جیسے دوسری انقلابی شخصیتوں کے تذکرے پڑھے ہیں، اسی نقطۂ نظر سے لوگ آپ ﷺ کی سیرت کا بھی مطالعہ کریں، یہ بہت خطرناک صورتِ حال ہے اورضرورت ہے کہ ہم پورے اہتمام کے ساتھ نوجوان نسل کو ان کتابوں سے سیرت پڑھائیں، جنھیں محبت اور عقیدت واحترام کی روشنائی میں ڈبو کر لکھا گیا ہے، یہی مؤمن کے لئے سب سے قیمتی متاع اور بے بدل سوغات ہے، اس کے لئے اپنی رگِ گلو کو کٹانا، اپنے ماں باپ اوراولاد کو نچھاور کرنا اوراپنی عزت وآبرو کو تختۂ دار پر چڑھانا آسان ہے، لیکن اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق اوراحترام ومحبت کی جو میراث اسے اپنے آباء واجداد سے ملی ہے، وہ اس گوہر آبدار اور درِّ نایاب سے کسی بھی قیمت پر محرومی کو گوارہ نہیں کرسکتا۔

○ ○ ○ ○

حبِ نبوی ﷺ — ایمان کی بنیاد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق میں سے دوسرا اہم حق ہے آپ ﷺ سے محبت ہے، ایسی محبت جو تمام محبتوں سے فائق ہو، جو مؤمن کے رگ وریشہ میں سمائی ہوئی ہو، خدا کے بعد اس درجہ کی محبت میں کوئی اور شریک نہ ہو، ایسی محبت جو اپنی ذات، اپنی اولاد اور اپنے ماں باپ سے بھی بڑھ کر ہو، جس میں وارفتگی، جاں نثاری، فدائیت اور خود سپردگی ہو، جس محبت کا سایہ محبوب کے تمام متعلقین تک وسیع ہو چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کوئی شخص اس وقت صاحبِ ایمان نہیں ہوسکتا جب تک اس کے دل میں میری محبت اپنی ذات سے، اپنے ماں باپ اور اپنی اولاد سے اور تمام لوگوں سے بڑھ کر نہ ہوجائے'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی ہی محبت کر کے دکھائی، جو صرف زبان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی جان واولاد کو قربان کرنے کا دعویٰ نہیں کرتے تھے، بلکہ عمل سے اس کا ثبوت بھی فراہم کرتے تھے اور اپنی جان اور اولاد کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اس خوشی سے نچھاور کرتے تھے کہ گویا ان کی جان کی قیمت وصول ہوگئی۔

حضرت خبیب رضی اللہ عنہ اہل مکہ کے ہاتھ آجاتے ہیں، بعض لوگ جن کے مورثِ اعلیٰ غزوۂ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھ مارے گئے تھے، قصاص وانتقام کے طور پر انھیں خرید لیتے ہیں، پھر مکہ سے باہر ایک انبوہ کے ساتھ انھیں لے جایا جاتا ہے اور اذیت پہنچا پہنچا کر سولی پر چڑھایا جاتا ہے، عین اس وقت جب آزمائش کا یہ پہاڑ اس مردِ مومن کے اوپر ڈھایا جارہا تھا، پوچھا جاتا: کیا تمھیں یہ پسند نہیں ہے کہ آج تمھاری جگہ ''محمد'' (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوتے اور تم اس مصیبت سے بچ جاتے؟ حالاں کہ ایسی مصیبت کے وقت میں دل کے اطمینان کے ساتھ زبان سے کلمۂ کفر ادا کرلینے کی بھی اجازت ہے، (الموسوعة الفقهية: ۱۰۷/۶، لفظ اکراہ) لیکن حضرت

خبیب رضی اللہ عنہ کے جذبۂ محبت پر قربان جائیے، کہ اس وقت بھی فرماتے ہیں: ''خدائے عظیم کی قسم! مجھے تو یہ بھی گوارا نہیں کہ اس تکلیف سے بچ جاؤں اور میرے آقا کے قدم مبارک میں ایک کانٹا بھی چبھے''۔(البدایہ والنہایہ:۶۶/۴)

حضرت زید بن دثنہ رضی اللہ عنہ ابوسفیان کی گرفت میں ہیں، —— جو اس وقت تک مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے تھے —— زید رضی اللہ عنہ کے قتل کی تیاری ہو رہی ہے اور سر قلم کئے جانے کو چند لمحہ رہ گیا ہے، اتنے میں ابوسفیان ے استفسار کیا: اے زید! میں تم سے خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تمہیں یہ پسند نہیں، کہ اس وقت تمہارے بجائے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہاں ہوتے ہم ان کا سر کاٹ لئے ہوتے اور تم اپنے گھر میں آرام سے ہوتے، حضرت زید رضی اللہ عنہ نے عین تلوار کی چھاؤں میں فرمایا: ''مجھے تو یہ بھی پسند نہیں کہ اس وقت میں اس تکلیف سے بچ کر اپنے گھر میں رہوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے گھر میں رہتے ہوئے ایک کانٹا بھی چبھ جائے''۔(البدایہ والنہایہ:۶۵/۴)

غزوۂ بدر کے موقع سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں خود ان کے صاحبزادے سامنے تھے، جو ابھی کفر کی حالت میں تھے، وقت گذرا، یہاں تک کے اللہ تعالیٰ نے ان کو ایمان کی توفیق عطا فرمائی، پھر صاحبزادے نے عرض کیا: ابا جان! غزوۂ بدر میں ایک وقت ایسا آیا کہ آپ میرے نرغہ میں آئے تھے، لیکن باپ کی محبت غالب آگئی، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''لیکن اسلام وکفر کی اس جنگ میں اگر تم میرے نرغہ میں آگئے ہوتے تو میں تمہیں معاف نہیں کرتا''۔(دیکھئے: الإستیعاب، ذکر عبدالرحمٰن بن ابی بکر)

عبداللہ بن ابی خود منافق تھا، ان کے لڑکے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ مخلص تھے، ان پر اپنے والد کا منافق ہونا بھی ظاہر تھا، مدینہ میں افواہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے نفاق کی وجہ سے ان کے قتل کا حکم دینے والے ہیں، جب حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع ہوئی، تو بارگاہِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ سنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میرے والد کے قتل کا حکم دینے والے ہیں، اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ منشاء ہو تو میں خود اپنے والد کا سر قلم کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی

خدمت میں پیش کرتا ہوں، گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اولاد اور والدین کی محبت پر غالب تھی، اور جو چیز آپ کو محبوب ہوتی وہ انھیں اپنی مرغوبات سے زیادہ عزیز ہوتیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے تقاضہ میں یہ بات بھی داخل ہے کہ آپ ﷺ کے تمام متعلقین سے محبت ہو، آپ ﷺ کے اہل بیت سے محبت ہو، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے محبت ہو، یہ محبت کا فطری تقاضہ ہے، کہ جو چیز عزیز ہوتی ہے اس سے تعلق رکھنے والی ساری ہی چیزیں انسان کو عزیز ہوتی ہیں، اس لئے سلف صالحین اہل بیت سے بھی محبت رکھتے تھے اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی، اہل بیت سے محبت نہ ہو اور ان کی توقیر واحترام کا جذبہ نہ ہو تو یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کما حقہ محبت سے محرومی ہے؛ کیوں کہ اہل بیت کی محبت اس نسبت کی وجہ سے ہے جو انھیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہے اور ان کی محبت سے محروم ہونا اس نسبت کی ناقدری ہے، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کے وہ رفقاء ہیں، جنھوں نے آپ ﷺ کے لائے ہوئے دین کی سربلندی کے لئے اپنے جان ومال کی قربانی دی ہے، جن کو براہِ راست صحبتِ نبوی ﷺ سے فیض اُٹھانے کا موقع ملا ہے، جو بلا واسطہ آپ ﷺ کے پرداختہ اور تربیت یافتہ ہیں، ان سے بغض رکھنا یا ان کی تنقیص کرنا دراصل بالواسطہ آپ ﷺ کی تربیت پر حرف گیری کرنا ہے، اسی لئے اہل سنت والجماعت کا اتفاق ہے کہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم قابل احترام اور قابل محبت ہیں اور یہ سب کے سب مسلمانوں کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ہیں، بدقسمتی سے گذشتہ صدی میں برصغیر میں بعض ایسی تحریریں منظر عام پر آئیں، جن میں اہل بیت یا دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں بے توقیری اور بغض وکدورت کا رویہ اختیار کیا، ایسی باتوں کو قبول کرنا آپ ﷺ کی محبت اور تعظیم وتوقیر کے مغائر ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلقین میں آپ ﷺ کی اُمت بھی شامل ہے؛ کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت نے اس اُمت کو ایک عالم گیر اور آفاقی خاندان بنادیا ہے، جیسے انسان کو باپ دادا کے رشتہ سے وجود میں آنے والے خاندان سے محبت ہوتی ہے، وہ ایک دوسرے کا خیر خواہ اور معاون ومددگار رہتا ہے اور دشمنوں کے مقابلہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن

کر کھڑا ہو جاتا ہے، اسی طرح پوری اُمت ایک خاندان کا درجہ رکھتی ہے، جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تم لوگوں کے باپ کے درجہ میں ہوں اور جیسا کہ قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ تمام اہل ایمان بھائی بھائی ہیں۔

افسوس کہ اُمت کے ایک وسیع خاندان ہونے کا تصور ہمارے ذہنوں سے نکل گیا اور مسلکوں، تنظیموں، جماعتوں، درسگاہوں، خانقاہی نسبتوں، علاقوں، زبانوں، پیشوں اور برادریوں کے دائرہ میں ہماری محبت سکڑ کر رہ گئی ہے، ہم نے اس حقیقت کو بھلا دیا کہ رسول اللہ ﷺ اپنی اُمت کے ایک ایک فرد سے محبت فرماتے تھے، نہ عرب و عجم کی تفریق تھی، نہ کالے گورے کی تمیز، نہ مہاجرین وانصار کی تفریق، نہ دولت مندوں اور غریبوں میں امتیاز، یہاں تک کہ اُمت کے کسی فرد سے گناہ کا ارتکاب ہوتا تو آپ ﷺ کو گناہ سے نفرت ضرور ہوتی لیکن آپ ﷺ کا سینۂ مبارک اس گناہ گار اُمتی کی محبت سے بھی معمور ہوتا، اگر اس کے بارے میں کوئی شخص نار وا فقرہ کہہ دیتا تو آپ ﷺ سخت ناراض ہوتے، کاش! مسلمان اس حقیقت پر توجہ دیں، کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایک اُمت بنایا تھا، لیکن آج ہم نے اپنے درمیان فرقہ واریت اور گروہ بندی کی اتنی اونچی دیوار کھینچ لی ہے کہ ہم ایک دوسرے کو دیکھنے سے بھی قاصر ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کے تقاضوں میں یہ بات شامل ہے کہ ہمیں اس اُمت سے بھی محبت ہو، جس اُمت کی تشکیل آپ ﷺ کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی۔

آپ ﷺ کی محبت کا ایک مظہر آپ ﷺ کی سنتوں سے محبت ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو انسانیت کے لئے اسوہ اور نمونہ بنایا اور پھر آپ ﷺ کے اسوہ کو قیامت تک کے لئے محفوظ کر دیا ہے، عبادت و بندگی، اخلاق وسلوک، خاندانی زندگی کے آداب، تجارت اور کسب معاش کے طریقے، حکومت اور ملکی نظم ونسق، جنگی مہمات، ازدواجی زندگی، اعزہ واقارب کے ساتھ برتاؤ، بڑوں اور چھوٹوں کے ساتھ رویہ، دشمنوں اور مخالفین کے ساتھ سلوک، سونے جاگنے، اُٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، سفر وحضر اور جلوت وخلوت، تعلیم وتعلم، عدل وقضاء اور احکام شرعیہ کی رہنمائی، غرض زندگی کے تمام شعبوں میں آپ ﷺ کا اسوہ موجود و محفوظ ہے اور نشانِ

راہ بن کر منزلِ مقصود کی طرف لے جاتا ہے، ان سنتوں کی محبت آپ ﷺ سے محبت کا عین تقاضہ ہے، آپ ﷺ کی سنتوں کو پامال کرنا اور نبی کی مرضیات کے مقابلہ اپنی خواہشات کو ترجیح دینا اور پھر آپ ﷺ سے عشق ومحبت کا دعویدار ہونا آگ اور پانی کو جمع کرنے کے مترادف ہے۔

اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار اُمت کو اپنی سنتوں کی طرف متوجہ فرمایا ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: تم بہت سے اختلاف دیکھو گے، لیکن تمہارے لئے صحیح راہِ عمل یہ ہے جس پر میں ہوں اور میرے صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں: ما أنا علیه وأصحابی، (ترمذی، ابواب الإیمان، باب ماجاء فی افتراق هذه الامة، حدیث نمبر: ۲۶۴۱) آپ ﷺ نے تاکید فرمائی کہ تم میرے اور خلفائے راشدین کے طریقہ پر قائم رہو، علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین، (ابوداؤد، باب فی لزوم السنة، حدیث نمبر: ۴۶۰۷، ابن ماجه، باب اتباع سنة الخلفاء الراشدین، حدیث نمبر: ۴۲) آپ ﷺ نے فرمایا جس نے میری مردہ ہوتی ہوئی سنت کو زندہ کیا، اس کے لئے سو شہیدوں کا اجر ہے، (حلیة للاولیاء وطبقات الأصفیاء الأصبهانی: ۸/۳۰۰، عن ابی هریرة ؓ) پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت جزوِ ایمان ہے، یہ محبت ایسی ہے جو والدین اور اولاد سے بھی بڑھ کر ہے، اس محبت میں آپ ﷺ کے اہل بیت، آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم، آپ ﷺ کی اُمت اور آپ ﷺ کی سنتوں کی محبت بھی شامل ہیں اور اس کے بغیر محض زبان سے محبت کا دعویٰ کرنا کافی نہیں ہے!

○ ○ ○ ○

اطاعت واتباعِ نبوی ﷺ

اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت ورہنمائی کے لئے جہاں اپنی کتاب نازل فرمائی، وہیں اس کی تشریح وتوضیح بھی فرمائی، اور اس کا عملی نمونہ پیش کرنے کے لئے اپنے پیغمبروں اوررسولوں کو بھیجا، انبیاء کی حیثیت مرضیاتِ خداوندی کے ترجمان کی ہے، اوران کا حق ہے کہ ان کی اطاعت وفرمانبرداری اوراتباع وپیروی کی جائے، رسول کی نسبت سے اُمت کی یہ بنیادی ذمہ داری ہے، رسول بھیجے ہی اس لئے جاتے ہیں کہ ان کی اطاعت کی جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں قرآن مجید نے صاف طور پر کہا ہے کہ آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی اہل ایمان کے لئے سراپا نمونہ ہے" لقد كان لكم في رسول الله أسوة حسنة "(الاحزاب:۲۱)، نیز آپ ﷺ کی اتباع ہی اللہ کو محبوب رکھنے کا معیاراور خود اللہ کے محبوب بننے کا ذریعہ ووسیلہ بھی ہے۔(آلِ عمران:۳۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع وپیروی کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر آج حضرت موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو ان کو بھی ہماری اتباع سے چارہ نہ ہوتا" لو أن موسىٰ كان حيا ماوسعه إلا أن يتبعني "(مسند احمد:۳/۳۸۷)، آپ ﷺ کی اطاعت ونافرمانی ہی جنت میں داخل ہونے اوراس سے محروم ہونے کی بنیاد ہے، چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: میری پوری اُمت جنت میں داخل ہوگی، سوائے انکار کرنے والوں کے، لوگوں نے عرض کیا کہ انکار کرنے والے کون ہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوا اور جس نے نافرمانی کی اس نے انکار کیا" من أطاعني دخل الجنة، ومن عصاني فقد ابىٰ "(بخاری مع الفتح، حدیث نمبر: ۷۲۸۰)؛ کیوں کہ آپ ﷺ کی اطاعت دراصل اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے اور آپ ﷺ کی نافرمانی خود اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ایک خواب ذکر

کرتے ہوئے اس کی تعبیر بیان فرمائی ، اور اس تعبیر میں واضح طور پر بتایا کہ آپ ﷺ کی اطاعت اللہ کی اطاعت اور آپ ﷺ کی نافرمانی اللہ کی نافرمانی ہے، ''من اطاع محمداً فقد اطاع اللہ و من عصیٰ محمداً فقد عصی اللہ''۔ (بخاری مع الفتح، حدیث نمبر: ۷۲۸۱)

اتباعِ نبوی ﷺ کا ایک پہلو فکری اعتبار سے ''حدیث'' کو حجت و دلیل تسلیم کرنا ہے، قرآن کو ہدایت کے لئے کافی سمجھنا اور اتباع قرآن کے نام پر حدیث کا انکار کر جانا نہایت ہی سنگین قسم کی گمراہی ہے، حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایسا نہ ہو کہ میں تم میں سے کسی کو اپنی مسہری پر ٹیک لیا ہوا پاؤں کہ جب اس کے پاس میرا کوئی حکم یا میری کوئی ممانعت آئے تو کہے کہ مجھے یہ نہیں معلوم ، ہم تو اس کی پیروی کرتے ہیں جو کتاب اللہ میں ہے، ''ما وجدناہ فی کتاب اللہ إتبعناہ'' (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۰۶۵) اسی طرح حدیث کو قبول کرنے یا نہ کرنے کے لئے انسان اپنی عقل کوتاہ کو پیمانہ بنائے، بلکہ جب بھی کوئی بات حدیث کے ذریعہ پہنچے اسے سرمۂ چشم بنائے، اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کے لئے سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ دین کی بنیاد رائے پر ہوتی تو موزے کے نیچے کے حصہ کا مسح قابل ترجیح ہوتا بمقابلہ اوپر کے حصہ کے؛ لیکن میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو موزوں کے اوپری حصہ پر مسح کرتے ہوئے دیکھا ہے (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۱۶۲)، کیوں کہ انسان کا علم اور اس کی عقل کوتاہ ہے اور رسول کے علم کا ماخذ اور سرچشمہ علم الٰہی ہے، جس میں نقص اور کوتاہی کا کوئی امکان نہیں!

اتباع نبوی ﷺ کا ایک پہلو یہ ہے کہ زندگی کے تمام مسائل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طور وطریق کے مطابق عمل کیا جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُصولی طور پر بھی اس کی ترغیب دی کہ میرے طریقہ کو اختیار کرو'' علیکم بسنتی '' (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۶۰۷)، اور مختلف مسائل کے بارے میں بھی اس کی تلقین فرمائی، چنانچہ ارشاد فرمایا کہ جیسے تم مجھے نماز پڑھتے دیکھو اسی طرح نماز پڑھو'' صلوا کما رأیتمونی أصلی '' (بخاری مع الفتح، حدیث نمبر: ۶۰۰۸)، یا جیسے حج کے بارے میں فرمایا کہ شاید پھر اس کے بعد میں حج نہ کرسکوں، اس لئے مجھ سے

طریقۂ حج سیکھ لو، ''لتاخذوا مناسککم ''(مسلم، حدیث نمبر:۱۲۹۷)، ائمہ مجتہدین اور فقہاء ومحدثین نے جو محنتیں کی ہیں، ان کا ماحصل یہی ہے کہ انھوں نے اپنی جستجو وتحقیق کے مطابق سنتِ نبوی کو دریافت کرنے اور حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے، اور جو اختلاف رائے واقع ہوا ہے، وہ سنت کے مقابلہ اپنی رائے کی اتباع نہیں ہے، بلکہ بعض افعال میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک سے زیادہ طریقے منقول ہیں، فقہاء نے اپنے ذوق اور تحقیق کے مطابق ان میں سے کسی ایک طریقہ کو اختیار کیا ہے، اس لئے یہ اختلاف بھی اتباعِ سنت کے دائرہ میں ہی ہے نہ کہ اس سے باہر۔

اتباعِ سنت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ معاملات واخلاق اور زندگی کے دوسرے مسائل میں بھی رسول اللہ ﷺ کے طریقہ کو اختیار کیا جائے، صحابہ کے جذبۂ اتباع کا حال یہ تھا کہ آپ ﷺ سے اگر کوئی فعل طبعی طور پر ثابت ہوتا تو اس کی بھی اتباع کرنے کی کوشش کرتے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سواری پر سوار ہونے کے بعد سواری کی دُعاء پڑھی اور دُعا پوری ہونے کے بعد ہنسنے لگے، دریافت کیا گیا کہ آپ رضی اللہ عنہ کے ہنسنے کا باعث کیا ہوا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جواب کا خلاصہ یہ تھا کہ اس موقع سے آپ ﷺ بھی ہنسے تھے (ترمذی، حدیث نمبر:۳۱۴۶)، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے بخاری میں طویل روایت منقول ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ جاتے ہوئے ان تمام مقامات پر اُتر اُتر کر نماز ادا کرتے تھے، جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دورانِ سفر نماز ادا فرمائی تھی۔

گو سنتِ نبوی ﷺ کی مخالفت مقصود نہ ہوتی، لیکن بظاہر احترام سنت کے خلاف کوئی عمل محسوس ہوتا تو یہ بات بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو برداشت نہ ہوتی، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے، کہ اگر تمہاری عورتیں مسجد جانا چاہیں تو تم انھیں نہ روکو، ان کے صاحبزادے بلال رضی اللہ عنہ کہنے لگے کہ لیکن ہم تو انھیں روکیں گے، بلال کا مقصد حدیث نبوی ﷺ کی مخالفت نہیں تھی؛ بلکہ مقصود یہ تھا کہ اخلاقی حالات میں جو تبدیلی پیدا ہوتی ہے، اس کے پیش نظر میں مسجد جانے سے منع کروں گا، لیکن حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سخت ناراض ہوئے

اور راوی کہتے ہیں کہ اس بات پر انھیں اتنا برا بھلا کہا کہ اتنا برا بھلا کہتے ہوئے انھیں کبھی نہیں دیکھا گیا (مسلم، حدیث نمبر: ۱۲۵۹)، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کدو بہت پسند تھا، امام ابو یوسفؒ نے اپنے صاحبزادے سے نقل کیا، انھوں نے کہا کہ مجھے کدو زیادہ پسند نہیں ہے، حالاں کہ اس کا تعلق طبعی پسند و ناپسند سے ہے، لیکن پھر بھی امام ابو یوسفؒ کو یہ بات پسند نہ آئی اور ان سے گفتگو کرنا چھوڑ دیا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل کرنے کے لئے یہ بات کافی ہوتی تھی، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کیا ہو، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداء میں سونے کی انگوٹھی بنائی، لوگوں نے بھی سونے کی انگوٹھیاں بنائی، پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے حرام ہونے کا اعلان فرمایا اور اپنی انگوٹھی پھینک دی تو تمام صحابہ کرام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگوٹھیاں پھینک دیں (بخاری مع الفتح، حدیث نمبر: ۷۲۹۸)، اسی طرح صلح حدیبیہ کے موقع سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو احساس تھا کہ یہ صورت اہل مکہ کے حق میں ہورہی ہے، اور مسلمانوں کو گر کر صلح کرنی پڑ رہی ہے، اس لئے صحابہ رضی اللہ عنہم احرام کھولنے اور سر منڈانے کو تیار نہیں تھے، ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ کے مشورے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خیمہ سے باہر نکلے، قربانی فرمائی اور بال منڈایا، یہ دیکھتے ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی اپنے بال منڈا لئے۔ (بخاری مع الفتح، حدیث نمبر: ۲۷۳۱)

صحابہ رضی اللہ عنہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و اتباع کا اس قدر لحاظ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی معمولی سی ناگواری ان کو متنبہ کرنے کے لئے کافی ہوتی تھی، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے جسم پر کسم کے رنگ کی ایک چادر تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر کسی قدر ناگواری کا اظہار فرمایا، گھر واپس آئے تو چولہا سلگا ہوا تھا، چنانچہ اسی چولہے میں چادر ڈال دی، دوسرے روز حضور صلی اللہ علیہ سے اس کا ذکر آیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عورتوں کو دے دیا ہوتا، کیوں کہ ان کے پہننے میں کوئی مضائقہ نہیں (ابوداؤد: کتاب اللباس، حدیث نمبر: ۴۰۶۸)، ایک انصاری کے مکان کے پاس گذر ہوا جنھوں نے اونچا گنبد نما حجرہ بنا رکھا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ یہ مکان کس کا ہے؟ لوگوں نے ان انصاری صحابی رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا، پھر جب وہ

صحابی رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے تو آپ نے یک گونہ بے رخی برتی، دوسرے صحابہ سے وجہ دریافت کی، معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی گنبد نما تعمیر کی وجہ سے گرانی ہوئی ہے، وہ گھر گئے، اس عمارت کو ڈھا کر زمین کے برابر کر دیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر بھی نہیں کیا، اتفاق سے چند دنوں بعد پھر وہاں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب وہ گنبد والی تعمیر نہیں دیکھی تو وجہ دریافت کی، صحابہ رضی اللہ عنہم نے صورتِ حال عرض کر دی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ضرورت و مجبوری کی تعمیر کے علاوہ ہر تعمیر آدمی کے لئے وبال ہے۔

(ابن ماجہ: ابواب الزهد، باب فی البناء والخراب، حدیث نمبر:۴۱۶۱)

اس طرح کی کتنی ہی مثالیں صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگی میں موجود ہیں، لیکن آج مسلمانوں کی صورتِ حال کیا ہے؟ زندگی کے ہر شعبہ میں سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن ہمارے ہاتھوں سے چھوٹا ہوا ہے، ہماری زبان حب نبی کے دعوی سے سرشار ہے؛ مگر ہماری عملی زندگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طاعت و اتباع سے خالی ہے، ہماری عبادتیں بے روح ہیں، ہماری اخلاقی پستی غیر مسلم معاشرہ کو بھی شرمندہ کرتی ہے، معاملات میں ہم اس قدر کھوئے اور حلال و حرام کی سرحدوں سے بے پرواہ ہیں، دوسری قومیں ہم سے معاملات کرنے میں تأمل کرتی ہیں، غرض ہمارا دین کتابوں میں ہے نہ کہ ہماری زندگی میں، قول و فعل کا یہی تضاد دوسری قوموں کے دامن اسلام میں آنے سے رکاوٹ بنا ہوا ہے، اس لئے اس وقت سب سے اہم مسئلہ یہی ہے کہ ہم عملی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و اتباع کا راستہ اختیار کریں اور دوسری قوموں کی اتباع اور ان کی نقل سے اپنے آپ کو بچائیں!!

○ ○ ○ ○

ختم نبوت اور ہماری ذمہ داریاں

انسان اس دنیا میں خود اپنے ارادہ سے پیدا نہیں ہوا ہے، بلکہ پیدا کیا گیا ہے، دنیا میں بہت سی چیزیں اس کے لئے فائدہ مند ہیں اور بہت سی چیزیں مضرت رساں، وہ خود اپنے نفع ونقصان سے بھی کما حقہ واقف نہیں، اس کے اندر قسم قسم کی خواہشات اور آرزوئیں ہیں، اس کے نفس میں ایسی حسرتیں بھی پلتی رہتی ہیں جو اسی کے جیسے دوسرے انسانوں کے لئے تباہی وبربادی اور نقصان کا باعث ہیں، بعض ایسی تمنائیں بھی دل میں مچلتی اور ذہن کو بے قرار رکھتی ہیں، جو اس کے لئے نہ صرف روحانی بلکہ مادی اور جسمانی اعتبار سے بھی انتہائی نقصان دہ ہوتی ہیں، اس لئے اگر انسان کو زندگی گذارنے کے بارے میں آزاد اور بے لگام چھوڑ دیا جائے، تو وہ نہ صرف دوسروں کے لئے بلکہ خود اپنے لئے بھی طرح طرح کی مصیبتیں اور مشکلات پیدا کرسکتا ہے، اس لئے اسے صحیح طریقہ پر زندگی گذارنے کے لئے پیدا کرنے والے کی جانب سے ہدایت نامہ کی ضرورت ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ یہ ہدایت نامہ کسی انسان ہی کے ذریعہ آئے اور وہ اس پر عمل کر کے دکھائے اور بتائے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ہر دور میں اس کی تعلیم وتربیت کا سروسامان بھی فرمایا، چنانچہ انسان کی رہنمائی کے لئے اللہ نے ہدایت نامے بھیجے، جسے 'کتاب اللہ' کہا جاتا ہے اور اسے پہنچانے اور عملی طور پر اسے برت کر دکھانے کے لئے انبیاء کرام کو بھیجا۔

حضرت آدم علیہ السلام جیسے پہلے انسان تھے، ویسے ہی پہلے پیغمبر بھی تھے، نبوت ورسالت کا یہ سلسلہ پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوگیا، چوں کہ اللہ تعالیٰ کو یہ بات منظور تھی کہ سلسلۂ نبوت آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر تمام ہوجائے، اس لئے قدرتی طور پر وہ اسباب بھی باقی نہ رہے جن کی وجہ سے نئے نبی کی ضرورت پیش آتی تھی، نیا نبی یا تو اس لئے بھیجا جاتا تھا کہ

احکام شریعت میں کوئی تبدیلی مقصود ہوتی اور قرآن نے واضح کر دیا کہ اب شریعت الٰہی درجۂ کمال وتمام کو پہنچ گئی ہے اور نعمتِ ہدایت کا اہتمام ہو چکا ہے، الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا ،(المائدہ:۳) یا نبی اس لئے بھیجے جاتے تھے کہ پہلے نبی پر ایمان رکھنے والوں میں کوئی ہدایت یافتہ اور حق پر ثابت قدم گروہ باقی نہ رہا ہو، یا اس لئے کہ پہلے جو آسمانی کتاب اتری ہو، لوگوں نے اس میں ملاوٹ پیدا کر دی ہو، نبوت محمدی کا معاملہ یہ ہے کہ جو کتاب آپ پر نازل ہوئی وہ ایک زبر زیر کی تبدیلی کے بغیر موجود اور محفوظ ہے، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس اُمت میں بہت بڑا طبقہ راہ ہدایت پر قائم ہے اور قائم رہے گا ، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ اُمت کبھی بھی گمراہی پر متفق نہیں ہوسکتی ، لاتجتمع اُمتی علی ضلالة ،اس لئے آپ ﷺ کے بعد کسی نئے نبی کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

چنانچہ اس بات پر اُمت کا اجماع ہے کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہر طرح کی نبوت ختم ہو چکی ہے اور آپ ﷺ کے بعد کسی قسم کی نبوت باقی نہیں رہی، یہ نہ صرف اُمت کا اجماعی عقیدہ ہے، بلکہ اس پر قرآن مجید اور صحیح حدیثیں ناطق ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول اور آخری نبی ہیں، ولکن رسول اللہ و خاتم النبین ،(الاحزاب:۴۰) آسمانی صحائف میں ہمیشہ اگلے رسول کے بارے میں اُمت سے عہد لیا جاتا تھا کہ وہ ان پر ایمان لائیں گے، اگر آپ کے بعد کسی نبی کی آمد ممکن ہوتی تو ضرور تھا کہ اللہ تعالیٰ نے پوری اہمیت اور وضاحت کے ساتھ اس کا ذکر فرمایا ہوتا، لیکن قرآن مجید نے کہیں اس کا کوئی ذکر نہیں کیا؛ بلکہ اس کے برعکس بہت ہی واضح الفاظ میں آپ ﷺ کے آخری نبی ہونے کا اعلان فرمایا گیا اور اشارۃً تو کتنے ہی مقامات پر آپ ﷺ پر ختم نبوت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

حدیثیں اس سلسلہ میں اتنی کثرت اور وضاحت کے ساتھ مروی ہیں کہ ان کا احاطہ دشوار ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میری اور انبیاء کی مثال ایسے محل کی ہے جسے نہایت ہی خوبصورت طریقہ پر بنایا گیا ہو اور اس میں ایک اینٹ کی

جگہ بچی ہو، دیکھنے والے اسے دیکھتے ہوں اور اس کے حسن تعمیر پر حیرت زدہ ہوں، سوائے اس اینٹ کی جگہ کے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں وہی اینٹ ہوں، مجھ پر عمارت مکمل ہوگئی ہے، رسولوں کا سلسلہ ختم ہوا اور میں آخری نبی ہوں، (بخاری:۱/۵۰۱) حضرت ابو ہریرہ ہی کی روایت میں آپ ﷺ کا ارشاد مروی ہے کہ چھ باتوں میں آپ کو تمام انبیاء پر فضیلت دی گئی، ان میں دو باتیں یہ تھیں کہ آپ تمام مخلوقات کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے اور مجھ پر نبیوں کا سلسلہ ختم کر دیا گیا، (مسلم :۱/۱۹۹) حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ عنقریب میری اُمت میں تیسیوں جھوٹے نبی پیدا ہوں گے، جو کہیں گے کہ وہ اللہ کے نبی ہیں؛ حالاں کہ میں آخری نبی ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوسکتا، (ابو داؤد:۱/۵۸۴) دارمی کی ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: میں پیغمبروں کا قائد اور خاتم ہوں، اور مجھے اس پر کوئی فخر نہیں، (دارمی ،حدیث نمبر:۴۹) آپ ﷺ نے اپنا ایک نام ''عاقب'' بتایا اور پھر اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا یعنی وہ جس کے بعد کوئی نبی نہ ہو، انا العاقب و العاقب الذی لیس بعده نبی۔(بخاری :۱/۵۰۱)

حدیثوں نے اس بات کو بھی واضح کر دیا کہ حضور ﷺ کے بعد کسی بھی طرح کی نبوت باقی نہیں رہی، چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ میرے بعد نبوت کی گنجائش ہوتی تو تم نبی ہوتے، لو کان بعدی نبیاً لکان عمر (ترمذی:۲/۲۰۹) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا کہ تم میری نسبت سے ویسے ہی ہو جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہارون علیہ السلام تھے، سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوسکتا: انت منی بمنزلة هارون من موسیٰ إلا أنـه لانبی بعدی (بخاری:۲/۶۳۳)، آپ ﷺ نے اس کو مزید واضح کرتے ہوئے فرمایا میں آخری نبی ہوں اور تم آخری اُمت ہو، أنا اخر الانبیاء و أنتم آخر الامم ،(ابن ماجہ :۲۰۷/، باب فتنة الدجال) آپ ﷺ نے اپنی مسجد کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ انبیاء سے منسوب جو مسجدیں تھیں، ان میں آخری مسجد میری مسجد ہے، مسجدی خاتم مساجد الانبیاء ،(دیلمی، حدیث نمبر:۱۱۲) —— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان فرمودات سے واضح ہے کہ آپ پر ہر طرح کی نبوت ختم ہو چکی ہے، آپ آخری نبی ہیں، آپ ﷺ پر نازل ہونے والی کتاب آخری

کتاب ہے، آپ کی اُمت آخری اُمت ہے، انبیاء سے منسوب مساجد میں آپ کی مسجد آخری مسجد ہے اور آپ کے بعد کسی بھی قسم کی نبوت کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

چوں کہ یہود و نصاریٰ کو اسلام سے ہمیشہ سے عناد رہا ہے اور انھوں نے میدان جنگ سے لے کر معرکہ فکر و نظر تک ہر جگہ اسلام پر یلغار کی ہے، اس لئے انھوں نے اپنے استعماری دور میں ایک نئی تدبیر سوچی کہ کسی شخص کو نبوت کا علمبردار بنا کر کھڑا کیا جائے، تاکہ نبوت محمدی کے مقابلہ ایک نئی نبوت وجود میں آئے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے اُمت محمدیہ کو جو محبت ہے، وہ محبت تقسیم ہو جائے، اس کے لئے ایک ایسے علاقہ کا انتخاب کیا گیا جو اس وقت انگریزوں کی عملداری میں تھا، تاکہ ایسے چھوٹے مدعیٔ نبوت کی پوری حفاظت اور حوصلہ افزائی ہو سکے، چنانچہ پنجاب سے ایک شخص مرزا غلام احمد قادیانی کو اس کام کے لئے تیار کیا گیا، مرزا صاحب نے خود ہی اپنے بارے میں لکھا ہے کہ میں انگریزوں کا خود کاشتہ پودا ہوں، انگریزوں نے اپنی اس کاشت کو بار آور کرنے اور تقویت پہنچانے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔

نبی کے دعوے میں کبھی تدریج نہیں ہوتی، یعنی ایسا نہیں ہوتا کہ وہ آہستہ آہستہ دعویٰ نبوت تک پہنچے، حضرت موسیٰ علیہ السلام آگ کی تلاش میں کوہِ طور پر پہنچے تھے؛ لیکن اچانک ہی نبوت سے سرفراز کئے گئے، رسول اللہ ﷺ نے وحی نازل ہونے سے پہلے کبھی اس سلسلہ میں کوئی گفتگو نہیں فرمائی کہ اچانک حضرت جبرئیل علیہ السلام اللہ کا کلام لے نازل ہوئے؛ لیکن مرزا صاحب ایک ایک سیڑھی چڑھتے ہوئے دعویٔ نبوت تک پہنچے، پہلے اللہ کی طرف سے ملہم ہونے کا دعویٰ کیا، یعنی ان پر الہام ہوتا ہے، پھر دیکھا کہ حدیث میں حضرت مسیح کے نزول کی پیشین گوئی ہے، تو مسیح ہونے کا دعویٰ کر بیٹھے، جب لوگوں نے کہا کہ حضرت مسیح کے زمانہ میں امام مہدی کا بھی ظہور ہوگا، کہنے لگے کہ میں ہی مہدی ہوں، پھر دعویٔ نبوت ہی کر بیٹھے، اولاً تو اپنی نبوت کو حضور ﷺ کی نبوت کا سایہ کہتے تھے، لیکن پھر اپنے کو حضور سے افضل کہنے سے بھی نہیں چوکے اور ان کے متبعین نے آپ ﷺ کی دعوت کو ہلال "یعنی پہلی شب" کا چاند اور مرزا

صاحب کی دعوت کو ''بدر کامل''، یعنی چودھویں شب کا چاند قرار دیا، نبی کی بات میں تضاد نہیں ہوتا، مگر مرزا صاحب کے یہاں اس قدر تضادات ہیں کہ شمار سے باہر ہے، نبی خدا کی صفات اور جلالت شان کو وضاحت وصراحت کے ساتھ بیان کرتا ہے اور اپنی عبدیت و بندگی کو بے کم وکاست سامنے رکھ دیتا ہے، لیکن مرزا صاحب کا حال یہ ہے کہ اپنے آپ کو خدا کا مانند کہنے سے بھی نہیں چوکتے، (روحانی خزائن :۱۷/ ۴۱۳) ایک موقع سے کہتے ہیں: میں نے خواب میں دیکھا کہ میں خود خدا ہوں اور یقین کرلیا کہ میں وہی ہوں، (روحانی خزاء :۵/ ۵۶۴) مرزا صاحب اپنے بارے میں کہتے ہیں کہ یا خدا خود آسمان سے اُتر آیا ہے، کأن الله نزل من السماء۔ (اشتہار ۲۰/ فروری ۱۸۸۶ء)

نبی کی زبان بہت ہی شائستہ اور مہذب ہوتی ہے، دشمنوں کے بارے میں بھی تہذیب واخلاق سے گری ہوئی بات اس کی زبان اور قلم پر نہیں آتی، لیکن مرزا صاحب کے یہاں اپنے مخالفین کے لئے سور، کتے، حرامی وغیرہ کے الفاظ عام ہیں اور انھیں اس طرح کے تخاطب میں کوئی تکلف نہیں، کہتے ہیں کہ ''جو ہماری فتح کا قائل نہیں ہوگا، تو صاف سمجھا جاوے گا کہ اس کو ولد الحرام بننے کا شوق ہے، حرام زادہ کی یہی نشانی ہے، کہ سیدھی راہ اختیار نہ کرے،'' (نور الاسلام :۳۰) مشہور عالم مولانا ثناء اللہ امرتسری کو ''کتا مردار خوار'' (روحانی خزائن :۱۱/ ۳۰۹)، مولانا محمد حسین بٹالوی کو ''پلید بے حیاء، سفلہ، گندی کارروائی، گندے اخلاق وغیرہ'' کے القاب سے نوازا ہے، مولانا سعد اللہ لدھیانوی کو ''نطفۂ سفہا، کنجری کا بیٹا'' یہ چند کلمات بطور نمونہ کے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن زیادہ لعنت کرنے والا نہیں ہوسکتا، خود مرزا صاحب نے کہا ہے کہ مومن لعّان نہیں ہوتا، (روحانی خزائن :۱۳/ ۴۵۶) لیکن خود مرزا صاحب نے عیسائیوں کے خلاف جو کتاب لکھی تو محض چار صفحات میں ایک ہزار بار صرف لعنت لعنت کے کلمات لکھے، (حوالۂ سابق :۸/ ۶۳-۱۵۸) اور آریوں پر جو لعنت بھیجنی شروع کی ہے تو ایک ساتھ پورے دس دفعہ صرف لعنت کا لفظ ہے، (حوالۂ سابق :۲/ ۳۷۶) اس سے مرزا صاحب کی زبان وبیان کے معیار کا اندازہ کیا جاسکتا ہے اور غور کیا جاسکتا ہے کہ نبی تو کجا کیا کسی مہذب

آدمی کو بھی ایسے الفاظ زیب دیتے ہیں؟

مرزا صاحب کے دیگر حالات بھی اس پہلو سے قابل مطالعہ ہیں، صرف مرزا صاحب کے محمدی بیگم سے نکاح کی شدید خواہش اور اس سلسلہ میں بار بار وحی الٰہی کا دعویٰ، پھر محمدی بیگم، اس کے شوہر اور اس کے متعلقین کے لئے بددُعاء اور ہلاکت و بربادی کی پیشین گوئی اور بالآخران تمام پیشین گوئیوں کا غلط ثابت ہونا ایسی باتیں ہیں، جو مرزا صاحب کے اخلاق و عادات کو بھی روشنی میں لاتی ہیں، مگر افسوس کہ جن مسلمانوں کو مذہبی معلومات حاصل نہیں ہیں، یا جو لوگ دیہات میں رہتے ہیں اور وہ کلمہ اور نماز اور دین کے بنیادی احکام سے بھی ناواقف ہیں، وہ دھوکہ میں آجاتے ہیں اور ظاہری طور پر کلمہ کی وحدت اور کچھ عمومی افعال میں یکسانیت کی وجہ سے لوگ دھوکہ کھا جاتے ہیں، پھر جہاں حقیقتِ حال کا ان کو علم ہوتا ہے اور مسلمان وہاں پہنچتے ہیں، وہاں سے ان غارت گران ایمان کو راہ فرار اختیار کرنی پڑتی ہے، ان کی مالی تحریص، عبادت گاہ اور مکتب کا انتظام اور دوسری ترغیبات سب کی سب اکارت ہوجاتی ہیں، اگر مسلمانوں پر ان باغیان ختم نبوت کے افکار و اعتقادات واضح ہوجائیں تو یہی کافی ہے۔

لیکن اس پر جس قدر افسوس کیا جائے کم ہے کہ ہم نے اپنی تمام دینی تحریکات، تعلیمی نظام اور دعوتی کوششوں کا محور صرف پر رونق شہروں کو بنالیا ہے اور ہمارے جو بھائی دیہات کی تیرہ و تاریک فضاء میں رہتے ہیں، جہاں نہ علم کی روشنی ہے اور نہ برقی کے لیمپ، نہ خوبصورت سڑکیں ہیں، نہ راحت بخش عمارتیں اور عشرت کدے، ان غریب بھائیوں کو ہم نے بالکل بھلا رکھا ہے، ایسا کہ گویا ان سے ہمارا کوئی مذہبی اور ایمانی رشتہ ہی نہ ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم نبوت ہماری طرف متوجہ ہے کہ ہم اپنے ان بھائیوں کی طرف نگاہ محبت اُٹھائیں، ان کے ایمان کی حفاظت کریں اور ان کو حقیقی صورت حال سے آگاہ کرنے کی کوشش کریں، ہماری تھوڑی سی توجہ انھیں اتداد کی کھائی میں گرنے سے بچاسکتی ہے، ہم اپنی آمدنی کا بہت ہی معمولی حصہ نکال کر گاؤں گاؤں مکاتب کا نظام قائم کرسکتے ہیں، کتنے ہی گاؤں ہیں، جہاں سینکڑوں

سال سے مسلمان آباد ہیں، لیکن وہاں ایک چھوٹی سی مسجد موجود نہیں، ہم چھپر کی سہی، ایک مسجد بنادیں، انہی مسجدوں میں بچوں کی بنیادی دینی تعلیم کا انتظام کردیں اور علم کا ایک چراغ وہاں روشن ہو جائے، تو انشاءاللہ انھیں ہرگز گمراہ نہ کیا جاسکے گا اور کفر اپنی ساری سازشوں کے باوجود خاسر و محروم ہی رہے گا، لیکن کیا ہم اس کے لئے تیار بھی ہیں؟؟

○ ○ ○ ○

ختم نبوت مسلمانوں کا اجماعی عقیدہ

پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بحیثیت نبی اور رسول سب سے بڑی خصوصیت اور امتیازی وصف آپ کا ''خاتم النبیین'' ہونا ہے، یعنی نبوت کا سلسلہ آپ کی ذات اقدس پر ختم ہو چکا ہے، آپ ﷺ کے بعد نہ کوئی نبی آیا ہے اور نہ آئے گا اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ایک پیغمبر کے بعد دوسرے پیغمبر کی آمد یا تو اس لئے ہوتی ہے کہ پہلے پیغمبر کے ذریعہ انسانیت کو جو تعلیم حاصل ہوئی وہ محفوظ نہ رہے اور اس میں ملاوٹ اور آمیزش ہو جائے، یا اس لئے کہ پہلے پیغمبر کی شریعت میں جو احکام نازل ہوئے ہوں، اس میں اللہ کی طرف سے کوئی تبدیلی یا کمی بیشی عمل میں آنے والی ہو، عام طور پر ان ہی دو اسباب کے تحت ایک پیغمبر کے بعد دوسرے پیغمبر کی آمد ہوتی ہے، پیغمبر اسلام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور آپ پر نازل ہونے والی کتاب الٰہی پوری طرح محفوظ و موجود ہے، اور خود اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے، إنا نحن نزلنا الذکر وإنا له لحافظون (الحجر: ۹) اور جہاں تک شریعت اسلامی میں ترمیم و تغیر کی بات ہے تو شریعت پایۂ کمال کو پہنچ چکی ہے اور احکام شرعیہ کی نسبت سے اللہ تعالیٰ کی جو نعمت ہدایت انسانیت کو عطا کی جاتی تھی، وہ تمام ہو چکی ہے، الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا، (المائدہ: ۳) یہ گویا اس بات کا اعلان ہے کہ یہ شریعت آخری شریعت ہے، اب اس میں کسی قسم کی ترمیم اور اضافہ و کمی کی گنجائش نہیں۔

اس لئے ظاہر ہے کہ آپ ﷺ کے بعد اب کسی نبی کے آنے کی نہ ضرورت باقی رہی اور نہ اس کی گنجائش ہے، اس لئے خود قرآن مجید نے پوری صراحت و وضاحت کے ساتھ اعلان کر دیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول اور آخری نبی ہیں، ولکن رسول اللہ و خاتم

النبیین (الاحزاب:۴۰) قرآن کے اس صریح اور واضح اعلان کی مزید تائید و تشریح احادیث نبوی سے ہوتی ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بنواسرائیل میں انبیاء قیادت و انتظام کا فریضہ انجام دیتے تھے، جب کسی نبی کی وفات ہوجاتی تو اس کے بعد دوسرا نبی آجاتا، لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا، البتہ خلفاء ہوں گے، انہ لانبی بعدی وسیکون خلفاء ،(بخاری : باب ما ذکر عن بنی اسرائیل) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے آپ کا ایک ارشاد مروی ہے کہ مجھے انبیاء پر چھ چیزوں میں فضیلت دی گئی ہے، اس میں ایک خصوصیت آپ نے یہ ذکر فرمائی کہ سلسلۂ نبوت مجھ پر ختم ہوچکا ہے، وختم بی النبیون (مسلم) ایک موقعہ پر آپ نے ارشاد فرمایا کہ رسالت و نبوت کا سلسلہ ختم ہوچکا، اب نہ کوئی رسول آئے گا اور نہ کوئی نبی، ان الرسالة والنبو ة قد انقطعت فلا رسول ولا بنی (ترمذی ، باب ذھاب النبوة) حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میری اُمت میں تیس جھوٹے پیدا ہوں گے، جو نبوت کے دعوے دار ہوں گے، حالاں کہ میں خاتم النبیین ہوں اور میرے بعد کوئی اور نبی نہیں آسکتا۔

(ابوداؤد ، کتاب الفتن)

آخری نبی ہونے کی حیثیت سے آپ ﷺ کا صفاتی نام ”عاقب“ ہے، عاقب کے معنی ”بعد میں آنے والے“ کے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں ’عاقب‘ ہوں، جس کے بعد کوئی نبی نہیں ہوسکتا، انا العاقب الذی لیس بعده نبی (ترمذی : باب أسماء النبی) ہر نبی کے ساتھ ظاہر ہے کہ اس کی اُمت بھی ہوتی ہے، اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں آخری نبی ہوں اور تم آخری اُمت ہو أنا اٰخر الانبیاء وأنتم آخر الامم (ابن ماجه ، باب الدجال) ایک حدیث میں یہ بات بھی ارشاد فرمائی کہ میری مسجد نبوت سے نسبت رکھنے والی آخر مسجد ہوگی ، ان مسجدی آخر المساجد۔(مسلم ، باب فضل الصلاة بمسجدی مکة والمدینة)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلسلۂ نبوت کے اختتام کو بڑی عمدہ مثال سے سمجھایا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری اور مجھ سے پہلے پیغمبروں کی مثال ایسی ہے کہ جیسے ایک شخص نے گھر تعمیر کیا، خوب عمدہ اور نہایت خوبصورت، لیکن کونہ میں ایک اینٹ کی جگہ خالی ہے، لوگ

آتے ہیں، اس کے حسن و جمال پر حیرت زدہ ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ایک اینٹ بھی کیوں نہیں لگادی گئی؟ تو میں وہی ''اینٹ'' ہوں اور خاتم النبیین ہوں، (بخاری ، باب خاتم النبیین) گویا اللہ تعالیٰ نے بہترین انسانوں کا انتخاب کر کے ایک قصر نبوت تعمیر کیا، اس عظیم الشان محل میں صرف ایک اینٹ کی جگہ خالی تھی ، جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات سے پُر ہوگئی، اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر طرح کی نبوت آپ ﷺ پر ختم ہو چکی ہے، آپ ﷺ کے بعد نہ کوئی صاحب شریعت نبی آسکتا ہے اور نہ کوئی ایسا نبی جو آپ ﷺ کے تابع ہو اور آپ ہی کی شریعت کا متبع ہو، یہ بات آپ ﷺ کے بعض اور ارشادات سے بھی واضح ہوتی ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر میرے بعد سلسلۂ نبوت جاری رہتا تو عمر بن خطاب نبی ہوتے ، **لو کان بعدی نبیا لکان عمر بن الخطاب** ،(ترمذی ، کتاب المناقب) اسی طرح ایک موقعہ پر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا کہ تم میرے مقابلہ میں ایسے ہی ہو جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ ہارون علیہ السلام، لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوسکتا، **ألا إنہ لا نبی بعدی** (بخاری ، کتاب فضائل الصحابة) غور فرمایئے کہ اگر ذیلی اور غیر مستقل نبوت کی گنجائش آپ کے بعد باقی رہتی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اس سے کیوں نہ سرفراز کئے جاتے؟ حضرت ہارون علیہ السلام کوئی صاحب شریعت نبی نہیں تھے، بلکہ شریعت موسوی ہی کے متبع تھے، اس کے باوجود آپ ﷺ نے حضرت ہارون علیہ السلام کی سی نبوت کو بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے ناممکن قرار دیا، معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص حضور ﷺ کے بعد کسی بھی طرح کی نبوت کو باقی مانتا ہو، تو وہ ایک ایسی گمراہی کی بات کرتا ہے کہ خدا کے ساتھ شرک کے بعد اس سے بڑھ کر کوئی اور گمراہی نہیں ہوسکتی۔

اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کا اس بات پر اجماع و اتفاق تھا کہ آپ کی ذات پر سلسلۂ نبوت ختم ہو چکا ہے، چنانچہ جب مسیلمۂ کذاب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی مانتے ہوئے اپنی نبوت کا بھی دعویٰ کیا تو صحابہ نے بالاتفاق اسے مرتد قرار دیا، اس سے جنگ کی گئی اور بالآخر وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچا، یہ جنگ ایسی تھی کہ اسی لئے امام

ابوحنیفہؒ نے تو فرمایا کہ اگر کوئی شخص نبوت کا دعویدار ہو اور کوئی مسلمان اس سے معجزہ اور نبوت کی علامت طلب کرے تو یہ مطالبہ ہی اس کو ایمان سے محروم کردے گا، کیوں کہ گویا اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کو ممکن تصور کیا۔

دراصل آپ کی بعثت تمام انسانیت کے لئے ہے، قرآن کا ارشاد ہے: وما ارسلنک الا کافة للناس ، (سباء :۲۸) تمام لوگوں میں قیامت تک آنے والے انسان داخل ہیں، گویا یہ اس بات کا اعلان ہے کہ آپ کی نبوت قیامت تک کے لئے ہے، جب آپ کا دائرۂ نبوت قیامت تک وسیع ہے، آپ ﷺ پر نازل ہونے والی کتاب اور آپ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت محفوظ ہے اور آپ کی شریعت میں کسی نسخ اور تبدیلی و اضافہ کا امکان نہیں تو ظاہر ہے کہ آپ کے بعد کسی پیغمبر کی بعثت کے کوئی معنی نہیں ، اگر آپ کے بعد بھی سلسلۂ نبوت جاری ہوتا تو ضرور تھا کہ جیسے ہر پیغمبر نے بعد میں آنے پیغمبر کے بارے میں اطلاع دی اور اس پر ایمان لانے کی ہدایت فرمائی، آپ بھی اس کا اعلان فرماتے، لیکن یہی نہیں کہ آپ نے آئندہ کسی نبی کی پیشین گوئی نہیں فرمائی ، بلکہ یہ بھی اعلان فرمادیا اور اس کو بار بار واضح کردیا کہ آپ ﷺ آخری نبی ہیں اور آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا۔

بدقسمتی سے انگریزوں کے تسلط کے دور میں پنجاب کی سرزمین سے حکومت وقت کی شہ پر ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا، جس کے غلامانہ مزاج و مذاق کا حال یہ تھا کہ خود ہی اپنے آپ کو حکومت انگلشیہ کا خود کاشتہ پودا کہا کرتا تھا اور حکمرانوں کی چوکھٹ پر جبیں سائی سے اسے ذرا بھی عار نہ تھی، بدقسمتی سے آج تک یہ گمراہ فرقہ موجود ہے اور وہ ناواقف مسلمانوں کو دھوکہ دے کر ان کو نبوت محمدی کے سایہ سے محروم کرنا چاہتا ہے، یہ ایک ایسا فتنہ ہے، جس سے بڑا کوئی فتنہ نہیں اور یہ ایسی گمراہی ہے جس سے بڑھ کر کوئی گمراہی نہیں، اگر اس دنیا میں اعتقاد و عمل کی نجاستیں محسوس پیکر میں ڈھل سکتیں اور اس کو محسوس کیا جاسکتا تو یہ ایسی بات ہوتی کہ اگر اسے سمندر میں ملادیا جاتا تو وہ بھی متعفن ہوجاتا۔

حقیقت یہ ہے کہ ختم نبوت اُمت کے لئے ایک بڑی رحمت ہے، یہ اس اُمت کی

عالمگیریت ، اس کی وحدت ، اپنے عقیدہ پر جماؤ اور استقامت اور اعتقادی انتشار اور فرقہ بندیوں سے حفاظت کا ذریعہ ہے؛ کیوں کہ اگر سلسلۂ نبوت باقی ہوتو ہمیشہ ایک نئے نبی کا انتظار ہوگا اور اپنے عقیدہ پر استقامت نہ ہوگی ، پھر جو شخص نبوت کا دعویٰ کرے اس کے سچے اور جھوٹے ہونے کو جانچنا اور پرکھنا خود ایک امتحان ہے؛ کیوں کہ حقیقی نبی کا انکار بھی کفر ہے اور جھوٹے نبی پر ایمان لانا بھی کفر، اس لئے جب بھی کوئی نبی آئے گا، تو کچھ اس پر ایمان لانے والے ہوں گے اور کچھ اس کے منکر ہوں گے، ظاہر ہے کہ اس سے فرقہ بندیاں جنم لیں گی، اس لئے ختم نبوت مسلمانوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی رحمت ہے اور اعداء اسلام چاہتے ہیں کہ اُمت مسلمہ کو اس عظیم نعمت سے محروم کردیں؛ لیکن وہ کبھی اس میں کامیاب نہیں ہوسکتے ، ضرورت اس بات کی ہے کہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کو اور خاص کر دیہات اور قریہ جات کے مسلمانوں کو ختم نبوت کی حقیقت سے واقف کرایا جائے؛ تاکہ وہ بکرے کی کھال میں آنے والے بھیڑیوں کو پہنچان سکیں اور اپنی حفاظت کرسکیں ؛ کہ ختم نبوت کا عقیدہ ایمان اور کفر کی اساس اور ہدایت وگمراہی کے درمیان خط فاصل ہے، ربنا لا تزغ قلوبنا بعد إذ هديتنا .

○ ○ ○ ○

ختم نبوت کے خلاف بغاوت کا ایک اور روپ

زندہ مذاہب کی تاریخ میں یہودیت اور عیسائیت کی تاریخ عجیب رہی ہے، جب حضرت مسیح پیدا ہوئے تو یہودیت اسرائیلوں کا متفق علیہ مذہب تھا، شام اور فلسطین کے علاقہ پر یہی حکمراں تھے، اور غالباً مشرکین کے مقابلہ یہ تنہا توحید کا داعی اور شرک کا مخالف مذہب تھا، آسمانی صحائف اور انبیاء کی تعلیمات بعض آمیزش اور ملاوٹوں کے باوجود انھیں کے پاس تھی، جب حضرت مسیح علیہ السلام پیدا ہوئے تو یہودیوں نے ان کے ساتھ بڑی زیادتیاں کیں، بلکہ اپنے عقیدہ وخیال کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام کو قتل بھی کر دیا، عیسائیت ایک مظلوم و مقہود مذہب کی حیثیت سے ظہور پذیر ہوئی؛ لیکن یونانیوں کے نزدیک عیسائیت کو مقبول بنانے کے لئے سینٹ پال اور ان کے متبعین نے تثلیث یعنی تین کے ایک اور ایک کے تین ہونے کا تصور گھڑا، یونانیوں کے عیسائیت قبول کرتے ہی عیسائی مذہب برسات کی گھنگھور گھٹاؤں کی طرح روم سے شام تک پورے خطہ پر چھا گیا اور یہودیوں پر زمین تنگ سے تنگ تر ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ یہود ایک کم تعداد والی ایسی ذلیل اور بے آبرو قوم بن گئی جو ٹھوکریں کھاتی اور ایک جگہ سے دوسری جگہ ماری ماری پھرتی رہی، کتنے شہروں سے یہ جلاوطن کئے گئے، کتنے ہی یہودی بچے، بڑے اور عورتیں زندہ جلا دیئے گئے، مختلف علاقوں سے شہر بدر کئے گئے، دناءت اور درون خانہ سازش کچھ اس طرح ان کے مزاج میں رچ بس گئی کہ ہر حکومت ان کو اپنے لئے ایک خطرہ اور ہر قوم ان کو اپنے لئے بوجھ تصور کرنے لگی، یہودیت اور عیسائیت کی یہ تاریخ مغرب کے ذہن میں نقش ہے۔

جب حجاز سے اسلام کا سورج طلوع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی کرنیں مشرق و مغرب پر چھا گئیں تو چند ہی سالوں میں ایشیاء، یورپ اور افریقہ پر اس نے اپنی فتح مندی اور ظفریابی کے جھنڈے لہرا دیئے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس نے زمین کے فتح کرنے پر اکتفاء نہیں کیا؛

بلکہ لوگوں کے قلوب واذہان ان کے شمشیر اخلاق کے سامنے سرنگوں ہوتے چلے گئے اور انھوں نے فکر واعتقاد کے معرکوں میں ایسی فتوحات حاصل کیں کہ ملک ومکان کی فتح سے ان کی کوئی نسبت نہیں، صلیبی جنگوں کے ذریعہ اس طوفان کو تھامنے کی کوشش کی گئی؛ لیکن بالآخر یہ جنگیں مسلمانوں ہی کی فتح پر اختتام پذیر ہوئیں، صلیبی جنگوں نے جہاں جنگی اعتبار سے مغرب کو زیر کیا، وہیں ان کے اخلاق اور انسانی سلوک نے بھی مغرب پر گہرا اثر ڈالا اور بہت سے عیسائی سپاہی جنھوں نے میدان جنگ میں داد شجاعت دی اسلامی تعلیمات واخلاق کے سامنے انھوں نے اپنے قلب ونگاہ کی سپر ڈال دی۔

اس صورت حال نے ان اہل یورپ کو جو اسلام سے عناد رکھتے تھے، کوئی نئی راہ اور اسلام پر یلغار کا کوئی نیا راستہ تلاش کرنے پر مجبور کر دیا، چنانچہ انھوں نے اسلام پر چوطرفہ حملہ کرنے کی منصوبہ بندی کی، ایک طرف عالم اسلام میں قومیت اور وطنیت کی تحریک چلائی، تاکہ یہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں، چنانچہ وہ اس میں پوری طرح کامیاب ہوئے، یہاں تک کہ خلافت عثمانیہ ترکیہ کے سقوط کا سانحہ پیش آیا، یہ سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کے لئے اتنا بڑا نقصان تھا کہ شاید ہی کبھی اس کی تلافی ہو سکے، دوسری طرف مستشرقین کے نام سے ایک ایسی جماعت تیار کی گئی، جو پورے اسلامی لٹریچر پر نظر ڈالے اور اسلام کے بارے میں شکوک وشبہات اُبھارنے کا کام انجام دے، اس کے لئے مغرب کی جامعات میں مطالعۂ اسلام کے شعبے کھولے گئے اور نہایت ہی دقت نظر لیکن بدنیتی کے ساتھ اسلام کا مطالعہ کیا گیا اور آج بھی یورپ کے سینکڑوں اہل علم شب وروز اس کام مشغول ہیں، تیسری طرف یہودیت اور عیسائیت کے تجربہ کو سامنے رکھ کر نبوت کے جھوٹے دعویداروں کو کھڑا کیا گیا اور ان کو تقویت پہنچائی گئی؛ چوں کہ ہم مسلمانوں کو حضرت مسیح کے نزول اور امام مہدی کے ظہور کا انتظار ہے اور جب انسان نا اُمیدی اور مایوسی کی حالت میں ہو تو ایسی حالت میں وہ کسی مرد غیب اور نصرت غیبی کے ظہور کا آرزو مند ہوتا ہے اور اس کی طرف لپکتا ہے، اس لئے سوچا گیا کہ اگر کسی نئے نبی کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ کھڑا کیا جائے تو جیسے عیسائیت نے یہودیت کو فنا کر دیا، اسی طرح یہ

نیا مذہب (معاذ اللہ) اسلام کے لئے گور وکفن کا سامان کردے گا، چنانچہ انگریزی استعمار کے دور میں برصغیر میں خصوصاً اور مختلف مسلم ملکوں میں عموماً جھوٹے مدعیان نبوت کا ظہور رہوا۔

ان ہی دروغ گو شخصیتوں میں ایک مرزا غلام احمد قادیانی تھے، جنھوں نے ختم نبوت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، مرزا صاحب کے دعویٰ کرنے کے بعد ہندوستان میں مختلف لوگوں نے مختلف علاقوں میں نبوت کے دعوے شروع کردئے، شاید انھوں نے سوچا کہ جھوٹی نبوت کی تصدیق سے بہتر خود اپنی نبوت کا اعلان ہے، چنانچہ علاقہ دکن میں ایسے ہی دو مدعیان نبوت ظاہر ہوئے، ایک عبداللہ تیماپوری، جس نے اولاً قادیانیت کی تبلیغ کی اور پھر دعویٰ کیا کہ خود اس پر اللہ تعالیٰ کی وحی اترتی ہے، عبداللہ تیماپوری کذاب کی کتاب ''ام العرفان'' میں اس کے افکار ونظریات اور دُعاوی کی تفصیل موجود ہے —— دوسرے مدعی نبوت سید صدیق حسین جو ۱۸۸۲ء میں بالم پیٹ ضلع گلبرگہ میں پیدا ہوئے اور اپنے لئے ''دین دار'' کا لقب اختیار کیا، ۱۹۱۴ء میں قادیان پہنچے، قادیانیوں کے دوسرے خلیفہ میاں محمود کے ہاتھوں پر بیعت کی اور اس کے بعد قادیانیت کے زبردست مبلغ اور مناد بن گئے، مرزا صاحب کی کتابوں میں ان کو 'یوسف موعود' کی پیشین گوئی ہاتھ آگئی، دوسری طرف ہندوؤں کے یہاں کرشن کے اوتار کا انتظار ہے اور خاص کر ہندوؤں کا ایک فرقہ لنگایتوں کا عقیدہ ''چندر بسو یشور'' کے ظہور کا ہے، صدیق دین دار نبوت سے کم پر قانع نہیں تھے اور ان پیشین گوئیوں کو دیکھ کر ان کو اپنی منزل مطلوب سامنے نظر آنے لگی؛ چنانچہ ۱۹۲۴ء میں انھوں نے میاں محمود کی بیعت فسخ کرکے اپنے آپ کے یوسف موعود، کرشن کا اوتار اور چندر بسو یشور ہونے کا اعلان کردیا، بلکہ چندر بسو یشور کو اپنے نام کا جز ہی بنالیا اور اس طرح ''صدیق دین دار چندر بسو یشور'' کہلائے، غرض کہ انھوں نے اپنے دعووں میں تمام پیشین گوئیوں کو جمع کرنے کی کوشش کی، مرزا غلام احمد قادیانی پر بھی وہ اخیر تک ایمان رکھتے تھے اور جیسے لاہوری فرقہ کے لوگوں کو ان کے خلیفہ دوم مرزا محمود سے اختلاف تھا اسی طرح صدیق دین دار صاحب کو بھی ان ہی سے اختلاف ہوا، صرف مرزا صاحب پر ایمان ہی ان کے دائرہ اسلام سے باہر ہونے کے لئے کافی ہے۔

لیکن خود ان کی تحریریں اور دعاوی بھی ان کے کفر کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہیں، وہ اپنے آپ کو ہندو عقیدہ کے مطابق 'اوتار' کہتے ہیں اور ہندو مذہب میں اوتار کا تصور یہ ہے کہ خدا خود انسانی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے، بلکہ انھوں نے صراحتاً بھی کہا ہے کہ ''صدیق خدا ہے'' گویا بات الوہیت اور خدائی کے دعوے تک پہنچ چکی ہے، وہ اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ثانی بھی قرار دیتے ہیں والعیاذ باللہ، صدیق دین دار صاحب نے اپنی کتاب ''مہر نبوت'' میں اپنے آپ کو ''بروز محمد'' کہا ہے، مہر نبوت (ص: ۴۳) پر ان کے یہ اشعار قابل ملاحظہ ہیں :

بروز محمد ہے نبیوں کا حاکم
ہے مظہر خدا کا قرآں کا ہے عالم
ہے قاضی حشر و حوض کا قاسم

صدیق دین دار صاحب سے متعلق ان کے ایک متبع ابوالکلام عبدالغنی اپنی کتاب ''شمس الضحیٰ'' (ص: ۱۲-۱۰) میں اشعار نقل کرتے ہیں :

یہ خود عود کر آئے موعود ہوکر ۔۔۔ شہادت میں خود اپنی مشہود ہوکر
ثمر بن کے قرآں کے مشہود آئے ۔۔۔ قیامت کی بعثت میں محمود آئے
اعادہ میں اپنے وہ موعود آئے ۔۔۔ غرض دور آخر کے مقصود آئے

یہ تو دیگ کے صرف چند چاول ہیں، ورنہ اس طرح کے فاسد خیالات صدیق دین دار صاحب کی کتابوں ''امام الجہاد، ظہور قدسی، کلکی اوتار کا بروز، مہر نبوت، دعوت الی اللہ'' وغیرہ میں بہ کثرت موجود ہیں اور اس باب میں ان کو اپنے مقتدیٰ مرزا غلام احمد قادیانی سے بڑی مماثلت حاصل ہے۔

غرض اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بغاوت کی جو منصوبہ بندی معاندین اسلام کی طرف سے کی گئی، جہاں مرزا غلام احمد قادیانی اس ''کاروان نامراد'' کے سرخیل اور سالار رہیں، وہیں صدیق دین دار صاحب اسی نامسعود قافلہ

کے ایک سوار، ان کے افکار وخیالات کے ارتداد ہونے میں کوئی شبہ نہیں، اسلام یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کے سے نام رکھ لئے جائیں اور پھر انسان جو کچھ بھی کہے اور کرے، مسلمان باقی رہے؛ بلکہ ایمان کچھ حقیقتوں کو ماننے اور کچھ خلاف واقعہ باتوں کے انکار کرنے کا نام ہے، اوران حقیقتوں میں خدا کی توحید کے بعد سب سے اہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت پر ایمان لانا ہے، ختم نبوت کا انکار خواہ صراحۃً ہو یا نامعقول تاویلات کے پردہ میں، بہرحال باعث کفر ہے، مسلمانوں کو ہمیشہ اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہئے اور صرف ناموں کی یکسانیت سے دھوکہ نہ کھانا چاہئے، ورنہ آپ کا ایمان اغواء کرلیا جائے گا اور آپ اتنی بڑی دولت اور متاع گراں مایہ کے ضائع ہوجانے کا احساس تک نہ کرسکیں گے۔

○ ○ ○ ○